خواتین اور دوشیزاؤں کیلیے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
نومبر 2012
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

آپ سے کیا پردہ

خاتون کی ڈائری

مجھ سے ملیے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

رنگا رنگ پھول

میری بیاض سے

پکوان

نفسیات

بیوٹی بکس

نومبر 2012
جلد 40 شمارہ 7
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اپنے اردگرد کے ماحول، مصائب اور مسائل سے اکتا کر انسان کہانیوں کی دنیا میں پناہ لیتا ہے۔ کہانیاں ہمیں اس بھاگتی دوڑتی، پرشور، مصروف زندگی سے دور لے جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے سہی، ہم اسی دنیا میں کہانی کے کرداروں کے ساتھ سانس لینے لگتے ہیں۔ یہ کہانی کار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے، اسے اپنے موضوع پر کتنی گرفت حاصل ہے اور وہ زبان و بیان پر کتنی قدرت رکھتا ہے۔

ایک اچھا قلم کار قاری کو صرف تفریح ہی مہیا نہیں کرتا بلکہ اس کی تحریر میں سوچ اور فکر کے جو پہلو ہوتے ہیں، وہ بھی قاری کے ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر تخلیق کار ایک مثبت، واضح، راست اور صالح سوچ رکھتا ہے تو اس کے پڑھنے والوں تک یہ روشنی ضرور منتقل ہوگی اور روشنی کا یہ سفر آگے نسلوں تک جائے گا۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں منفرد، مثبت اور راست سوچ رکھنے والی مصنفین کا تعاون حاصل ہے جن کی تحریریں بڑے ہلکے پھلکے اور دلچسپ انداز میں زندگی کے سنجیدہ اور گھمبیر موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔

ہماری بیشتر قارئین اعتراف کرتی ہیں کہ ان کی مثبت سوچ اور ذہنی تربیت میں خواتین ڈائجسٹ کا بہت بڑا کردار ہے۔

آج جبکہ الیکٹرانک میڈیا کی یلغار سے بہت سی چیزوں میں تبدیلی آچکی ہے اور معیارات تبدیل ہو رہے ہیں۔ یہ بات ہمارے لیے باعث اطمینان ہے کہ ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے شائع ہونے والے پرچے اپنا معیار قائم رکھے ہوئے ہیں۔

سانحہ ارتحال،

مشہور و معروف مصنفہ رضیہ بٹ زندگی کی مسافت طے کرکے ابد کی طرف روانہ ہوگئیں۔ رضیہ بٹ کا شمار ان چند مصنفین میں ہوتا ہے جو خواتین ڈائجسٹ کی ابتدا سے اس میں لکھتی رہیں۔ انہوں نے بے شمار افسانے، ناول، لکھے اور بے مثال مقبولیت پائی۔ پچھلے بیس پچیس سالوں سے انہوں نے لکھنا بہت کم کر دیا تھا لیکن ان کے ناول ڈرامائی تشکیل کرکے ٹی وی پر پیش کیے جاتے رہے اور بے حد پسند بھی کیے گئے۔

محترمہ رضیہ بٹ کا اپنا ایک منفرد انداز تھا۔ ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے۔ وہ کبھی پُر نہ ہوگا۔ ہم ان کی یاد میں ان کا ایک افسانہ شائع کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ محترمہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

سلام کو عام کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم جنت میں داخل نہیں ہوسکتے۔ حتیٰ کہ ایمان والے بن جاؤ۔ اور تم (کامل) مومن نہیں بن سکتے۔ حتیٰ کہ آپس میں محبت رکھو۔ کیا تم کو ایک چیز نہ بتاؤں، جب تم وہ عمل کرو گے تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے؟ آپس میں سلام کو عام کرو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ جنت میں داخلے کے لیے ایمان لازمی شرط ہے۔

2۔ کامل ایمان والے جہنم کی سزا بھگتے بغیر جنت میں چلے جائیں گے، جب کہ ناقص ایمان والے اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد جہنم سے نکلیں گے۔

3۔ وہ محبت جس کی بنیاد رنگ، نسل، خاندان، زبان، وطن یا جذبات کے بجائے ایمان پر ہو، ایمان کی تکمیل اور اس کے حسن کا باعث ہے۔

4۔ ایک دوسرے کو سلام کرنا باہمی محبت کا سبب ہے کیونکہ "السلام علیکم" اور "وعلیکم السلام" کے الفاظ ایک دوسرے کے لیے نیک جذبات کا اظہار بھی ہیں اور دعائے خیر بھی۔

5۔ مسلمانوں میں باہمی محبت پیدا کرنے کے لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی چیزیں بتائی ہیں، مثلاً" تحفے تحائف دینا، اچھے نام سے پکارنا، سلام کے ساتھ مصافحہ کرنا، کافی مدت کے بعد ملاقات ہونے پر معانقہ کرنا، نماز باجماعت میں صف سیدھی رکھنا اور ایک دوسرے کے قدم سے قدم اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونا، ضرورت کے وقت مدد کرنا، خوشی اور غمی میں شریک ہونا اور بڑے کا احترام اور چھوٹے پر شفقت کرنا وغیرہ۔

سلام کا جواب دینا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا' جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں ایک طرف تشریف فرما تھے۔ اس نے نماز پڑھی' پھر آکر سلام کیا۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"وعلیک السلام' (تجھ پر بھی سلامتی ہو۔)"

فوائدومسائل :

1۔ اگر مسجد میں چند افراد مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کے پاس آنے والا انہیں سلام کرے۔
2۔ سلام کا جواب ضرور دینا چاہیے۔
3۔ علیک ایک آدمی کے لیے اور علیکم زیادہ افراد کے لیے ہوتا ہے' لیکن ایک آدمی کو بھی علیکم کہنا درست ہے۔

ذمیوں کو سلام کا جواب دینا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب اہل کتاب میں سے کوئی شخص تمہیں سلام کہے تو (جواب میں) کہو "وعلیکم تم پر بھی۔"

غیر مسلم کو سلام

حضرت ابوعبدالرحمٰن جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"میں کل یہودیوں کے پاس جاؤں گا۔ انہیں سلام کرنے میں پہل نہ کرنا۔ جب وہ تمہیں سلام کہیں تو (جواب میں) کہنا' وعلیکم۔"

فوائدومسائل :

1۔ مسلمان کو نہیں چاہیے کہ غیر مسلم کو سلام کہے بلکہ غیر مسلم کو چاہیے کہ مسلمان کو سلام کہے اور مسلمان جواب دے۔

مصافحہ کرنے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ہم نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم ایک دوسرے کے لیے (احترام کے اظہار کے لیے) جھکا کریں؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔"
ہم نے کہا' "کیا ہم ایک دوسرے سے معانقہ کریں؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں! لیکن مصافحہ کرلیا کرو۔"

فوائدومسائل :

1۔ ملاقات کے وقت سلام کرتے ہوئے جھکنا منع ہے' کیونکہ اس میں رکوع سے مشابہت ہے' جو اللہ کی عبادت ہے۔
2۔ پاؤں چومنا سجدہ سے مشابہت رکھتا ہے' اس لیے یہ زیادہ منع ہے۔
3۔ مصافحہ (ہاتھ ملانا) سنت ہے۔ مصافحہ دائیں ہاتھ سے کرنا چاہیے' دونوں ہاتھوں سے نہیں۔ مصافحے کا مطلب ہی ہتھیلی کا ہتھیلی سے ملنا ہے' نہ کہ دو ہتھیلیوں کا دو ہتھیلیوں سے اور نہ دو ہتھیلیوں کا ایک ہتھیلی سے ملنا۔

مصافحہ کرنا

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے رخصت ہونے سے پہلے ان کی مغفرت ہوجاتی ہے۔"

فوائدومسائل :

1۔ مسلمانوں کی باہمی ملاقات آپس میں محبت کے اضافے کے ساتھ ساتھ گناہوں کی معافی کا باعث بھی ہے۔
2۔ ایسے اعمال سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں۔ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر اور حقوق العباد کی ادائیگی کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ واللہ اعلم۔

اجازت طلب کرنا

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اندر آنے کی تین بار

اجازت طلب کی۔ انہیں اجازت نہ ملی' چنانچہ وہ واپس ہوگئے۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کہلوا بھیجا۔ "آپ واپس کیوں چلے گئے؟"
انہوں نے فرمایا۔
"میں نے آپ سے اس انداز سے تین بار اجازت طلب کی تھی' جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے۔ (اس طرح اجازت طلب کرنے کے بعد) اگر ہمیں اجازت ملے تو داخل ہوں اور اگر ہمیں اجازت نہ دی جائے تو پلٹ جائیں۔"
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "تم (اپنے اس (بیان) پر گواہ پیش کرو گے' ورنہ میں تمہیں ضرور سزا دوں گا۔"
وہ اپنی قوم کی مجلس میں آئے اور ان سے (گواہی دینے کی) درخواست کی۔ انہوں نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں گواہی دی تو (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے) انہیں چھوڑ دیا۔

فوائدومسائل :

1۔ کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونا منع ہے۔
2۔ اجازت طلب کرنے کا طریقہ یہ ہے "السلام علیکم! کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"
3۔ اگر ایک بار اجازت مانگنے پر جواب نہ ملے تو دوسری اور تیسری بار اجازت طلب کرنی چاہیے۔ آج کل اجازت مانگنے کا طریقہ مختلف ہوگیا ہے' جیسے گھنٹی بجانا۔ یہ بھی وقفے وقفے سے صرف تین مرتبہ بجائی جائے۔ اگر کوئی جواب نہ ملے تو واپس چلا جائے۔ گھنٹی بجا بجا کر سارے محلے کو پریشان نہ کیا جائے۔
4۔ اگر تین بار اجازت مانگنے پر بھی اجازت نہ ملے تو اہل خانہ سے ناراض ہوئے بغیر واپس ہوجانا چاہیے۔ ممکن ہے صاحب خانہ گھر میں موجود نہ ہو یا کوئی ایسی معقول وجہ ہو' جس کی بنا پر وہ اجازت نہ دے رہا ہو۔
5۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گواہ اس لیے طلب فرمایا کہ وہ مزید اطمینان چاہتے تھے اور اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگ جب دیکھیں گے کہ عمر رضی اللہ عنہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کبار صحابہ رضی اللہ عنہ سے بھی شدت کا رویہ رکھتے ہیں تو ہر شخص بلا تحقیق احادیث بیان کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ اس طرح غیر ذمہ دار لوگ غلط الفاظ کے ساتھ یا اپنے پاس سے بنا کر احادیث بیان نہیں کریں گے۔
6۔ حدیث دین کی بنیاد ہے' لہٰذا صحیح اور ضعیف میں فرق کرنا بہت ضروری ہے۔

اجازت کا مطلب

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
"ہم نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ سلام (تو ہمیں معلوم) ہے' لیکن اجازت طلب کرنے کا کیا مطلب ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"آدمی کوئی بات کہے' سبحان اللہ کہہ دے' اللہ اکبر کہہ دے' الحمد للہ کہہ دے یا کھانس دے۔ (مقصد یہ ہے کہ) گھر والوں کو معلوم کرا دے (کہ میں اندر آنا چاہتا ہوں۔)"
حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کے میرے دو اوقات تھے۔ ایک رات میں اور ایک دن میں۔ جب میں ایسے وقت حاضر ہوتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے تو آپ کھانس دیتے۔ (جس کا مطلب یہ ہوتا کہ مجھے تمہارے آنے کا علم ہوگیا ہے اور تم اندر آسکتے ہو۔)"
حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ "میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (حاضر ہونے کی) اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کون ہے؟"
میں نے کہا۔ "میں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میں میں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اجازت طلب کرنے والے سے پوچھا جائے۔ "کون ہے؟" تو جواب میں اپنا نام یا لقب اور کنیت وغیرہ (جو چیز زیادہ معروف ہو) بتانا چاہیے۔

2۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا "میں میں" فرمانا صحابی کے جواب پر ناپسندیدگی کا اظہار تھا' یعنی یہ طریقہ درست نہیں۔

3۔ دروازہ کھٹکھٹانا یا گھنٹی بجانا بھی اجازت طلب کرنے کے مفہوم میں داخل ہے۔ جب کوئی دروازے پر آکر نام پوچھے تو سلام کرکے گفتگو کی جائے۔

جس آدمی سے پوچھا جائے تونے صبح کیسے کی؟ (تیرا کیا حال ہے؟ تو وہ کیا جواب دے)

حضرت ابو اسید (مالک بن ربیعہ) ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے تو فرمایا۔

"السلام علیکم!"

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر حاضرین رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "وعلیک السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہاری صبح کیسی ہوئی؟ (کیا حال ہے؟")

انہوں نے کہا۔

"خیریت سے ہوئی ہم اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ آپ کی صبح کیسی ہوئی؟ اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میری صبح بھی خیریت سے ہوئی۔ میں اللہ کی حمد کرتا ہوں۔"

جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز شخص آئے تو اس کی عزت کرو

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز شخص آئے تو اس کی عزت کرو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ مہمان کا اکرام اس کے مقام و مرتبے کے مطابق ہونا چاہیے۔

2۔ غیر مسلم مہمان سے بھی خندہ پیشانی سے ملنا اور اس کی مناسب خاطر تواضع کرنا ضروری ہے' لیکن کوئی ایسا کام نہ کیا جائے' جس سے اسلام اور مسلمانوں کے شرف و وقار میں کمی ہو۔

یہودی کے سوال

عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ (یہود کے عالم) کو یہ خبر پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے ہیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے کہنے لگے "میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتیں پوچھتا ہوں پیغمبر کے سوا کوئی اور ان کو نہیں جان سکتا۔"

قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟

اور بہشتی لوگ بہشت میں جاکر پہلے کیا کھائیں گے؟

اور بچہ اپنے باپ کے مشابہ کیوں ہوتا ہے؟ اسی طرح اپنے ننھیال کے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابھی ابھی جب تو نے (پوچھا) جبرئیل نے یہ باتیں مجھ کو بتلا دیں۔"

عبداللہ نے کہا یہ فرشتہ یہودیوں کا دشمن ہے ان کے زعم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قیامت کی پہلی نشانی ایک آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے مغرب لے جائے گی۔

پہلا کھانا بہشتیوں کا مچھلی کے کلیجے پر جو ٹکڑا لٹکا رہتا ہے وہ ہوگا (نہایت لذیذ ہوتا ہے)

"بچہ کے مشابہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب مرد عورت سے صحبت کرتا ہے اگر مرد کا پانی آگے بڑھ جاتا ہے (غالب آجاتا ہے مسلم) تو بچہ باپ کے مشابہ ہو جاتا ہے اگر عورت کا پانی آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کے مشابہ ہو جاتا ہے۔"

عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے یہ سن کر عرض کی "میں گواہی دیتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں" پھر انہوں نے عرض کی۔

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہودی لوگ انتہ کے جھوٹے فریبی (لپوٹ) ہیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ان سے میرا حال پوچھیے۔ پوچھنے سے پہلے اگر ان کو معلوم ہو جائے گا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو وہ مجھ کو جھوٹا لپاٹیا کہیں گے۔" (کبھی میری تعریف نہیں کریں گے)

خیر یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایک کوٹھڑی میں چلے گئے (چھپ گئے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا۔

"عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ تم میں کیسا آدمی ہے؟"

انہوں نے کہا "عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ عالم ہیں اور عالم کے بیٹے اور سب سے افضل اور سب سے افضل کے بیٹے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو اگر عبداللہ مسلمان ہو جائیں (تو تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے۔)

انہوں نے کہا اللہ نہ کرے) اللہ ان کو مسلمان ہونے سے بچائے رکھے۔

یہ سن کر عبداللہ کوٹھڑی سے نکلے اور کہنے لگے۔

"اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمدا رسول اللہ" اس وقت یہودی شرمندہ ہو کر کیا کہنے لگے۔

"عبداللہ تو ہم سب میں برا آدمی ہے' سب سے برے شخص کا بیٹا ہے۔" لگے اس کو سخت سست کہنے۔ (بخاری شریف)

جبری نکاح

اگر کسی شخص نے اپنی بیٹی کا (کنواری ہو یا ثیبہ) جبراً" نکاح کردیا اور وہ اس نکاح سے ناراض تھی تو نکاح باطل ہوگا۔

(بخاری شریف)

عبدالرحمان اور مجمع سے روایت ہے' جو دونوں یزید بن جاریہ کے بیٹے تھے انہوں نے خنساء بنت خذام سے تحقیق کی ان کے باپ نے ان کا نکاح کردیا' وہ ثیبہ تھیں (خاوند کر چکی تھیں) اس دوسرے نکاح سے ناراض تھیں آخر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے باپ کا کیا ہوا نکاح (ختم) فسخ فرمادیا۔

(بخاری شریف)

شادی میں گانا بجانا

ربیع جو معوذ بن عفرا کی بیٹی تھی' وہ کہتی تھی "جب میری رخصتی کی گئی تو (اس سے دوسری صبح) نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے

اور ہماری چند بچیاں اس وقت دف بجا رہی تھیں' ہمارے بزرگوں کا ذکر کر رہی تھیں۔ جو بدر کی لڑائی میں مارے گئے تھے' اتنے میں ایک بچی یہ مصرعہ گانے لگی ایک پیغمبر ہم میں ہیں جو جانتے ہیں کل کی بات (یعنی کل کی ہونے والی بات) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ مت گا جو تو پہلے گا رہی تھی وہ گا۔"

(بخاری شریف)

نکاح کی شرائط

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کسی عورت کو اپنے خاوند سے یہ درخواست کرنا درست نہیں کہ وہ اس کی بہن (سوکن) کو طلاق دے دے تاکہ اس کے حصے کا پیالہ بھی خود انڈیل لے (یہ ہو نہیں سکتا) جتنا اس کی قسمت میں ہے اتنا ہی ملے گا۔"

(بخاری شریف)

درجہ وار اشتہارات

انشاجی

درجہ وار اشتہارات اردو صحافت میں نووارد ہیں۔ ہم حیران ہوا کرتے ہیں کہ جب یہ نہ ہوا کرتے تھے تو لوگ کیسے بنگلے بیچتے یا خریدتے تھے۔ نام کیسے بدلا جاتا تھا کہ مجھے آئندہ گھسیٹا خاں کے بجائے مرزا صبغت اللہ بیگ کہا جائے۔ مشفق والدین سعادت مند اولاد کو کیسے عاق کرتے اور ان کے لین دین سے بے تعلقی کا اظہار کیسے کرتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ شادیاں کیسے ہو جاتی تھیں۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ ان اشتہاروں میں سے اور کوئی پڑھا جائے یا نہ پڑھا جائے "ضرورت رشتہ" کا اشتہار ضرور پڑھا جاتا ہے اور اس میں زید' بکر' بچے' بوڑھے' شادی شدہ' غیر شادی شدہ کی تخصیص نہیں۔

"تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔"

عرضی نویسوں کی زبان کی طرح ضرورت رشتہ کے اشتہاروں کی عبارت بھی قریب قریب مقرر ہے۔ دوشیزہ ہمیشہ قبول صورت' پابند صوم وصلوٰۃ اور سلیقہ مند ہوتی ہے اور اس کا ایک معزز گھرانے سے تعلق ہوتا ہے۔ مرد ہے تو پڑھا لکھا' برسر روزگار اور شریف خاندان کا چشم و چراغ ہوتا ہے۔ بی اے پاس لڑکی کے لیے ایم اے پاس شوہر ڈھونڈا جاتا ہے۔ گزیٹڈ افسر کی مانگ بالعموم رہتی ہے۔ کچھ لوگ احتیاطاً" یہ بھی لکھ دیتے ہیں کہ لڑکا یوپی یا دہلی کا ہونا چاہیے۔ پنجاب والے خط و کتابت کر کے وقت ضائع نہ کریں۔ بعضے حنفی المذہب یا اثنا عشری کی قید بھی لگا دیتے ہیں' لیکن اکثر مشتہرین فراخ دل واقع ہوتے ہیں اور ذات پات کی تمیز کے سخت خلاف ہوتے ہیں۔ فریق ثانی سے بھی ان کی یہی توقع ہوتی ہے کہ ذات پات کی تمیز نہ کریں گے۔ خط و کتابت صیغہ راز میں رہتی ہے۔

ان اشتہاروں کا تجزیہ کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں شکل' عقل کا ہونا ضروری نہیں۔ یہ آنی جانی اور فانی چیزیں ہیں۔ گچھے دار مونچھیں یا گدی پر پٹے رکھنے' بھنگ یا چرس پینے' شعر کہنے' نسوار کھانے' نہانے دھونے سے پرہیز کرنے' مصنوعی دانت' آنکھ لگانے یا لاٹھی ٹیک کر چلنے وغیرہ پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ بشرطیکہ دولہا میاں گزیٹڈ افسر یا صاحب جائیداد ہوں۔ کلرک پیشہ اور بے روزگار لوگوں کی توجہ اس جدید نظم کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے' جس میں ایک شخص مرتے وقت کہتا ہے:

میں کنوارا ہی رہا
کاش میرا باپ بھی۔۔۔

پرانے زمانے میں شادی کا مسئلہ بہت آسان تھا۔ دروپدی کے سوئمبر میں فقط اتنی سی شرط تھی کہ یہ جو اوپر چکر میں مچھلی گھوم رہی ہے۔ اس کا عکس پانی میں دیکھ کر تیر سے اس کی آنکھ پر نشانہ لگایا جائے۔ یہ کوئی نہ پوچھتا تھا کہ نشانہ لگانے والا کانا ہے' یا لنجا ہے۔ کالا ہے یا گورا ہے۔ اکبر الہ آبادی سے روایت ہے کہ لیلیٰ کی ماں نے بھی مجنوں کا حسب و نسب' سکونت' ولدیت وغیرہ نہیں پوچھے تھے۔ بس یہی کہا تھا کہ

بیٹا! تو جو کرلے ایم اے پاس
تو فوراً" بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے' ورنہ آج کل ایک ایک یونیورسٹی سے اتنے ایم اے نکل رہے ہیں کہ لیلیٰ کی ماں کے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ اسی طرح فرہاد میاں نے رشتہ مانگا تو شیریں سلطانہ نے فقط یہ شرط کی کہ یہ سامنے والا پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر لے آؤ تو بندی کو عذر نہیں۔

پرانے لوگ بہت احتیاط کرتے تو سوجھ بوجھ کا امتحان لینے کے لیے پہیلیاں اور معمے بھجواتے۔ جو پاس ہو جاتا اس کو لڑکی کا ڈولا دے دیتے۔ کبھی نہ پوچھتے کہ کیا تنخواہ ہے' کرائے کے مکان میں رہتے ہو یا اپنا ہے۔ پنجاب کے ہو یا یوپی کے' شیعہ ہو یا سنی۔ ایسا ہی ایک شخص ایک بار کسی راجکماری سے شادی کا طلب گار ہو کر آیا۔ راجکماری کو بالعموم سخت پردے میں رکھا جاتا تھا۔ چشم فلک بھی اسے دیکھنے کو ترستی تھی۔ لیکن اس امیدوار نے اتفاقاً" اس حسن جہاں سوز کو جھروکے میں کھڑے دیکھ لیا۔ بہت فرار کی کوشش کی لیکن پہرے کا انتظام سخت تھا۔ آخر وہ سوال و جواب کے لیے بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔

وزیر اعظم نے حسب دستور قابلیت جانچنے کے لیے سوال پوچھنے شروع کیے۔

"دو اور دو کتنے ہوتے ہیں"

امیدوار نے حساب لگا کر کہا۔

"سات۔"

وزیر اعظم نے کہا۔

"شاباش! اب دوسرے سوال کا جواب بھی ٹھیک دو تو تم کامیاب سمجھے جاؤ گے۔"

"وہ کون سا جانور ہے جس کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں اور جو بھونکتا ہے۔"

امیدوار نے تھوڑا سا غور کرنے کے بعد کہا۔

"طوطا۔"

لیکن اس کی یہ ترکیب نہ چلی۔ درباریوں نے مبارک سلامت کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا اور دھوم دھام سے شادی کر کے راجکماری سے گلو خلاصی کرائی۔

نقل کفر' کفر نباشد۔ شادی کے متعلق حکما کا قول ہے کہ جو کرے پچھتائے' جو نہ کرے پچھتائے۔ یہ ایک حلقہ ہے کہ باہر والے اندر جانے کے لیے بے چین ہیں اور اندر والے باہر نکلنے کے لیے مضطرب ہیں۔

لیکن چند مستثنیات کو چھوڑ کر عام لوگوں کے لیے شادی ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا ایک دن مقرر ہے' چاہے نیند رات بھر آئے یا نہ آئے۔ آج تم' کل ہماری باری ہے۔ تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے' لیکن اشتہاری شادی کا معاملہ اجمال کے بجائے قدرے تفصیل کا طالب ہے۔

اشتہاری شادی میں شروع میں دونوں طرف خلوص زوروں پر ہوتا ہے۔ نہ صرف خط و کتابت بلکہ بیشتر حالات بھی صیغہ راز میں رہ جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ معلوم ہوتا ہے کہ دلہن صاحبہ ویسے ٹھیک ہیں' لیکن گنجی ہیں اور دولہا صاحب جو کالی عینک لگائے رہتے ہیں نقطہ نظر کے لحاظ سے موحد ہیں۔ ساری دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ بیوی بے شک کھری سید زادی ہے' لیکن اس کے دادا کا بریلی میں ہیر کٹنگ سیلون تھا۔ دولہا صاحب البتہ مغل ہیں۔ اس رعایت سے ہیں کہ مغل واشنگ فیکٹری والوں سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ بیوی جن کو ان کے ظفر الملت والدین بے بی کہہ کر یاد کرتے ہیں' پہلی جنگ عظیم کے واقعات کی چشم دید گواہ ہیں اور میاں آٹھوں گانٹھ گریجویٹ ہیں' لیکن ان کی ڈگری تقسیم کے ہنگامے میں ہندوستان میں رہ گئی۔ انگریزی بولنے' لکھنے پڑھنے سے احتراز ایسا اختیاری بھی نہیں جیسا کہ بتایا تھا۔ اردو کی محبت کے علاوہ اس کی اور وجہیں بھی ہیں۔ گزیٹڈ اس نے کہہ دیا تھا کہ ان کی گزیٹڈ ہونے کی باری آ گئی تھی' لیکن ریٹائرمنٹ کی میعاد اس سے پہلے آ گئی۔

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
زیست نے ہم سے بے وفائی کی

یہ خیال کرنا غلط ہو گا کہ ایسی شادیاں کامیاب نہیں ہو سکتیں' بلکہ زیادہ کامیاب یہی ہوتی ہیں۔ دونوں طرف آگ برابر لگی ہوتی ہے۔ دونوں کے خضاب کی مدت ایک وقت ختم ہوتی ہے۔ دونوں کے صیغہ راز سے ایک ساتھ پردہ اٹھتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ داستانوں کے کرداروں کی طرح بقیہ عمر ہنسی خوشی گزار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

علی گل پیر سے ملاقات

شاہین رشید

دنیا میں لوگوں کے ہجوم میں بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو راتوں رات مقبولیت کی تمام منازل طے کرلیتے ہیں۔ علی گل پیر نے بھی "وڈیرے کا بیٹا" گا کر راتوں رات شہرت حاصل کرلی۔۔۔

ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اتنے ٹیلنٹڈ انسان کا انٹرویو کیا جائے، سو آپ کے سامنے حاضر ہیں۔

"کیسے ہیں علی گل! اور بہت مبارک ہو۔ آپ کے ایک گانے نے آپ کو شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ ذرا تفصیل بتائیں۔"

"بنیادی طور پر میرا تعلق دادو شہر (سندھ) سے ہے۔ میں 14 فروری 1986ء کو اسلام آباد میں پیدا ہوا۔ وہاں آٹھ سال رہا، پھر کینیڈا چلا گیا۔ وہاں چھ سال گزارے، پھر واپس پاکستان آیا اور کراچی میں قیام کیا۔ کراچی کے ایک اسکول میں داخلہ لیا۔ کراچی میں بھی میں نے وڈیرا کلچر دیکھا۔ یہ سب باتیں میرے لیے بہت زیادہ غیر معمولی تھیں۔ میں بغور ان کا مشاہدہ کرتا تھا۔ تو بس اچانک ایک دن ذہن میں آیا کہ ان لوگوں پر کچھ لکھنا چاہیے۔ اس وقت گانا لکھنے کا تو نہیں، البتہ ایک کامیڈی خاکہ لکھنے کا خیال ضرور آیا اور جب میں لکھنے بیٹھا تو مجھے خود احساس ہوا کہ یہ تو گانا بھی بن سکتا ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو روکا نہیں اور لکھتا چلا گیا۔ شاعری میں بچپن سے کر رہا ہوں، مگر میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں اچھا لکھ رہا ہوں اور اگر لوگوں کو دکھاؤں گا تو انہیں پسند آئے گا یا نہیں۔ اس کے لیے بھی میرے ذہن میں یہی کچھ تھا۔

خاکہ لکھتے لکھتے اچھا خاصا گانا بن گیا تو پھر میں ریڈیو کے کچھ لوگوں سے ملا۔ کچھ ٹی وی کے لوگوں سے ملا لیکن میں ڈائریکٹ کسی بڑے ایگزیکٹو سے نہیں ملا۔ میرا ایک دوست تھا اس کے دوست کا ایک دوست اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا کسی چینل پہ۔ ہم اس سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تمہارے لیے بھی برا ہو سکتا ہے اور ہمارے لیے بھی۔ اسے اپنے دوستوں تک ہی محدود رکھو تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی، کیونکہ مجھے بہت سارے لوگوں نے یہ بھی کہا کہ آپ ڈریں نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوگا اور خود میرے دماغ میں بھی ایسی کوئی سوچ نہیں تھی کہ لوگ انجوائے کرنے کے بجائے مارنے کو دوڑیں گے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اس معاشرے سے انسانیت ختم نہیں ہوئی ہے اور لوگ مذاق کو سمجھتے ہیں۔ وہ میرے پیغام کو بھی سمجھ پائیں گے کیونکہ مجھے کسی کو نیچا نہیں دکھانا بلکہ یہ بتانا ہے کہ "یہ ہیں ہم" اور جب میں "ہم" بولتا ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ہم سب میں وڈیرے کے ایلیمنٹس ہیں کیونکہ ہم بھی ٹیڑھے راستے پہ چلتے ہیں لیکن یہ وڈیرے جن کا میں ذکر کرنا چاہ رہا تھا یہ ایسے لوگ ہیں جو ٹیڑھا راستہ ہی چلتے ہیں ان کے لیے یہی سیدھا راستہ ہے ان کی سوچ یہ ہے کہ اگر تمہیں کوئی آنکھ اٹھا کر دیکھ رہا ہے تو اس کو مار دو۔۔۔۔ میں نے اپنے اس گانے کے لیے کافی لوگوں سے رابطے کیے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"بہت مایوسی ہوئی ہوگی۔۔۔ پھر کس نے رسک لیا؟"

"ہاں مایوسی تو ہوئی مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور کرنا ہے۔ میں نے یونیورسٹی سے فلم میکنگ میں گریجویشن کیا ہے۔ تھیٹر بھی کرچکا ہوں۔ پھر میں نے چند دوستوں کی ایک ٹیم بنائی اور میوزک بنایا، ویڈیو بنائی، میں نے خود گایا اور پھر 14 جون 2012ء کو ہم نے اپنی ویڈیو انٹرنیٹ فیس بک پہ ریلیز کردی۔ اور صرف آٹھ نو گھنٹے میں چالیس پچاس ہزار لوگ اسے دیکھ چکے تھے۔

"بہت اچھا لگا ہوگا؟"

"جی! بہت اچھا لگا تین دن میں اس ویڈیو کو پسند کرنے والوں کی تعداد سوا سے ڈیڑھ لاکھ ہوگئی اور پندرہ دن میں پانچ، چھ لاکھ ہوگئے۔ ایک مہینے میں ایک کروڑ اور دو مہینوں میں دو کروڑ اور اب تک تقریباً" تین ساڑھے تین کروڑ ہوچکے ہیں اس کو پسند کرنے والوں میں۔"

"یہ کہاں تک سچ ہے کہ جو ویڈیو لوڈ کی، وہ آپ نے ایک موبائل فون سے بنائی تھی؟"

"نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہے چونکہ میں فلم میکر اسٹوڈنٹ ہوں۔ میں نے ڈائریکشن اور رائٹنگ پڑھی ہے اور میں اس بات پہ یقین رکھتا ہوں کہ ٹی وی ہو، ریڈیو یا انٹرنیٹ۔ آپ کو اپنا معیاری کام دکھانا چاہیے۔ اس لیے ہم نے ایک پراپر طریقے سے اور بہت اچھا ایکوئپمنٹ ارینج کیا تین منٹ کے اس گانے کو بہت پرفیکٹ انداز میں پیش کیا اور شکر ہے کہ ہم اس میں کامیاب ہوئے۔"

"خرچ کتنا آیا اور آپ نے خود سب خرچ کیا یا کسی نے تعاون کیا؟"

"اس ویڈیو کے لیے میں نے اپنی جیب سے ہی پیسے لیے۔ میں نے ایک اسپانسر سے بات کی تھی مگر انہوں نے انکار کردیا۔ ایک دو لوگوں سے اور بات کی تو سب نے کہا کہ یہ متنازعہ چیز ہے۔ تو پھر میں نے کسی سے پانچ ہزار، کسی سے چھ ہزار روپے ادھار لیے۔ ہمارا ٹوٹل خرچ پندرہ سے بیس ہزار آیا، میرے ساتھیوں نے کہا کہ ہم پیسے نہیں لیں گے تو میں نے ان سے کہا کہ اگر میں نے اس ویڈیو کو بیچا تو پھر میں جو کماؤں گا تم لوگوں کو ضرور دوں گا۔ تو بس اس طرح۔"

"پھر یہ گانا چینل تک کیسے پہنچا؟"

"گانا فیس بک پہ ریلیز ہوئے تین یا چار دن ہوئے تھے کہ اے آر وائی میوزک چینل وائس پریذیڈنٹ دانش خواجہ صاحب کا فون آیا اور اے آر وائی میوزک چینل سے یہ وڈیو چلی پھر جیو سے فون آیا اور یوں کچھ چینلز کو ہم نے ویڈیو دی اور کچھ چینلز نے خود ہی انٹرنیٹ سے اٹھا کر چلانی شروع دی۔ بس پھر "سائیں" کی شرٹس بن گئیں، ٹیک بن گئے، کیپ بن گئیں۔

"یعنی آپ کی مقبولیت میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور پیسے کا ریٹرن تو بہت ہوا؟"

"کہاں جی۔۔۔ جب آپ کسی چینل کو ویڈیو دیتے ہیں تو وہ آپ کو پیسے نہیں دیتے۔ وہ فری میں چلتی ہیں۔ بس شہرت آپ کو ملتی ہے۔ میری بھابھی ڈیزائنر ہیں۔ انہوں نے شرٹس ڈیزائن کردیں۔ شرٹس ڈیزائن ہوئیں اور ہم نے خود بھی بیچیں۔ پھر لائیو شوز میں بکنگ ہونے لگیں، پھر گانے کی رنگ ٹون سیٹ کی

اس سے یہ ہوا کہ تھوڑا بہت پیسہ ملنے لگا' پھر میں نے اپنے عملے کو بھی پیسے دیے پھر ریڈیو اور مارننگ شوز میں بلائے جانے لگے جب T-20 ورلڈ کپ کا چرچا ہوا تو یوفون والوں نے کہا کہ آپ ہمارے لیے ورلڈ کپ کا گانا بنائیں۔ پھر جو گانا ہم نے وسیم اکرم کے ساتھ بنایا تھا۔ اس کے مجھے اتنے سارے پیسے ملے۔ کہ اگر میں چاہوں تو ایک سال تک اس سے گزارہ کر سکتا ہوں" (ہنستے ہوئے)

"گڈ۔۔۔ آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"آج کل ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کنسلٹنگ جاب کر رہا ہوں۔ ان کی ٹیم کے ساتھ مل کر concept بناتا ہوں اور ایک دو کمرشل کے لیے کام کر رہا ہوں۔ مجھے ہر روز آفس نہیں جانا ہوتا بلکہ جب کوئی پروجیکٹ آتا ہے تو چلا جاتا ہوں۔ مجھے امریکا کی گورنمنٹ نے بلایا ہے مگر یہ بات میرے گانے سے پہلے کی ہے جب میں نے ایک پروگرام کے لیے اپلائی کیا تھا۔ اس پروگرام کے لیے امریکا نے پاکستان' انڈیا اور انڈونیشیا سے مختلف آرٹسٹوں کو بلایا ہے۔ دانش جا رہے ہیں۔ 31 اکتوبر کو ہم جائیں گے۔ تقریباً "بیس دن کا ہمارا ٹور ہے۔"

"وڈیروں تک آپ کی بات پہنچی کہ نہیں؟"

"جی پہنچ گئی' کیونکہ مجھے بہت سارے لوگوں سے رسپانس ملا اور 95 فیصد پازیٹیو رسپانس آیا اور 5 فیصد نگیٹیو۔ کچھ نے کہا کہ آپ نے سندھی کلچر کا مذاق اڑایا ہے۔ حالانکہ میں خود سندھی ہوں' دراصل ہم ایک جذباتی قوم ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات پر جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ملک کے حالات جو کہ اتنے برے ہیں' ان پر کوئی جذباتی نہیں ہوتا۔ بس ایک گانے پر جذباتی ہو جاتے ہیں۔"

"اب کچھ اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں۔"

"آپ نے پیر الٰہی بخش کا نام سنا ہو گا۔ جن کی پی آئی بی کالونی ہے اور جو پاکستان کے دوسرے چیف منسٹر آف سندھ تھے۔ وہ میرے پردادا تھے۔

جب تقسیم کے بعد لوگ سندھ میں آئے اور جو بالکل خالی ہاتھ تھے ان میں میرے دادا نے اپنی زمینیں تقسیم کیں اور ایک پی آئی بی کالونی بنائی کیونکہ میرے پردادا کا کہنا تھا کہ اصل قربانی تو ان لوگوں نے دی ہے جو اپنا گھر بار چھوڑ کر پاکستان آئے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ ابھی بھی جو لوگ اس کالونی میں رہتے ہیں' وہ میرے پردادا کی تعریف کرتے ہیں اور یہ تعریف نسل در نسل منتقل ہو رہی ہے۔ انسان اپنے کردار سے اور اپنی اچھائیوں سے لیجنڈ بنتا ہے اور میں اپنے پردادا اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو اپنا رول ماڈل بنا کر زندگی میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں جب پیدا ہوا تو میرے والد مکرم الحق پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان میں کام کرتے تھے۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں۔ اسلام آباد میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ والد صاحب نے کہا کہ آپ کو کینیڈا میں جا کر تعلیم حاصل کرنی چاہیے' فیملی کے ساتھ کینیڈا چلا گیا اور وہاں پڑھائی کا پروسس شروع ہو گیا۔ اس وقت پاکستان میں نواز شریف کی حکومت تھی اور اس وقت میرے چاچا پیر مظہر الحق (جو سندھ کے ایجوکیشن منسٹر ہیں) اور میرے ابو سیاست میں بہت ان تھے۔

"آپ کی بات کاٹ رہی ہوں۔ وڈیرے کے بیٹے تو آپ خود بھی ہیں؟"

"آپ میری کہانی سنیں' پھر ڈیسائیڈ کیجیے گا۔۔۔ میرے ابا کو کرپشن کے الزام میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب ہمیں پتا چلا تو ہم واپس آ گئے۔ ابو نے کرپشن کیس لڑے اور جیت گئے۔ مشرف دور میں چھ سات سال یہ کیس چلے۔ وہ چھ سات سال میری زندگی کے ٹرننگ پوائنٹ تھے۔ کیونکہ میں ٹین ایج میں تھا اور یہی وہ عمر ہوتی ہے جب انسان کی شخصیت بنتی ہے۔ اس عمر میں میں نے بہت مشکل وقت دیکھا۔ جن کے پاس ایک بنگلہ دو گاڑیاں اور اچھی خوشحال زندگی تھی' وہ اس لیول پہ آ گئے کہ نہ گھر رہا اور نہ گاڑی رہی۔ کچھ زمینیں تھیں' مگر ان کے کچھ مسائل تھے۔ بڑی مشکل سے سب کچھ سیٹ ہوا۔ ہم سب نے بہت محنت کی۔

میں نے اسکالرشپ لی۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کام بھی کیے۔ اسٹیج شوز کیے' کچھ پیسہ وہاں سے مل جاتا تھا' اظفر علی کے ساتھ "لائٹ آن ہے" کرتا رہا۔ اپنی ٹیم کے ساتھ مشہور پروڈکٹ کی ڈاکومنٹریز بھی بنائیں۔ کچھ حالات اچھے ہونے شروع ہو گئے۔ بھائی نے تعلیم مکمل کر کے بینک میں جاب کی۔ ایک زمانہ تھا کہ بہت کچھ تھا۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ کچھ بھی نہ رہا۔۔۔ اور اب جو ہے' وہ زیادہ اچھا لگتا ہے کیونکہ برا وقت دیکھ کر اچھا وقت دیکھ رہے ہیں۔ آج میں فخریہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ایک پیسہ بھی کسی سے نہیں لیا۔ آج جو کچھ میں نے بنایا ہے' اپنی محنت سے بنایا ہے۔"

"والد کا تعلق بھی کسی پارٹی سے تھا؟"

"نہیں! میرے والد کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں تھا' البتہ وہ گورنمنٹ ایمپلائی تھے مگر ان کے بھائی تھے سیاست میں۔ آج کل میرے والد امریکا میں ہوتے ہیں۔ وہ صحافی ہیں۔"

"اس وقت جب والد پہ کیس چل رہے تھے' کچھ نے برا کہا ہو گا اور کچھ نے ہمدردی کی ہو گی۔ اس وقت کیا کیفیت تھی آپ کی؟"

"بڑے بڑے جو کامیڈین ہوتے ہیں ان کے بیک گراؤنڈ میں کوئی نہ کوئی کہانی ضرور ہوتی ہے۔ میں آپ کو مثال دوں گا جم کیری کی! ان کے لیے یہ بات مشہور ہے کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ وین میں رہتا تھا۔ اپنے پہلے شو سے پہلے اس کے ابا کا انتقال ہو گیا۔ پھر اس نے اپنی ماں کو بہت غربت میں دیکھا اور اپنی غربت میں ہی اس نے اپنی ماں کو ایک کروڑ کا چیک لکھ کر دیا اور کہا کہ "ایک دن آپ اسے کیش کرائیں گی" اور پھر اس کی ماں نے ایک دن وہ چیک کیش کرایا۔ میں جم کیری اور ان جیسے بہت سے کامیڈین کو جانتا ہوں جو بہت برے حالات سے گزرے اور پھر کامیابی حاصل کی اور جب میں برے حالات سے گزر رہا تھا تو میں ہنستا تھا۔ اور مجھے اب لگتا ہے کہ وہ اسٹیج میرے لیے بہت اہم تھی۔ اگر میں ان حالات سے نہ گزرتا تو آج مجھے چھوٹی چھوٹی چیزوں کی قدر نہ ہوتی۔

میں نے اپنی امی سے کہا کہ میں کراچی میں ہی رہ کر پڑھوں گا اور الگ رہوں گا۔ میں ڈیڑھ سال الگ رہا اور زندگی کے تجربات کو اکیلا رہ کر حاصل کیا کہ جب سارے کام خود کرنے پڑتے ہیں تو کیسا لگتا ہے۔ اب امی کے ساتھ ہی رہتا ہوں کیونکہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔"

"بس اب شادی کرلیں۔ ماں کو بھی سکھ مل جائے گا۔"

"میرے بڑے بھائی شادی شدہ ہیں اور ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ جہاں تک میری شادی کا تعلق ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ شادی کرلو تو بہت ساری چیزیں رک جاتی ہیں ۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ ہر چیز ٹائم پہ ہی اچھی لگتی ہے اور میں نے تو اب کمانا شروع کیا ہے اور آپ کو پتا ہی ہے کہ آرٹسٹ کی کوئی ماہانہ تنخواہ نہیں ہوتی۔ کبھی پانچ دس ہزار تو کبھی دو لاکھ بھی کما لیتا ہے تو جب تک کچھ مستقل طور پر کام نہیں بن جاتا۔ اس وقت تک کوئی ذمہ داری لینا نہیں چاہیے۔"

"اس فیلڈ میں میں نے سنا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے حسد بہت کرتے ہیں۔ کیا ایسا ہے؟"

"جی بالکل ایسا ہے اور اس کی مثال میں آپ کو یہ دوں گا کہ کیکڑوں کو اگر باسکٹ میں ڈال دیں تو وہ اوپر نہیں آتے بلکہ ایک دوسرے کو ہی نیچے کر رہے ہوتے ہیں۔ ہماری فیلڈ میں بھی بس ایسا ہی ہے۔"

"تقدیر اور تدبیر کس پہ زیادہ یقین ہے ؟ قسمت میں لکھا ہوتا ہے سب کچھ یا محنت سے ملتا ہے سب کچھ؟"

"میرے خیال میں ففٹی ففٹی ہوتا ہے۔ قسمت ہمیشہ آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے کہ آپ اسے چینج کر لو ۔۔۔ کچھ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہیں لیکن ہم ان کو چینج نہیں کر سکتے بس وہی بات ہے کہ ہمت مرداں مدد خدا ۔۔۔ قسمت سے تو کسی کو انکار ہے ہی نہیں۔"

"مزاج کے کیسے ہیں ۔۔۔ اور کھانے پینے کے شوقین ہیں؟"

"مزاج کچھ یوں ہے کہ جتنی فنی چیزیں میں تھیٹر میں کرتا ہوں۔ اتنا فنی نارمل لائف میں نہیں ہوں۔ تھوڑا بورنگ انسان ہوں میں ایسا نہیں ہوں کہ آپ میرے پاس بیٹھیں گی تو ہنسنا شروع ہو جائیں گی۔ میں تھوڑا سنجیدہ بھی ہوں اور کھانے کا بہت شوقین ہوں ایک پورا دن بیٹھ کر میں کھانا کھا سکتا ہوں۔" (قہقہہ)

"لوگ مل کر کیا رسپانس دیتے ہیں؟"

"بہت اچھا رسپانس دیتے ہیں۔ دعائیں ہی ملتی ہیں ہر عمر کے لوگ ملتے ہیں اور بہت پیار اور عزت سے ملتے ہیں۔ اللہ نے عزت دے دی ہے ورنہ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا ہے۔ بس خواہش تھی کہ کچھ ایسی چیز کروں کہ لوگ دس سال بعد بھی تعریف کریں اور میرے خیال سے ایسا ہو گیا ہے۔ ایک دن میں زینب مارکیٹ گیا تو پوری ایک لائن میں "سائیں" کی شرٹس لگی ہوئی تھیں مختلف ریمارکس کے ساتھ اور مجھے دیکھتے ہی لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔"

"بہت شکریہ علی گل! آپ نے اتنا ٹائم دیا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے علی گل سے اجازت چاہی۔

☆

باتیں ایمن طارق سے

شاہین رشید

1 اصلی نام؟
"ایمن طارق۔"
2 پیار کا نام؟
"ایمی۔"
3 تاریخ پیدائش؟
"11 جون 1981ء۔"
4 شہر؟
"کراچی۔"
5 ستارہ؟
"جیمنائی (جوزا)"
6 قد بغیر ہیل کے؟
"(قہقہہ) پانچ فٹ سات انچ۔"
7 تعلیمی قابلیت؟
"آئی آر میں ماسٹرز۔"

8 بہن بھائی / آپ کا نمبر؟
"چار بہن بھائی۔ میرا نمبر دوسرا ہے۔"
9 شادی کے بارے میں آپ کا خیال؟
"ارے یہ کیا سوال ہے..... کچھ کہہ نہیں سکتی۔"
10 ستاروں سے شدبد؟
"اپنے ستارے سے ہے جو کہ سمجھتی ہوں کافی خطرناک ہے۔"
11 آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟
"میرے لیے ..... کوئی نہیں ۔ کسی کو اتنا پیار نہیں ہے۔"
12 آپ کی دلچسپیاں؟
"اداکاری پہلی ترجیح ہے۔ تھیٹر سے بہت لگاؤ ہے۔"
13 تھیٹر سے وابستگی؟
"میں نے تھیٹر آرٹ میں گریجویٹ کیا ہے ناپا سے (Napa)"

14 شوبز میں آمد ارادی یا غیر ارادی؟
"مجھے پڑھائی کا بہت شوق ہے۔ تھیٹر میں پہلے سے ہوں۔ اداکاری میں غیر ارادی طور پر آئی۔"
15 دنیا گھومی؟
"تھیٹر کی وجہ سے انڈیا بہت گئی ہوں۔ گزشتہ سال چار میں پانچ مرتبہ گئی تھی 'ناپا کے پلیٹ فارم سے۔"
16 انڈیا میں پاکستانی تھیٹر کی مقبولیت؟
"بہت زیادہ ہے۔ خاص طور پر اردو زبان کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔"
17 آج کی عورت کتنی محنتی ہے؟
"بہت زیادہ..... کم سے کم مردوں سے زیادہ کام کرتی ہے۔"
18 تنقید ہونی چاہیے؟
"بالکل ہونی چاہیے۔ مگر تنقید برائے تعمیر۔"
19 شوبز میں متعارف کرانے کا سہرا؟
"تھیٹر کے ذریعے آئی۔"
20 کون سا میڈیا زیادہ مشکل ہے 'تھیٹر یا ٹی وی؟
"ٹی وی..... ٹیکنیکل میڈیا ہے..... تھیٹر آسان ہے۔"
21 حوصلہ افزائی کون کرتا ہے گھر والے یا عام لوگ؟
"دونوں ..... گھر والے بہت شوق سے میرے ڈرامے دیکھتے ہیں اور باہر والے میری تعریف کرتے ہیں۔"
22 وہ پروگرام جو وجہ شہرت بنا؟
"میری وجہ شہرت تھیٹر ہے۔ کافی سارے پروگرام ہیں۔ کسی ایک کا نام نہیں لے سکتی۔"
23 آپ کی اصل پہچان ڈرامہ آرٹسٹ یا تھیٹر آرٹسٹ؟
"تھیٹر آرٹسٹ..... اور اسے ہی قائم رکھنا چاہوں گی۔"
24 آپ کی پہلی ترجیح؟
"تھیٹر اور صرف تھیٹر۔"
25 تھیٹر پر پہلا پروگرام؟
"سفید خون..... آغا حشر کاشمیری کا ضیا محی الدین صاحب نے ڈائریکٹ کیا تھا۔"
26 پہلا پروگرام ٹی وی پہ؟
"ٹیلی فلم 'احتشام الدین نے ڈائریکٹ کی تھی۔ "ہم" ٹی وی سے آن ایر ہوئی تھی۔"
27 انڈر پروڈکشن ڈراموں کی تعداد؟
"کافی ہیں۔ صحیح تعداد یاد نہیں۔"
28 چیلنجنگ کیا ہے سوپ یا سیریل؟
"سوپ..... روز کا کام روز چلتا ہے سوپ میں ۔"
29 پہلی کمائی؟ / کیا کیا تھا؟
"مت پوچھیں کیا تھی۔ مگر خوشی بہت ہوئی تھی اور خرچ کر دی تھی۔"
30 آپ کا پہلا فخر؟
"میری پہلی کمائی جس پر مجھے بہت فخر ہے۔"
31 پہلی محبت؟
"پہلی محبت تھیٹر 'پہلی کمائی تھیٹر 'پہلا جنون تھیٹر ہے۔"
32 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
"کہ موڈ میرا بھی اچھا ہو اور گھر والوں کا بھی۔"
33 ڈپریشن ہوتا ہے؟
"بہت شدید ہوتا ہے اور پتا نہیں کیوں 'صبح کے وقت ہوتا ہے۔"
34 کن قوانین کو نافذ کر کے ملک کو بحران سے نکالا جا سکتا ہے؟
"میرا تو خیال ہے کہ میڈیا کے ذریعے ملک کو بحران سے نکالا جا سکتا ہے کیونکہ لوگ میڈیا کی بات سنتے ہیں۔"
35 اپنے چہرے کے خدوخال میں کیا پسند ہے؟
"میری آنکھیں پسند ہیں۔"
36 آپ شکر ادا کرتی ہیں کہ؟
"خدا نے مجھے ایک مکمل انسان بنایا ہے۔"
37 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
"اپنے کمرے میں۔"
38 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"
39 اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟
"کوشش کرتی ہوں کہ اپنے مسائل خود ہی حل کر لوں۔"

40 کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟
"مجھے گہری نیند آتی ہی نہیں ہے۔ آہٹ سے بھی آنکھ کھل جاتی ہے۔"
41 پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟
"سامنے والا کتنا انسان ہے۔"
42 آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
"اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔"
43 کیا زندگی اپنی مرضی سے گزار رہی ہیں؟
"بالکل..... اپنی مرضی سے گزار رہی ہوں۔"
44 اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہیں؟
"جب میں بہت افسردہ ہوتی ہوں۔"
45 زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟
"اپنے آپ کے لیے..... مجھے تو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں ہے۔"
46 اگر دعا سے کوئی مل سکتا تو کس کو مانگتیں؟
"سکون و آرام۔"
47 کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی کو بدل دیا ہو؟
"میرے کچھ ٹیچرز ہیں' کچھ دوست ہیں۔"
48 کب بات کرنے کا دل نہیں چاہتا؟
"جب مجھے بھوک لگی ہو اور کچھ کھانے کو نہ ملے تو۔"
49 پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟
"اپنا نام۔ ہر جگہ اپنا سائن کرنے کی عادت ہے۔"
50 آٹوگراف میں کیا لکھتی ہیں؟
"میں ہمیشہ شیکسپیئر یا کسی بھی مشہور انسان کے قول لکھتی ہوں۔"
51 کوئی غلطی جس کو سوچ کر شرمندگی ہوتی ہو؟
"اگر میری وجہ سے کسی کا دل دکھا ہو تو شرمندگی ہوتی ہے۔"
52 کبھی غصے میں اپنے آپ کو سزا دی؟
"ہاں! کیوں نہیں۔ ساری نعمتیں اپنے اوپر حرام کر لیتی ہوں۔ کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔"
53 کبھی سوچا کہ چند سال بعد آپ کہاں ہوں گی؟
"نہیں ایسا کبھی نہیں سوچا۔"
54 کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
"امی اور صرف امی۔"
55 پسندیدہ ناشتا؟
"آملیٹ۔"
56 موڈ کب خراب ہوتا ہے؟
"کوئی خاص وجہ نہیں۔ کبھی بھی ہو سکتا ہے' کسی بھی بات پر۔"
57 اپنی کوئی بری عادت؟
"میں حساس بہت ہوں۔ جذباتی بہت ہوں۔"
58 ملک میں کون سی تبدیلی بہت ضروری ہے؟
"بہت سی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ خاص کر حکومت کی تبدیلی۔"
59 تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتی ہیں؟
"تنہائی ملتی کہاں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ سے۔"
60 کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟
"ہاں! کیوں نہیں' مگر محنت بھی ضروری ہے۔"
61 بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟
"آج کل تو کوئی بھی نہیں ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔"
62 اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟
"یار! میں حساس بہت ہوں۔ یہ چیز کبھی کبھی مجھے نقصان بھی پہنچاتی ہے۔"
63 گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟
"امی ابو سے مل کر اپنے کمرے میں جاؤں۔"
64 سائنس کی بہترین ایجاد؟
"بہت سی ہیں ان میں ایک موبائل بھی ہے۔"
65 تہوار جوش و شوق سے مناتی ہیں؟
"عید الفطر اور رمضان المبارک۔"
66 اپنے آپ کو کب پرسکون محسوس کرتی ہیں؟
"جب کام سے فارغ ہو کر اپنے بستر پر لیٹتی ہوں۔"
67 پسندیدہ رائٹر؟

"شیکسپیئر۔"
68 غلطی کا اعتراف کس طرح کرتی ہیں؟
"سوری کر کے۔"
69 جھوٹ کب بولتی ہیں؟
"کوشش کرتی ہوں کہ نہ بولوں۔ اعتبار ختم ہو جاتا ہے جھوٹ بولنے سے۔"
70 چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟
"صرف اور صرف اپنے گھر والوں کے ساتھ۔"
71 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
"کتابیں پڑھتی ہوں۔ مجھے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔"
72 کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟
"غیر ضروری تنقید۔"
73 شہرت نے شخصیت کو بگاڑا یا سنوارا؟
"میں تو یہی کہوں گی کہ سنوارا ہے۔ اب پتا نہیں' میرے بارے میں دوسروں کی کیا رائے ہے۔"
74 کیا زندگی میں پلاننگ ضروری ہے؟
"میرے لیے تو ضروری نہیں' کیونکہ میں حال میں جینا پسند کرتی ہوں۔ فیوچر کس نے دیکھا ہے۔"
75 بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہیں؟
"نیند ہی تو نہیں آتی۔ کروٹیں ہی لیتی رہ جاتی ہوں۔"
76 زندگی کب بری لگتی ہے؟
"کبھی نہیں..... انجوائے کرتی ہوں۔"
77 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟
"جتنا ہاتھ میں آجائے۔"
78 اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ چینج کیا؟
"میرا خیال ہے' ایک دو مرتبہ۔"
79 سفر کس پر کرنا اچھا لگتا ہے' رکشا' بس یا اپنی کار؟
"اپنی سواری سب سے بہترین ہے۔"
80 کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہیں؟
"کپڑے' بیگز اور جو پسند آجائے۔"
81 کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟
"کسی کے لیے نہیں۔ اپنا ملک بہترین ہے۔"
82 انسان کا بہترین روپ مرد یا عورت؟
"میں عورت ہوں' اس لیے عورت ہی کہوں گی۔"
83 آپ کا ذریعہ معاش؟
"یہی میرا پروفیشن ہے' شوبز۔"
84 شوبز کی بڑی برائی؟
"لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔"
85 وقت کی پابندی کی کتنی قائل ہیں؟
"قائل تو ہوں' مگر پابندی ہوتی نہیں۔ فیلڈ ہی ایسی ہے۔"
86 آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟
"میرے خیال میں میں بھی عام لوگوں جیسی ہی ہوں۔"
87 کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ' چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟
"دونوں' مجھے چٹائی پہ بھی مزا آتا ہے۔"
88 کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
"موبائل اور والٹ۔"
89 مطالعہ ضروری ہے یا وقت گزاری؟
"مطالعہ بہت ضروری ہے۔"
90 اچانک چوٹ لگ جانے پر بے ساختہ جملہ؟
"اوئی ماں۔"
91 لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟
"مت پوچھیں' منہ سے کیا کیا نکلتا ہے۔"
92 اللہ تعالیٰ کی حسین تخلیق؟
"عورت..... یہ کائنات۔"
93 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
"اللہ مالک ہے۔ اسی نے شہرت دی بھی تو ہے۔"

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا' لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے' کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے' کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ' ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں' جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ

بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے۔ سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کرگیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من پالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

۸

آٹھویں قسط

فارم ہاؤس کیا ہوتا ہے؟ کیسا ہوتا ہے... یہ تو سعدیہ نے پہلے کبھی سوچا نہ تھا مگر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جانے والا محاورہ اس نے بہت بار پڑھ رکھا تھا اور اس روز فارم ہاؤس دیکھنے کے شوق میں کھاری کے ساتھ اندر داخل ہو

جانے کے بعد اسے اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا کہ آنکھیں کیسے پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

اس نے فارم ہاؤس کی رہائشی عمارت کا ایک ایک کمرا دیکھا اور ہر کمرے کی سجاوٹ نے اس کی آنکھیں پھاڑ دیں۔ ہر کمرے کے فرش پر مختلف رنگوں کی ٹائلیں جڑی تھیں۔ اس نے کھاری سے نظر بچا کر پاؤں کا جوتا اتار کر کئی بار کمروں کے فرش پر ٹائلوں کی ہموار سطح اور ٹھنڈک کو محسوس کیا۔

ان گنت کمرے، ان گنت طرز کی سجاوٹیں، کھاری کا تبصرہ اسے بتا رہا تھا کہ کون سا کمرا کس قسم کے مہمان کا مہمان خانہ تھا۔ کس کمرے میں کون کھانا کھاتا تھا۔ کس کمرے میں کون بیٹھ کر گپ شپ لگاتا تھا۔

"ایہہ دیکھ سعدیہ باؤ! پولیو (پولو) گراؤنڈ۔" ایک کمرے کی لمبی لمبی کھڑکیوں سے پردے ہٹا کر کھاری نے اسے کمرے سے باہر کا منظر دکھایا۔ کہیں سے اونچی کہیں سے نیچی سطح پر ایسے ہرے رنگ کی گھاس بچھی تھی جو سعدیہ نے کبھی کبھار اس کیلنڈر کی تصویروں میں دیکھی تھی جو اس کے اسکول کی بڑی مس کے کمرے میں ٹنگا رہتا تھا۔

اس گراؤنڈ میں مختلف جگہ پر بنے سوراخ بھی نظر آرہے تھے۔

"یہ سوراخ خرگوشوں کے بل نہیں" ان کے اندر گیندیں پھینکتے ہیں۔" کھاری نے اسے بتایا۔

"کیسے پاگل لوگ ہوں گے وہ جو گیندیں سوراخوں میں ڈالنے کو کھیل کہتے ہوں گے؟" سعدیہ نے اس گراؤنڈ سے متعلق کھاری کی تفصیل سن کر سوچا۔

"یہ پردے دبئی سے بن کر آئے ہیں اور فرنیچر لاہور سے۔" کھاری نے بتایا۔ "ساری لائٹیں پتا نہیں کون کون سے ملک سے آئی ہیں اور جتنا شیشہ لگا ہے، وہ بھی باہر سے آیا ہے۔ ماربل بھی باہر کے ملکوں سے اور یہ جو ڈیکریشن (ڈیکوریشن پیسز) ہیں سارا کچھ باہر سے آیا ہے۔"

سعدیہ نے اس طلسماتی محل کی ایک ایک چیز کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور پھر نظریں تھک جانے پر انہیں جھکا لیا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اتنی بڑی عمارت... اتنے سارے کمرے... اتنا بے شمار سامان اور برتنے والے لوگ ندارد۔ عمارت پر ایسا ہو کا عالم طاری تھا کہ اسے کھاری کی آواز گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

"بس کھاری! اب میں نے گھر جانا ہے۔" یکدم سعدیہ کا دل گھبرانے لگا اور اس نے چاہا کہ بس وہاں سے بھاگ جائے۔

"چلنے آں سعدیہ باؤ! ابھی سمنگ پول (سوئمنگ پول) دیکھ لو، کچن دیکھ لو، پھل، پھل تے سبزیاں تے دیکھ لو۔ ابھی تو بڑا کچھ رہتا اے۔" کھاری کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے چشم زدن میں سعدیہ کی نظروں کے سامنے عمارت کا سارا نقشہ گھما دے۔

وہ ایک انجان سی معتبری کی خوشی سے سرشار تھا۔

"اس محل میں کوئی انسان رہتا بھی ہے کھاری! یا یہ یونہی سجا سجایا گم صم کھڑا رہتا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔

"بڑیاں رونقاں ہوتی ہیں سعدیہ باؤ!" کھاری نے کہا۔ "بندے ہی بندے، پروہنے (مہمان) ہی پروہنے، پر آج کل بتایا تھا نا عید کی وجہ سے لوگ اپنے گھرو گھری (اپنے اپنے گھر) گئے ہیں۔ چوہدری صاب بھی ایدھر نئیں۔" کھاری نے ہنستے ہوئے کان میں انگلی پھیری۔ "اسی لیے تو میں نے سوچا کہ سعدیہ باؤ سکون سے دیکھ لے فارم ہاؤس۔"

"بس کھاری!" سعدیہ کی نظریں کھاری کی بات سننے کے دوران اس نشست گاہ، جس میں وہ دونوں کھڑے تھے، کسی دیوار پر ٹنگے ہرنوں کے سروں پر پڑ گئی اور اسے لگا، وہ اپنی سرمئی سرمئی آنکھوں سے بس اسے ہی گھورے جا رہے تھے۔

"بس اب میں نے جانا ہے۔" وہ تیز قدموں سے چلتی اس نشست گاہ سے باہر نکل آئی۔

اب وہ ایک طویل راہداری میں کھڑی تھی' جس میں کئی کمروں کے دروازے کھل رہے تھے اور جس کے دونوں سروں سے سیڑھیاں بالائی منزل کو جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ منقش آبنوسی ریلنگ اوپر جا رہی تھی۔

"اس لکڑی کا رنگ سیاہ کیوں پڑ گیا ہے کھاری؟" سعدیہ نے راہداری کے بائیں سرے پر پہنچ کر ریلنگ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ لکڑی ہوتی ہی ایسی رنگ دی ہے سعدیہ باؤ! اور بڑی مہنگی ہوندی ہے۔" کھاری نے سعدیہ کے چہرے پر پھیلے حیرت اور مرعوبیت کے آثار کو ترحم بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیچاری نے گاؤں کے جوہڑوں اور اپلوں سے سجی دیواروں سے آگے کچھ دیکھا ہوتا تو اتنی حیرانی نہ ہوتی۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا۔

سعدیہ نے راہداری کے اختتام پر باہر کی طرف کھلنے والے دروازے سے اندر آتی ہوا کو محسوس کیا اور سورج کی روشنی کی لکیر کو دیکھا۔ وہ سورج جو باہر تمتما رہا تھا اور وہ ہوا جو چہرے اور جسم کو جھلسائے دے رہی تھی' یہاں کیوں خنک لگ رہی تھی۔" اس نے اپنے دل میں سوال کیا۔

"سعدیہ باؤ! وڈے لوکاں دے وڈے کم۔" کھاری نے جیسے سعدیہ کے دل میں اٹھا سوال پڑھ لیا تھا۔

"اس عمارت کو اس طریقے نال بنایا گیا ہے کہ چاروں طرفوں ہوا آئے تے ٹھنڈی آئے۔"

سعدیہ رشک' خوف اور حسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔ قسم قسم کے پیڑ پودے' تاحد نظر سبزہ اور سبزے کے پار فارم ہاؤس کی طرف آتا سرخ منقش اینٹوں سے بنا راستہ' راستے کے دونوں طرف لکڑی کی باڑھ اور راستے کے عقب میں سیاہ آہنی گیٹ' اس کے دل پر ہیبت طاری ہونے لگی۔

"بس کھاری! اب گھر جانا ہے۔ اماں کا دل گھبرا رہا ہوگا۔" سعدیہ نے تیز قدموں سے باہر جانے والے راستے پر چلتے ہوئے کہا۔

"سعدیہ باؤ پیاس نئیں لگی؟" کھاری کو یاد آیا۔

"نہیں اب نہیں ہے پیاس۔" سعدیہ اب جلد از جلد ادھر سے نکل جانا چاہتی تھی۔

"تو ادھر کہاں جا رہی ہو سعدیہ باؤ؟" کھاری اس کی برق رفتاری پر ہنسا۔

"باہر جانے کا راستہ اے تے نئیں۔"

"ہیں؟" سعدیہ کے چلتے قدم رک گئے۔ "تو پھر؟"

"فارم ہاؤس وچ لکن میٹی کھیلو تے بندہ کبھی نہ ملے۔" کھاری ہنس رہا تھا۔

"ادھر کو آؤ۔" اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ سعدیہ کھاری کے اشارے پر بتائے ہوئے راستے پر چل دی۔ اس کا دل کسی انجانے خوف سے دھک دھک کرنے لگا۔ "یہ فارم ہاؤس ہے کہ بھول بھلیاں' قید خانہ ہے کہ طلسم خانہ۔" وہ باہر جانے والے راستے کو تاڑتی سوچ رہی تھی۔

"لو جی! یہ ہے گیٹ وڈا!" ایک طویل راستہ طے کر کے کھاری نے ایک گیٹ کے قریب پہنچ کر کہا۔

سعدیہ نے کھاری کی طرف دیکھا۔ "جب آئے تھے تو اتنا تو نہیں چلنا پڑا تھا۔"

"او سعدیہ باؤ! اندر آتے ہی تو کمروں میں چلے گئے تھے' پھر واپس تسی دوسری طرف نکل گئے' ایتھے تے ہونا تھا۔" کھاری نے دانت نکوستے ہوئے کہا۔

سعدیہ کو اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"کھاری گیٹ کھولو جلدی۔" اس نے بغیر دیکھے قدرے بلند آواز میں کہا۔

"لے لو جی!" کھاری نے آگے بڑھ کر گیٹ کا چھوٹا پٹ کھولا اور سعدیہ نے بھاگتے قدموں سے گیٹ کے باہر قدم رکھا۔

ایک باتصویر کہانی کے کسی منظر سے باہر دنیا وہی تھی' جسے وہ اس آہنی گیٹ کے اندر داخل ہونے سے پہلے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہی ٹکڑیوں میں بٹے کھیت' اکا دکا درخت' دھول اڑاتے کچے راستے' اونچی نیچی پگڈنڈیاں' آگ برساتا آنکھوں کو چندھیاتا سورج' وہ کسی عجائب خانے سے نکل کر واپس اپنی دنیا میں آئی تھی۔

یہاں سے اندر داخل ہونے کے بعد گھڑی کی سوئیاں شاید تھم گئی تھیں اور اس کے باہر نکلتے ہی رکا ہوا وقت جیسے دوبارہ چلنا شروع ہو گیا تھا۔ سعدیہ نے کچھ دیر وہیں کھڑے کھڑے اپنی دنیا میں دوبارہ واپس آجانے پر شکر ادا کیا اور پھر لحہ بھر کو مڑ کر دیکھا۔ کھاری گیٹ سے باہر کھڑا شاید اس کے گھر کی طرف جانے کا منتظر تھا۔

"جادوئی قالین پر بٹھا کر پرستان کی سیر کرانے والا رحم دل جن۔" سعدیہ کو بہت پہلے پڑھی بچوں کی ایک کتاب کا کردار یاد آیا اور اس نے اپنے گھر کی طرف جاتے راستے پر چلنا شروع کر دیا۔

"سائنس ہوتی ہی مشکل ہے' اسی لیے تو ہر کوئی نہیں پڑھتا' صبح کی گھر سے نکلی بچی شام پڑے گھر واپس آئی ہے۔ آج استانی نے امتحان میں آنے والے سارے سائنسی تجربے اکٹھے ہی کروائے ہیں۔۔۔۔ اور دیکھ لیں! سارے دن کی بھوکی پیاسی اتنا لمبا راستہ چل کے اکیلی گھر پہنچی ہے تو بھوک کے بخار چڑھ گیا ہے۔"

اس رات سعدیہ کے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے آپا رابعہ نے مولوی صاحب کو مطلع کیا۔

"ہوں!" مولوی صاحب تیزی سے ستائیس دانوں کی تسبیح کے موتی گراتے اپنے تئیں سعدیہ پر دم کرنے کی کوئی دعا پڑھ رہے تھے۔ بخار سے بے ہوش پڑی سعدیہ کے لیے فکر مند آپا رابعہ بے خبر تھیں کہ سعدیہ کا بخار سائنس کے تجربوں کا نتیجہ تھا یا آرٹ کے کرشموں کا۔

☆ ☆ ☆

"شکر ہے تم کو دیکھنا نصیب ہوا۔ تم تو لگتا ہے جیسے عید کا چاند ہو گئیں۔" خدیجہ نے باڑھ کے پار کھڑی ماہ نور کو دیکھ کر کہا' جو صبح صبح غالباً" کالج جانے کے لیے نکلنے والی تھی۔

"ارے خدیجہ خالہ! السلام علیکم۔" ماہ نور جو اپنے دھیان میں کھڑی موبائل فون پر کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مگن تھی' چونک کر بولی۔

"وعلیکم السلام۔ کب آئیں تم واپس؟" خدیجہ نے ربڑ کے پائپ سے پودوں کی کیاریوں میں پانی کی دھار باندھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے واپس آئے تو ڈیڑھ ہفتہ ہو گیا۔" ماہ نور شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ "آتے ہی کالج شروع ہو گیا اور حسب معمول دن رات کی کچھ خبر نہیں۔"

"یہ ہی تو۔۔۔" خدیجہ نے پائپ ایک بڑے درخت کے قدموں میں رکھتے ہوئے کہا۔ "میں فاطمہ سے کہہ رہی تھی' ماہ نور اپنی ایکٹویٹیز میں گم ہو کر فون تک کرنا بھول گئی۔"

"ارے نہیں خالہ!" ماہ نور مزید شرمندہ ہوئی۔ "آج سے ویک اینڈ شروع ہو جائے گا۔ میں آج شام کو آپ کی طرف آؤں گی۔ میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے بہت کچھ ہے۔ میں فون پر آپ کو ادھوری ادھوری سی باتیں سنا کر ان کا مزا خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب سارے قصے اکٹھے سناؤں گی بمعہ ایک سرپرائزنگ نیوز کے۔" وہ شرمندگی مٹانے کو تیزی سے بولی۔

"اوہ ڈیٹس گریٹ!" خدیجہ خوش ہوتے ہوئے ہنسیں۔ "آج تمہارے لیے پزا بیک کرتی ہوں اور چاکلیٹ فج پیسٹری بھی منگواتی ہوں کچھ اور کھانا ہو تو بتا دو۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ بہت ہے۔" ماہ نور نے ہاتھ ہلایا اور پھر کلائی پر باندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "او خدیجہ خالہ! آئی ایم سوری مجھے دیر ہو رہی ہے آج سلمان پہلے نکل گیا۔ مجھے لوکل ٹرانسپورٹ پکڑنی ہے۔"

"او ہو!" خدیجہ نے کہا۔ "چلو پھر نکلو بھئی جلدی کرو۔" ماہ نور ہاتھ ہلا کر تیزی سے گیٹ سے باہر چلی گئی۔ خدیجہ نے اسے جاتے دیکھا اور مسکرا دیں۔

"آج کا اسٹوڈنٹ ہر وقت جلدی میں رہتا ہے۔ روڈز پر' کالجز میں' یونیورسٹیوں میں جدھر دیکھو' جلدی جلدی بول رہا ہے' تیز تیز چل رہا ہے۔ سارے جہان کے تفکرات اپنے چہرے پر سجائے جیسے ہر وقت حالت جنگ میں ہو۔ وقت کے پیچھے بھاگتا' نا تکیں تھکاتا' نہ ڈھنگ سے کھاتا' نہ پوری نیند سوتا۔ یہ اسٹوڈنٹ بے چارہ زندگی کی کتنی لطافتوں سے محروم رہتا ہے۔" انہوں نے سوچا اور پھر ان کی نظروں کے سامنے اپنے دور طالب علمی کے منظر بکھر گئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ماضی کے تصور میں گم ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼
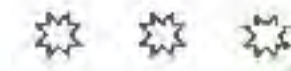
سعد کے سیل فون پر ایک نامعلوم نمبر سے کسی تصویری نمائش کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ اس نے دو' تین بار پیغام پڑھا لیکن اسے بالکل بھی یاد نہیں آیا کہ اس نمبر سے اسے پہلے کبھی ایسا پیغام وصول ہوا تھا یا نہیں۔

"دعوت نامے کا بے حد شکریہ! مجھے افسوس ہے کہ میں تصویری نمائش کے دنوں میں ملک سے باہر گیا ہوں گا۔ ویسے آپ کا اسم شریف دریافت کر سکتا ہوں؟" اس نے بلا ارادہ ہی اس پیغام کا جواب ٹائپ کیا اور بھیج دیا۔

اسی شام اسے اسی نمبر سے کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف کسی خاتون کی آواز تھی۔

"میں نے سوچا تمہیں پینٹنگز میں دلچسپی ہے اور میرے حلقہ احباب میں جو گنے چنے لوگ موجود ہیں' ان کا ذوق اتنا اچھا نہیں۔" کسی سلام دعا کے بغیر اس خاتون نے کہنا شروع کیا۔

"ہر بار میں واحد مصورہ ہوتی ہوں جس کے ذاتی مدعوئین کی فہرست میں کوئی نام نہیں ہوتا۔" اس سے پہلے کہ سعد کوئی سوال پوچھتا' وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"اس لیے اس بار میں نے سوچا' یہ ریت روایت توڑ ہی دی جائے۔" سعد نے تحمل سے خاتون کی بات مکمل ہونے تک انتظار کیا۔

"آپ کا اسم شریف؟" وہ یہ سوال پوچھنے تک اپنے ذہن میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دوسری طرف کون خاتون تھی۔

"تم بھول گئے؟ صرف ڈیڑھ ہفتہ قبل ہی تو تم سے ملاقات ہوئی تھی۔ تم ایک معصوم سی لڑکی کے ساتھ میرے گھر آئے تھے۔" دوسری طرف سے بے تکلفی کا ایک بار پھر مظاہرہ ہوا۔

"اوہ۔۔۔۔ مس ہیولیشم!" سعد کو یاد آیا لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود اسے ان خاتون کا اصل نام یاد نہ آ سکا۔

"یاد آیا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"جی بالکل یاد آ گیا۔" سعد نے احترام سے جواب دیا۔ "میں معذرت خواہ ہوں' آپ کے پیغام سے اندازہ نہ لگا سکا۔"

"ہوں!" دوسری جانب جیسے اس کی کہی بات پر غور کیا گیا۔ "تو پھر سچ بتاؤ۔ واقعی بیرون ملک جا رہے ہو یا صرف

بہانا کر رہے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے' میں واقعی یہاں نہیں ہوں گا۔" سعد نے کہا۔ "آپ نے مجھے یاد رکھا اور اس قابل سمجھا کہ آپ مجھے مدعو کریں۔ میرے لیے یہ بہت اہم بات ہے۔"

"اچھا تو پھر ایسا کرو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ "جانے سے قبل ویسے ہی کسی وقت ملنے آ جاؤ۔"

یہ بے تکلفی سعد کے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس نے گلاس سے پانی کا گھونٹ بھر کر اس گھونٹ کے ساتھ اس بے تکلفی کے مظاہرے کو حلق سے اتارا۔

"ضرور حاضر ہوتا۔" اگلے لمحے وہ بولا۔ "لیکن کل شام ہی میری فلائٹ ہے' میں واپس آ کر کوشش کروں گا کہ آپ کے پاس آؤں۔"

"کوشش ہی نہیں کرنی' آنا بھی ہے۔" دوسری طرف سے ایک بار پھر دماغ گھما دینے والی بے تکلفی کا مظاہرہ ہوا۔

"ویسے جا کہاں رہے ہو؟" اس سوال پر سعد نے جواب دینے سے پہلے لحظہ بھر کو سوچا۔ "اصل جگہ بتاؤں یا کوئی اور؟" اس نے خود سے پوچھا۔ نجانے کیوں اسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ وہ جس جگہ کا بھی نام لے گا' خاتون اس پر طویل گفتگو کرنا شروع ہو جائیں گی۔

"فرینکفرٹ۔" پھر اس نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا!" خلاف توقع دوسری جانب سے بھی مختصر جواب ہی آیا۔ "واپسی کب ہے؟"

"ڈیڑھ سے دو ہفتے تو یقینی لگیں گے' شاید اس سے زیادہ دن بھی رکنا پڑے۔"

"کس سلسلے میں جا رہے ہو؟" ایک اور سوال آیا۔

"یونہی!" اب کے وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "سیلانی آدمی ہوں' گھومنے پھرنے کا شوق پال رکھا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" مس ہیولیشم بولیں۔ "یہ شوق لگتا ہے موروثی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ آپ کو کیسے علم ہوا۔" سعد نے کہا۔

"اس روز تمہاری گفتگو سے اندازہ ہوا ہے۔ تم اپنے والدین اور باقی گھر والوں کے بارے میں جو بتا رہے تھے' اس سے لگا کہ سر پھروں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔"

"واہ۔۔۔ آپ تو بہت سمجھ دار نکلیں۔" سعد نے بے اختیار کہا۔ "ہم جو کبھی کسی کو پکڑائی نہیں دیتے۔ آپ نے ہمارے پر بھی گن لیے۔"

"آداب عرض ہے۔" دوسری جانب سے شگفتہ لہجے میں کہا گیا۔

"چلیں پھر طے ہے' واپس آ کر آپ سے ملاقات ضرور کروں گا۔" سعد نے جھٹ فیصلہ کیا۔

"میں انتظار کروں گی۔" مس ہیولیشم خوش ہوتی محسوس ہوئیں۔ "اگر تمہارا یہی نمبر رومنگ پر ہو تو بتانا اور اگر نہیں تو وہاں کے نمبر سے پیغام بھیجنا کہ خیریت سے پہنچ گئے ہو۔"

"جی ضرور۔" سعد نے کہا۔

"اوکے' ٹیک کیئر۔" دوسری طرف سے ان الفاظ کے بعد فون بند کر دیا گیا۔

"اوہ یار۔۔۔ کیا نام تھا بھلا ان خاتون کا؟" فون بند کرنے کے بعد سعد نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"فائزہ' فضا' فوزیہ' فارحہ۔۔۔" اس نے کچھ دیر ذہن پر زور ڈالا' مگر اسے یاد نہیں آیا۔

"چلو' جو بھی ہے میرے لیے تو یہ مس ہیولیشم ہی ٹھیک ہے۔" پھر اس نے سوچنے کا سلسلہ ختم کر دیا۔

"مگر سوال تو یہ ہے کہ ان کو میری یاد کیسے آ گئی اور یہ اتنی بے تکلف کیوں ہو رہی تھیں؟" اب وہ دوسری بات

سوچ رہا تھا۔
"اس روز تو اتنی مردم بیزار اور اکھڑ مزاج لگ رہی تھیں جیسے دنیا بھر کا بائیکاٹ کیے بیٹھی ہوں۔"
"خیر!" کچھ سمجھ نہ آنے پر اس نے شانے اچکائے۔ "وہ اس دنیا میں بہت سی عجیب و غریب باتیں ہوتی رہتی ہیں ایک یہ بھی سہی۔"
اگلے لمحے وہ اپنی وارڈ روب کے سامنے کھڑا سفر کے لیے سامان نکال رہا تھا۔ وارڈ روب کے نچلے خانے میں بڑے بڑے برانڈڈ اسٹورز کے بیگز رکھے تھے۔ اس نے سب بیگز کے درمیان دو انگلیاں ڈال کر انہیں تھوڑا تھوڑا کھول کر سرسری نظر ان کے اندر موجود چیزوں پر ڈالی۔
"اپنی تمام تر عاجزی' انسانی ہمدردی' ڈاؤن ٹو ارتھ شخصیت کے ساتھ ساتھ تم میں ایک خاص طرح کا ایٹی ٹیوڈ ہے۔ تم سیلف سینٹرڈ ہو۔ یا تو تمہارے اندر کسی قسم کا خوف ہے یا پھر تم خود کو ڈیپ ڈاؤن (دوسروں سے بلند) سمجھتے ہو۔"
کچھ دن پہلے سنی یہ بات اچانک اسے یاد آئی۔ یہ اس کا کٹیلا تجزیہ تھا۔ اس کی شخصیت پر کڑا تبصرہ تھا۔
"اچھا ہوا' جاتے جاتے تم نے میرے متعلق اپنی رائے کا اتنا برملا اظہار کر دیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ "نہ کرتیں تو شاید تمہیں ہمیشہ افسوس رہتا۔"
"فضل! میں نے سامان نکال کر بیڈ پر رکھ دیا ہے' آکر پیکنگ کر دو۔"
کچھ دیر بعد وہ انٹر کام پر کسی سے مخاطب تھا۔ وارڈ روب کے نچلے خانے میں رکھے شاپنگ بیگز ویسے ہی دھرے تھے۔ اس نے ان میں سے کچھ بھی اپنے استعمال کے لیے نہیں نکالا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فننش (فن لینڈ کی قومی زبان) دنیا کی مشکل ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔"
بھارت سے آئے چندر شیکھر نے میکڈونلڈز ریپ پیک کھولا اور مربھکوں کی طرح پیاز اور چکن کے ریشوں سے بنا اسنیک کھاتے ہوئے کہا۔ اس روز اس نے بہت کام کیا تھا اور وہ بری طرح تھکا ہوا تھا اور بھوک بھی ستا رہی تھی۔
"کتنی سیکھ لی تم نے؟" نادیہ نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر لگے ٹماٹو کیچپ کو زبان سے چاٹتے ہوئے پوچھا۔
"بہت کم۔" چندر شیکھر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تو تمہاری رفتار پر حیران ہوں۔ تم نے بہت جلد زبان سیکھ لی۔"
"میں نے ان انیس برسوں میں اتنے گھاٹوں کا پانی پیا ہے کہ کوئی نیا گھاٹ مجھے زیادہ دیر مشکل میں نہیں رکھ پاتا۔" نادیہ مسکرائی۔
"یار! تمہاری اردو بھی حیران کن ہے۔" چندر شیکھر نے بے اختیار داد دی۔ "شکر ہے کہ تم ادھر ہو۔ زبان کے بل کھل جاتے ہیں تم سے بات کر کے۔"
"مگر تمہاری سمجھ میں تو نہیں آتی ہو گی اردو۔" نادیہ نے کہا۔ "ہندی اور اردو دو مختلف زبانیں ہیں۔۔۔"
"ہاں لیکن' بھارت میں اب شدھ ہندی کہاں بولی جاتی ہے۔ تم نے کبھی ہندی فلمیں دیکھی ہیں؟" شیکھر نے کوک کا ٹن کھولتے ہوئے کہا۔
"شاید کبھی نہیں۔" نادیہ نے آنکھیں میچ کر یاد کرنے کے بعد کہا۔ "میرے ڈیڈی کے گھر میں ایک خانساماں تھا۔ وہ دیکھا کرتا تھا ہندی فلمیں اور کئی اداکاروں کے نام بھی لیتا تھا' جو مجھے بالکل یاد نہیں۔ اس نے کچن میں اپنے ساتھ جیوک باکس بھی رکھا ہوتا تھا۔ اس کے پاس بہت سے ہندی گانوں کا ذخیرہ موجود تھا۔"
"ہوں!" شیکھر مسکرایا۔ "یار! انسان بھی کیا ہوتے ہیں۔ رنگوں' نسلوں' قوموں' ملکوں' شہروں میں بٹے انسان' سرحد کے اس پار انسان کوئی اور ہے سرحد کے اس پار کوئی اور۔۔۔"
"ہاں!" نادیہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس تقسیم میں ہی تو انسان کی شناخت کا سامان ہے۔ یہ تقسیم نہ ہوتی تو پھر تو ساری دنیا کے تمام باشندے ایک ہوتے۔"
"اچھا ہوتا نا!" شیکھر نے اسنیک کا ریپر موڑ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔
"یہ سب کائنات کو تخلیق کرنے والے کے فیصلے ہیں۔ ہم اسے اچھا برا کیسے قرار دے سکتے ہیں بھئی۔" نادیہ نے لنچ کرنے کے بعد ہاتھ اپنی جینز پر رگڑتے ہوئے کہا اور اپنا بیگ شانے پر ڈال کر باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑی۔
"نادیہ! کیا تم مسلمان ہو؟" پیچھے سے شیکھر نے سوال کیا۔ اس کے چلتے قدم کچھ دیر کے لیے رکے' اس نے پیچھے مڑ کر شیکھر کو دیکھا۔ وہ کوک کا ٹن ختم کرنے کے بعد برانڈی کا ٹن کھول رہا تھا۔
"پتا نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"چلو اچھا ہے جو پتا نہیں۔" شیکھر نے دو انگلیاں اٹھا کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "انجوائے یور لائف۔"
"پتا تو واقعی نہیں ہے۔" نادیہ نے ریستوران سے باہر نکل کر سڑک پر چلتی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے سوچا مگر پتا لگانا ہے۔" اس نے اسٹینڈ پر کھڑی اپنی سائیکل نکالتے ہوئے خود سے کہا۔
"کیسے؟" اس کے دماغ نے سوال کیا۔
"پتا نہیں۔" دل نے جواب دیا اور وہ سائیکل پر سوار ہو کر اس کے پیڈل تیزی سے چلاتی اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اوہ!" فاطمہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فلزا کبھی اتنی اکھڑ اور بد مزاج بھی ہو جائے گی۔"
"ان کی بد مزاجی تو ان کے چہرے اور چہرے کے تاثرات پر بھی خاصا اثر انداز ہو رہی ہے۔" ماہ نور نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"توبہ استغفار!" اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "ان کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے زمانے بھر کی تلخیاں انہوں نے ہی سہی ہوں۔"
"میں کسی وقت تمہیں اپنے اسکول اور کالج کے دنوں کے البمز دکھاؤں گی۔" فاطمہ نے کہا۔ "فلزا کی کئی تصویریں ہیں اس میں۔ اچھی خاصی خوش شکل چٹی گوری ہوا کرتی تھی۔ خوش مزاج بھی تھی ہاں ذرا خاموش طبع تھی زیادہ باتیں نہیں کرتی تھیں۔"
"وہ تو جناب آپ دونوں کو بھول بھال چکی تھیں۔" ماہ نور نے فاطمہ کو جتایا۔
"میرے یاد دلانے پر انہیں یاد آیا اور جس لڑکے کے ساتھ میں ان کو ڈھونڈتی ان کے گھر پہنچی تھی نا!" اس نے پزا کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹ کر اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے فلزا ظہور کو مس ہیولیشم کا ٹائٹل دے دیا فوراً۔"
"ارے اتنی سڑیل ہو گئی وہ؟" خدیجہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھے کمرے میں داخل ہوئیں۔ "اور وہ لڑکا

بھی بڑا باذوق ہوگا جسے مس ہیولیشیم یاد آگئی فلزا کو دیکھ کر۔"

"اسے مس ہیولیشم کے علاوہ کسی Manor کے متعلق پڑھی کہانی بھی یاد آگئی تھی فلزا ظہور کو دیکھ کر، جہاں بچوں کو عجیب و غریب مشروب پینے کو ملتا تھا۔"

"stragoika Manor" خدیجہ یاد کر کے مسکرائیں۔ "بڑا اچھا مطالعہ ہوگا بھئی اس لڑکے کا۔ کون تھا وہ؟" انہوں نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"وہ۔" ماہ نور اس سوال پر لمحہ بھر کو رکی "ہاں وہ لڑکا سید پور میں ملا تھا ایگزیبیشن کے دوران۔ اس سے میں نے فلزا ظہور کا پوچھا تو کہنے لگا۔ میں پتا کر کے بتاؤں گا۔ شوہر و شوہر وہ کوئی نہیں ہیں گمنام ہی ہیں بے چاری مگر اس لڑکے نے جیسے تیسے ان کا پتا لگا ہی لیا۔"

"اف بے چاری!" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔

خدیجہ نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"شروع ہی سے ذرا تنہائی پسند تھی اور میں نے اکثر دیکھا ہے اوائل عمری کی تنہائی پسندی، اس ادھیڑ عمری میں ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتی ہے۔"

"ویسے مجھے تو دو عدد چارکول اسکیچز دیے انہوں نے تحفے میں۔" ماہ نور کو یاد آیا۔

"چلو، یہ تو اچھی بات ہے۔ کچھ تو مروت دکھائی اس نے۔" فاطمہ کو حقیقت میں فلزا کا احوال سن کر دلی دکھ ہو رہا تھا۔

"اور میں ایک ایسی لڑکی سے بھی ملی جو کئی سال سرکس میں گزارنے کے بعد ایک کرتب کے مظاہرے کے دوران گر جانے سے معذوری کا شکار ہو گئی!" ماہ نور نے کہا۔

"اوہ بے چاری!" خدیجہ نے کہا۔ "کون ہے وہ اور اب کیا کرتی ہے؟"

"اس کا نام سارہ خان ہے اور اب وہ کچھ نہیں کرتی۔ بس بستر پر پڑی رہتی ہے۔"

"سرکس والے اس کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔" خدیجہ کو حیرت ہوئی۔ "میں نے تو سنا تھا بڑے بے مروت ہوتے ہیں وہ لوگ۔"

"پتا نہیں وہ بے مروت ہوتے ہیں یا نہیں مگر اس لڑکی کا اتنا خیال کوئی اور رکھ رہا ہے۔" ماہ نور نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے خالہ! آپ کا کیا خیال ہے، انسانیت کے کتنے درجے ہیں۔ کسی میں یہ بالکل نہیں ہوتی، کسی میں تھوڑی سی ہوتی ہے، کسی میں کچھ زیادہ، کسی میں بہت زیادہ۔ کیا ایسا ہی ہوتا ہے؟" اس نے سر ہلا کر تائید چاہی۔

"یہ تو توفیق پر منحصر ہے۔" خدیجہ نے ماہ نور کی پلیٹ میں پیسٹری رکھتے ہوئے کہا۔

"لو اسے چکھو! ایک نئی بیکری آزمائی ہے آج، دیکھو کیسی ہے۔"

"اور اگر کوئی کسی معذور کی خدمت یہ سوچ کر کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام اس کے فرائض میں شامل کر دیا ہے تو کیا یہ بھی توفیق کی وجہ سے ہے۔" ماہ نور پیسٹری کو نظر انداز کیے اپنے سوال میں الجھی تھی۔

"یہ تو خیر بڑی ہی مختلف سوچ ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور کیا انسان اتنا مستقل مزاج ہو سکتا ہے کہ ایک کام کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلتے دیکھ کر بھی اس کو کرنے پر لگا رہے۔" اسے پروا ہی نہ ہو کہ اس کام میں کوئی بہتری پیدا ہوتی ہے یا نہیں۔" ماہ نور سوال کیے جا رہی تھی۔

"یہ بھی توفیق سے ریلیٹڈ ہے۔" فاطمہ ماہ نور کو بدستور غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔

"لو! میری ایک کولیگ کی کال آگئی، میں ذرا بات کر لوں اس سے۔" اسی دم خدیجہ نے سیل فون پر بجتی بیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔

"کیا بات ہے ماہ نور۔ کوئی الجھن ہے کیا؟" خدیجہ کے کمرے سے جانے کے بعد فاطمہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ماہ نور کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"جی فاطمہ خالہ! الجھن تو ہے۔" ماہ نور نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"مجھے بتاؤ۔ کیا الجھن ہے؟" انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

ماہ نور نے کچھ دیر فاطمہ کی طرف دیکھنے کے بعد یوں سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو۔ "ہاں، میں آپ پر اعتماد کر سکتی ہوں۔"

خدیجہ ایک طویل کال سننے کے بعد جب تک کمرے میں واپس آئیں، ماہ نور اپنے دل کی ساری کیفیات اور دماغ کی کئی الجھنیں فاطمہ کے گوش گزار کر چکی تھی۔ خدیجہ کے آنے کے بعد وہ دونوں خدیجہ کی دوست کی سنائی خبریں سننے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ماہ نور!" اس رات جب چار گھنٹے خدیجہ اور فاطمہ کے ساتھ گزارنے کے بعد ماہ نور اپنے گھر جانے کے لیے باہر نکلی تو فاطمہ اس کے پیچھے گیٹ تک آئیں۔

"جی!" اس نے رک کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"کبھی اس لڑکے سعد سے ہمیں بھی ملوانا۔" فاطمہ نے کہا۔

ماہ نور نے گیٹ پر لگی لائٹس کی روشنی میں فاطمہ کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر خلوص تھا اور اس کے لیے محبت بھی۔

"ضرور فاطمہ خالہ!" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "اگر کبھی وہ دوبارہ ملا تو۔"

"کیوں بھئی۔ اب تو تم دونوں کے درمیان اچھی خاصی بے تکلفی ہو چکی ہے نا!" فاطمہ حیران ہوتے ہوئے بولیں۔

"پتا نہیں۔" ماہ نور کے چہرے پر دکھ کا ایک سایہ سا لہرایا۔ "اس کا جو نمبر میرے پاس ہے، وہ تو بند ملتا ہے اور اسے بھیجے ہوئے پیغامات ڈیلیور نہیں ہوتے۔"

"اوہ!" فاطمہ کو لگا ماہ نور کے دماغ کی اصل الجھن اب ان کے سامنے آئی تھی۔

"کوئی اور اتا پتا اس کا؟" انہوں نے یونہی سوال کیا۔

"نہیں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "اور ویسے بھی شاید وہ مجھ سے رابطہ رکھنے میں اتنا انٹرسٹڈ نہیں تھا، جب ہی تو ایک عارضی نمبر مجھے دیا۔"

فاطمہ، ماہ نور کے چہرے پر دکھ اور دل شکنی کے واضح تاثرات دیکھ رہی تھیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے تسلی دیں۔

"چلو دیکھتے ہیں، دنیا گول ہے۔ کبھی کہیں دوبارہ ملاقات ہو بھی سکتی ہے۔" بے تاثر سے تسلی بھرے الفاظ ان کے منہ سے نکلے۔

جواب میں ماہ نور یوں مسکرائی جیسے کسی بچے کی بات پر مسکرایا جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

رات کی تاریکی میں فضا پر سکوت کا عالم طاری تھا۔ کبھی کبھار کہیں سے جھینگر کے بولنے کی آواز ابھرتی یا پھر

کہیں دور سے گیدڑوں کی آوازیں آتیں اور پھر ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ سعدیہ پچھلے کئی گھنٹوں سے سونے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی مگر نیند اس کی آنکھوں کا راستہ جیسے بھول گئی تھی۔ اس کے اور نیند کے راستے میں وہ منظر حائل ہو گئے تھے جو کھاری کی دعوت پر فارم ہاؤس کی سیر کے دوران نظر آئے تھے۔

ایک محدود دنیا کی باسی کم عمر لڑکی کے لیے وہ مناظر بہت بڑے تھے۔ سعدیہ کے گھر میں ٹی وی کبھی نہیں آیا تھا۔ ریڈیو کی کبھی شکل بھی اس نے اپنے گھر میں نہیں دیکھی تھی۔ ہاں اسکول میں لڑکیوں کو ٹی وی اور فلموں کی باتیں کرتے ضرور سنا تھا۔

"توبہ توبہ! ابا جی کہتے ہیں ایسی باتیں سننے اور دیکھنے والا بہت بڑا گناہ گار ہوتا ہے۔"

وہ اپنی سہیلیوں کو بھی ڈراتی اور خود بھی ڈر ڈر جاتی۔ اسی لیے اس کو بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا' چیزوں سے آگاہی نہیں تھی۔ فارم ہاؤس کے بارے میں اس کا تصور بہت مختلف تھا۔ اس کے خیال میں وہاں پراسرار دنیا بستی تھی۔ ڈاکوؤں کے گروہ اور لٹیروں کے سردار وہاں ٹھہرتے تھے' جن کے اعزاز میں آئے روز کھاری کے مطابق دعوتیں ہوتی تھیں۔ اس کا خیال تھا فارم ہاؤس میں جابجا گڑے بڑے بڑے چولہوں پر دیگیں چڑھی رہتی ہوں گی اور سارے ڈاکو' چور' لٹیرے ادھر ادھر بستر ڈالے دن میں پڑے سوتے ہوں گے اور رات کو اپنے دھندے پر رخصت ہو جایا کرتے ہوں گے۔ فارم ہاؤس کے خیال سے اس کے ذہن میں اسلحہ اور گولیوں سے بھرے ٹرک بھی آتے تھے' جنہیں لوڈ کرنے کی باتیں کھاری کیا کرتا تھا۔

اس تصوراتی دنیا کو فارم ہاؤس کے حقیقی مناظر نے خاک میں ملا دیا۔ فارم میں اتنی اور ایسی چیزیں تھیں جن کے نام بھی سعدیہ کو نہیں آتے تھے۔ وہ ان چیزوں کو کن ناموں سے یاد کرے' اسے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر اس کے تصور میں ان چیزوں کی شکلیں بار بار ابھرتی تھیں۔

اسے وہ کمرے یاد آتے' جہاں بقول کھاری مہمان ٹھہرتے اور سوتے تھے۔ بڑے بڑے بیڈ جن میں رکھے تھے' اور جن بیڈز پر نرم گداز بستر بچھے تھے۔ ان بیڈز پر لیٹنے' بیٹھنے اور سونے کا تصور کتنا خوش کن تھا اور وہ پردے اور صوفے' وہ فرش اور وہ چھتیں' وہ لائٹیں اور پنکھے جو باہر کے ملک سے آئے تھے اور وہ پھل' پھول پودے اور گھاس۔

سعدیہ کروٹیں بدل رہی تھی اور ہر بار کروٹ بدلنے پر اس کے ذہن کے آئینے پر ایک نیا عکس ابھرتا تھا۔

"آخر انسان ایسا کیا کرے' جو اتنا سب کچھ اس کے پاس آ جائے۔" اس نے کئی بار سوچا تھا۔

"ہمارے پاس تو تین سے زیادہ بستر نہیں ہیں۔ سردی ہو تو صرف دو رضائیاں' اماں اور مجھے اکٹھے سونا پڑتا ہے۔ گرمی ہو تو تین کھیس جن میں سے دو بالکل ہی گھس چکے ہیں' گزارے لائق برتن' ایک چولہا جس پر باری باری چیزیں پکائی جاتی ہیں۔ کبھی جو ابا جی کو جوشاندہ بنوانا پڑ جائے تو ہانڈی اتار کر جوشاندے کی پتیلی رکھنی پڑتی ہے' اتنے میں ہانڈی پکنے میں دیر ہو جاتی ہے' ہانڈی پکا کر توا رکھو پھر انتظار کرتے رہو کب روٹیاں بنیں اور ہم کھائیں۔"

سعدیہ ان چیزوں پر کڑھ رہی تھی' جن کے ہونے نہ ہونے سے پہلے کبھی اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

"انسان کے پاس برتنے کو اتنی وافر چیزیں ہوں تو ہی تو وہ ان میں انتخاب کرنے کے قابل ہوتا ہے نا۔ جب ہوں ہی نا تو پھر انتخاب کس میں سے کرے۔" اس کے دل میں ایک انجانی سی ٹیس اٹھی۔

"جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو اتنا سامان ضرور بناؤں گی کہ جب دل چاہے ایک جیسی دو چیزوں میں سے ایک یا دوسرے کا انتخاب کر سکوں۔" اس نے بار بار خود کو ان الفاظ سے تسلی دی۔

"اور ابا جی اور اماں کو دیکھو بھلا' اتنے بڑے ہو گئے ہیں' آج تک انہیں خیال نہیں آیا کہ بندے کے پاس زیادہ چیزیں ہونی چاہئیں۔" اس نے کڑھ کر سوچا۔

اماں تو جو تھوڑا سا ہے' اس میں سے بھی بس چلے تو کچھ اٹھا کر کسی ایسے کو دے دیں جو ان سے مانگ لے اور ابا جی۔ انہیں تو بس کھانے کو دو وقت روٹی مل جائے' پہننے کو دھلے کپڑے مل جائیں' بس ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے ایک بار پھر کروٹ بدل کر سوچا۔

"دونوں ایک بار فارم ہاؤس کا چکر لگا لیں تو انہیں پتا چل جائے کہ کیسی مسکین زندگی گزار رہے ہیں ہم۔"

"مگر انہیں اب کیا سمجھ آئی ہے۔" اس نے سوچا "آخر دنیا میں کچھ تو دیکھا ہی ہو گا نا۔ پہلے خیال نہیں آیا اب کیا آئے گا۔" وہ اپنے ماں باپ کے انداز فکر سے بالکل ہی مایوس تھی۔

"کسی کے گھر میں دو سے زیادہ تولیے نہیں ہوتے اور ادھر دیکھو' لمبے لمبے تولیوں جیسے لبادے لٹک رہے تھے الماریوں میں۔ کھاری کہہ رہا تھا یہ نہانے کے بعد کپڑے پہننے سے پہلے پہنتے ہیں تاکہ جسم خشک ہو جائے اچھی طرح۔"

اگلی کروٹ پر ایک اور بات یاد آئی اور غسل خانوں کے آگے الگ چپلیں جو غسل خانوں سے باہر نہیں پہننی ہوتیں۔ بس ادھر ہی اتار دو تاکہ کمرے کا فرش گیلا نہ ہو۔"

اس سے اگلی کروٹ پر ایک اور۔۔۔ اسی طرح کروٹیں بدلتے منظر یاد کرتے رات گزر گئی۔

"بس ایک دفعہ میں ڈاکٹر بن جاؤں۔" طویل رات کے بعد فجر کی آواز سننے سے پہلے سعدیہ نے آخری بات سوچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اب ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ نہیں آنا سبق لینے۔" کھاری نے آپا رابعہ کو مطلع کیا۔

"کیوں بھئی! اب تو تمہاری قرات روانی پکڑنے لگی ہے۔" آپا رابعہ نے حیرت سے کہا۔

"میں چوہدرانی ہوراں کے ساتھ لاہور جا رہا ہوں۔" کھاری کے چہرے پر خوشی کا تاثر تھا "ماہ نور بی بی کے گھر جانا ہے ہم نے۔"

لیکن اتنے وقفے کے بعد تم پھر اٹکنے لگو گے۔" آپا رابعہ کو کھاری کی خوشی نظر نہیں آئی۔ انہیں اس کے تسلسل ٹوٹنے کا افسوس ہو رہا تھا۔

"میں ادھر لے جاؤں گا اپنا سیپارہ ساتھ۔ نماز کے بعد سبق پکا کر لیا کروں گا۔" کھاری نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر چوہدرانی تمہیں کیوں ساتھ لے جا رہی ہے؟"

"او بھین جی' چوہدرانی ہوراں کو پتا ہے شہر کی چیزوں اور باتوں کی انہیں پہچان کوئی نہیں اور جوان کے ساتھ رضیہ جا رہی ہے نا۔ اسے تو سواد کا بولنا بھی نہیں آتا۔ انہیں بڑا پتا ہے کہ کھاری ہشیار بندہ ہے' ہر دوسرے دن ٹرکاں نال شہر جاتا ہے۔ کھاری چپ کر کے انہیں ساری بات سمجھا دے گا اور ان کا مخول نہیں بننے دے گا۔ ایس لئی انہوں نے چوہدری صاب سے کہہ کر میرے لیے چھٹی لی ہے۔" کھاری نے انتہائی سمجھ دار بنتے ہوئے آپا رابعہ کو چوہدرانی کا موقف سمجھایا۔

"تمہاری چوہدرانی کے بھی کیا کہنے ہیں۔" آپا رابعہ نے کھاری کی بات سن کر سر ہلایا "اس کے لیے لگتا ہے چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے بڑے مسئلوں سے زیادہ اہم ہیں۔"

"آہو جی!" کھاری نے دانت نکوستے ہوئے کہا "بڑے بڑے مسئلے اوناں کو پیش آئیں تو ان کے بارے میں سوچیں نا! پر دل کی بھی بڑی صاف ہے چوہدرانی۔ ایمان سے بھین جی! بڑا پاک پیارا دل ہے ان کا۔"

"ہوں!" آپا رابعہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"کھاری!" پھر انہوں نے کھاری کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں کہا۔ "سعدیہ کا ب فارم چوہدری صاحب نے تمہیں دیا تھا یا چوہدرانی کو؟"
کھاری کے دانت ایک لمحے کے لیے بند ہوگئے۔ دوسرے لمحے وہ مسکراتا ہوا سنبھل کر بولا۔
"دیا تو مجھے ہی تھا۔ میں نے چوہدرانی جی کو دے دیا تھا کہ آپ تک پہنچا دیں۔"
"اور تمہیں پتا ہے کہ تمہاری چوہدرانی نے فارم ب بنوانے کے بدلے مجھ سے کیا فرمائش کی ہے؟" آپا رابعہ نے کھاری کو جتایا۔
"آہو جی!" کھاری ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ "مجھے شاہدہ نے بتایا تھا کہ انہوں نے آپ سے درس دینے کی فرمائش کیتی ہے۔" کھاری کا سر قدرے جھک گیا۔ پھر وہ سر اٹھا کر بولا۔
"پر تسی دل برا نہ کرو۔ میں آپ تہاڈے ساتھ جاؤں گا جب محفل ہوگی چوہدرانی جی کے گھر۔"
کھاری کے پاس آپا رابعہ کو تسلی دینے کے لیے ایک یہ ہی جملہ تھا لیکن اب وہ آپا رابعہ کے چہرے پر دکھ کا واضح تاثر دیکھ رہا تھا۔
"بھین جی!" کھاری نے ایک دفعہ پھر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "میں اتنا بھی بھلا (بے وقوف) نئیں جنا نظر آتا ہوں۔ یہ جو لوگ ہیں نا!" اس نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "سمجھتے ہیں کھاری کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی پر میں کسی نوں دسدا نہیں کہ کتنے سال ہوگئے دنیا داری کر دیاں، ہن بھی کھاری کو کوئی بات سمجھ نہ آئے تو درفٹے منہ کھاری دا!" آپا رابعہ نے چونک کر کھاری کی طرف دیکھا۔
"آہو!" کھاری نے سر ہلا کر انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "میں سب کے جھوٹ، چوریاں، چکاریاں، بد نیتیاں جانتا ہوں پر ادھر۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "بڑی جگہ ہے جی! بڑا وڈا ہے یہ۔ ہر بات اندر ہی اندر ڈال لیتا ہے۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "کسی سے کہتا نہیں۔" آپا رابعہ بے یقینی سے کھاری کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
"ایک بات سمجھ لو بھین جی!" پھر اس نے کسی بزرگ کی طرح آپا رابعہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "درانتی کے ایک طرف کنڈے ہوتے ہیں، یہ جھوٹی دنیا ہے ناں اس دے دونوں طرف کنڈے نیں۔" اس نے دو انگلیاں اٹھا کر اشارہ کیا۔
"یہ ادھر سے بھی کاٹتی ہے ادھر سے بھی کاٹتی ہے۔"
آپا رابعہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے کھاری کے اس نئے روپ کو ششدر بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔
"بس ایک چپ۔" کھاری نے ایک بار پھر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ "لکھاں دکھاں توں بچاتی ہے۔"
"تمہیں اتنا کچھ پتا ہے کھاری! تو یوں احمق کیوں بنے پھرتے ہو۔" بے اختیار آپا رابعہ کے منہ سے سوال نکلا۔
"سو کھار رہتا ہے بندہ بھلا بنا رہے تے۔" وہ ہنسا۔ "اگلا بندہ سمجھتا ہے اسے کون سی سمجھ آتی ہے۔"
پھر اس نے سر اٹھا کر آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔ "اور ویسے بھی سمجھ کر کرنا بھی کیا ہے۔ اتنے وڈے وڈے لوگ جن کی عقلیں بھی وڈی ہوتی ہیں۔ قبرے اونہوں نے بھی پڑ جانا قبرے ہم بھلوں نے بھی پڑ جانا۔" وہ بے نیازی سے بولا۔
"تم چوہدری صاحب کے پاس کب آئے تھے کھاری؟" اس روز پہلی بار آپا رابعہ کو کھاری سے یہ سوال کرنا یاد آیا۔
"میں کاکا ہی تھا جب، ماسی جنت بتاتی ہے چوہدری صاحب مجھے لے کر آئے تھے۔ ماسی جنت کہتی ہے میں بڑا ماڑا (کمزور) تھا۔ میریاں ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں۔ سارا دن روتا تھا پھر ماسی جنت نے اور ایک اور ہوندی تھی ماسی فاطمہ اللہ بخشے انہاں نے مجھے پال ہی لیا۔"
"کبھی چوہدری صاحب سے اپنا آگا پیچھا پوچھا تم نے؟"
"توبہ کرو جی!" کھاری نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "ماسی جنت کہتی ہے کھاری اتنا بڑا نہیں کہ چوہدری صاب نے تجھ بھورا (چھوٹے) سارے لڑکے کو پال کر اتنا وڈا کیا۔ اب ان کو پوچھے گا کہ میرا آگا پیچھا کیا ہے تو ان کا دل ٹٹ (ٹوٹ) جائے گا۔"
"لیکن پھر بھی۔" آپا رابعہ کو نجانے کیوں ماسی جنّت کی یہ منطق نہیں بھائی۔
"کبھی موڈ میں ہوں ناں چوہدری صاب!" کھاری مسکرایا۔ "تو کہتے ہیں جے کھاری! مجھے تیرے ماں پیو کا پتا ہوندا تاں تو تجھے ان کے سامنے کھڑا کر کے کہتا لو بھائی لو تمہارا بچہ میں نے پال دیا۔ اب اس کی کمائیاں کھاؤ۔"
اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی۔ اس نے مسکرا کر سر جھٹکا۔
"تمہارا دل نہیں چاہتا ماں باپ سے ملنے انہیں دیکھنے کو؟" آپا رابعہ کو معلوم تھا، وہ یہ سوال کر کے کھاری کا دل دکھا رہی ہیں مگر پھر بھی وہ یہ سوال کر رہی تھیں۔
"او جان دیو بھین جی!" کھاری نے سر ہلایا۔ "پتا چلنا ہی نہیں تو دل نے کیا کر لینا ہے۔"
"ویسے بھی چوہدری صاحب نے کبھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اب تو مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا۔"
آپا رابعہ غور سے کھاری کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔
"اور اب تو مجھے آپ مل گئے ہو، ماں ونگر (ماں جیسی) چوہدری صاحب پیو بجا (باپ کی طرح) میرا تے قبلہ کعبہ دونوں ہی موجود ہوگئے۔" وہ آپا رابعہ کے یوں دیکھنے پر جھینپ کے بولا۔
"پر مولوی صاحب بڑے سخت دل ہیں۔ انہیں ہاتیں ماتیں (آسانی سے) کسی پر پیار نہیں آتا۔" اب وہ اپنے مخصوص انداز میں بول رہا تھا۔
"اک دن مولوی صاحب اتنے کنفیوز (کنفیوز) ہوگئے جد ول چوہدری صاب نے ان سے سعدیہ کی پیدائش کے ضلع کے بارے میں پوچھا۔" وہ بلند آواز میں ہنسا۔
"وچارے بھل ہی گئے کہ کون سا ضلع تھا۔"
آپا رابعہ یہ بات سن کر بری طرح گھبرائی تھیں یا کھاری کو ایسا لگا تھا۔ یہ بات کھاری کو اس وقت سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
"اچھا اب تو لکڑیوں کو دھوپ لگ گئی اچھی، تم کلہاڑی پکڑو اور چھوٹے ٹکڑوں میں توڑ دو مجھے یہ لکڑیاں۔" انہوں نے فوراً بات بدلتے ہوئے کہا تھا۔
"ابھی لیں۔" کھاری نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہی کام تو کرنے آیا تھا میں۔"

☼ ☼ ☼

"اصل ڈیمانڈ تو اس سُر کی ہے جو تیرے میرے گلے میں ہے۔ یہ سرخی، یہ غازہ، یہ کاجل، یہ ہار یہ سنگھار تو اپنے دل کی تسلیاں ہیں۔ انسان کے پاس ہنر نہ ہو تو سجاوٹیں کتنی دیر چلتی ہیں۔"
"وہ دیکھا تھا شاہد رے کی فیکٹری والا۔ لگتا تھا منہ سے نہیں آنکھوں سے کھا لے گا۔"
"اس بیچارے کو سُر اور سُریلی کا پتا وتا کوئی نہیں نا۔ اس کے پاس پیسہ ہے بس اور اسے کسی نے بتا دیا ہے کہ پیسے والا، پیسے والا نہیں سمجھا جاتا جب تک ایسی محفلوں میں شریک نہ ہو۔"

"تو یہ کون سی ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جانے والی بات ہے۔ سچ ہے اب اسے اس کام پر لگا دیا گیا ہے۔ اس کا بال بچہ الگ پریشان ہوں گے' پیسہ الگ لٹے گا' وقت خوب برباد ہو گا' پھر اس کے ذخیرہ کیے پیسوں کے ڈھیر کم ہوتے جائیں گے۔ اس کے بجن دوست خوش ہوں گے۔ بغلیں بجاتے پھریں گے کہ دیکھو کیسا مال دار بنا پھرتا تھا' اس کا کاروبار سب سے تیز تھا' اب قرضے لینے کے لیے ساہوکاروں کے پاس چکر لگاتے نہیں تھکتا۔"

"چچ چچ۔۔۔ بڑا افسوس ہو رہا ہے شاہدرے کی فیکٹری والے کے مستقبل کا حال سن کر۔"

"لیکن شٹرنگ والا سیٹھ بڑا سمجھ دار ہے۔ وہ پیسہ سنبھال کر رکھنے اور داد دینے کے الگ ہی فن میں کمال کا استاد ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے اور وہ جو ہے اسلام آباد والا خر دماغ۔ ایک بات میری مان لے! وہ تیرے سُر کے پیچھے نہیں حسن کے پیچھے رات کی فلائٹ پکڑتا ہے اور صبح سویرے واپس لوٹ کر اپنے دفتر میں جا بیٹھتا ہے۔"

"وہ ابھی مال بنانے کی دوڑ میں نیا نیا شریک ہوا ہے' اس کے پاس تو وقت بھی کم ہوتا ہے۔"

"بس تو پھر میری بات پکی بچی ہے۔ وہ سُر کے پیچھے نہیں آتا' وہ حسن کا دلدادہ ہے۔"

"چلو مان لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کتنی دیر اس کی باقاعدہ آمد جاری رہتی ہے۔"

"ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آنے والوں کی آمد اتنی غیر معمولی اس لیے بھی ہے کہ تمہارے ہاں روایتی گائیکاؤں والا ماحول نہیں۔ تم پر ریڈیو کی تربیت کا اثر ہے' خاندان کی تام جھام کا بھی اثر ہے۔ تم باقیوں سے بہت مختلف ہو۔"

"چلو ہٹو! تمہاری عادتیں نہ بدلیں' میراثیوں کی سی خوشامد اور چاپلوسیاں۔"

"ہی ہی ہی۔۔۔ ہماری تو کمائی کا راز ہی ان چاپلوسیوں اور میٹھی چاپلی میں چھپا ہوا ہے۔ ہم یوں ہی تو دربار سے سرکار تک نہیں پہنچ جاتے۔"

"دربار کو بھی تم جیسوں کی ضرورت ہوتی ہے اور سرکار کو بھی۔ تم لوگوں کے بنا نہ ان کا دن نکلتا ہے نہ ان کا۔۔۔"

"بس تو پھر ہمیں اپنی عادتیں پوری کرنے دیا کرو' کیونکہ ان کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔"

"ایک شرط پر۔۔۔"

"ہاں بولو۔۔۔"

"میرے خاندان کی تام جھام کا ذکر نہ کیا کرو۔ جو خاندان ایک خواہش کی تکمیل کرنے پر دانہ پانی بند کر دے اس کی کیا بڑائی اور کیسی شان۔ بڑے خاندانوں کے تو دل بھی بڑے ہوتے ہیں۔"

"تم اعلا حسب نسب کی اہمیت سے اس لیے واقف نہیں کہ تمہیں یہ بن مانگے مل گیا تھا' ہم سے پوچھو ہوش سنبھالتے ہی لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے' صاحب سرکار کی پکار ڈالنے لگتے ہیں' اونچے محلوں میں جا جا کر تالیاں پیٹتے اور لڈیاں ڈالتے ہیں اور سر اٹھا اٹھا کر ان محلوں کی بلندیاں اور شان و شوکت دیکھتے رہتے ہیں۔"

"خوش قسمت ہو تم لوگ کہ لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہو' جب ہی تو دوسروں کو اہم اور خاص سمجھتے ہو۔ خود کو کم تر جانتے ہو' اسی لیے تو برتر کے آگے سر جھکانے میں عیب نہیں سمجھتے۔ یہ جو برتری کا احساس ہے' یہ تو جناب جی اپنے کاٹے کا پانی بھی نہیں مانگنے دیتا۔ دانتوں تلے انگلی دبائے مجھے کیا دیکھے چلی جا رہی ہو۔ یہ جو میں کہہ رہی ہوں' اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ رہی ہوں۔"

"تم لوگوں کو کھانے کو تازی روٹی اور سونے کو نرم گدیلا نہ بھی ملے تو جو میسر ہوتا ہے وہ کھا بھی لیتے ہو اور جہاں پڑتے ہو سو بھی رہتے ہو۔ کبھی تم نے مٹر والی شہزادی کی کہانی سنی ہے۔"

"مٹر والی شہزادی؟"

"ہاں وہ شہزادی جس کی میزبان نے اسے سونے کو اچھا بستر دیا مگر اسے پوری رات نیند نہیں آئی۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ اسے بستر میں کچھ چبھتا محسوس ہوتا تھا۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو بستر کی کئی تہوں کے نیچے پلنگ پر ایک مٹر کا دانہ پڑا تھا اور وہی اسے چبھتا محسوس ہو رہا تھا۔"

"مٹر کا محض ایک دانہ؟"

آنکھیں اتنی مت پھاڑو کہ سینی پڑ جائیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کی داستان ہے جو عیش و آرام کے عادی ہوتے ہیں اور انہیں نسبتاً "کم آرام" وہ زندگی میں داخل کر دیا جائے تو انہیں ذرا سی بے آرامی بھی چبھتی ہے مٹر کے دانے کی طرح۔"

"ہوں۔۔۔ جیسے تمہیں۔۔۔ تم بھی تو مٹر والی شہزادی ہو۔"

"ہنس لو' ہنس لو۔ کوئی بات نہیں۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ میں نہیں ہنس رہی۔ لو میں خاموش ہو رہی ہوں چپ بالکل چپ۔"

"اچھا ایسا کرو اب آہستہ آہستہ اپنا حلیہ بدلنا شروع کرو۔ ناک کی نتھنی اتارو۔ چھینٹ کے پرنٹ جیسا لباس پہننا چھوڑ دو' انگلیوں کے چھلے بھی اتار دو اب۔"

ان چھلوں کی مدد ہی سے تو گڑوی بجاتی ہوں اتنی اچھی۔ یہ نہ ہوں تو گڑوی کیا خاک بجے گی۔"

"اچھا چلو چھلے رہنے دو' آواز تمہاری اچھی ہے مگر اپنے لہجے کے گاؤدی پن اور گیت کے دوران "جیوندے رہو" کا نعرہ لگانا بھی چھوڑ دو بس۔"

"ہاں وہ تو میں کر رہی ہوں۔ تم سے یہ ہی سیکھنے کو تو تمہارے پاس پڑ رہی ہوں۔ تمہاری جوتیاں سیدھی کرتی اور تمہارا دم بھرتی ہوں۔ کوئی مجھے بھی فنکار سمجھ لے کبھی۔"

"خیر تمہارا میرے پاس آنا تو میرے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ تم آگئی ہو تو خیال آتا ہے میں اکیلی نہیں' ورنہ اس چھوٹے سے مکان کا صحن جب رات کو محفل کے شیدائیوں سے بھر جاتا تھا۔ اس وقت بھی دل اس غم سے لرزتا تھا کہ میں اکیلی ہوں۔ اب مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی۔"

"نہیں یہ تو کبھی سوچنا بھی نہ۔ اب تو دم دم کا ساتھ ہے' عمر بھر نبھاؤں گی۔"

"دیکھ لو' سوچ لو۔"

"سوچ لیا اور دیکھ بھی لیا۔" ہی ہی ہی۔

☼ ☼ ☼

"میں ملک سے باہر ہوں اور مجھے یہ فکر ہے کہ کہیں میری عدم موجودگی میں تمہیں میری ضرورت نہ پڑ جائے۔ تم گنتی گنواور میں آنہ پاؤں سو میرا یہ نمبر بھی محفوظ کر لو۔ خدانخواستہ کبھی کوئی پریشانی اور مسئلہ ہو تو مجھے فوراً "بتاؤ" میں یہاں بیٹھے بیٹھے بھی تمہارا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

سارہ نے اپنے سیل فون پر آیا یہ پیغام کوئی بیس مرتبہ پڑھا تھا۔

"تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تم کہیں دور جا رہے ہو؟"

اس رات سونے سے پہلے اس نے بیس مرتبہ پڑھے پیغام کے جواب میں سوال لکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جس ملک میں وہ گیا تھا' اس کے دن اور رات میں اس کے اپنے دن اور رات سے کتنا فرق تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی

تھی کہ اس کے فون سے بھیجا ہوا یہ پیغام خاصا مہنگا پڑے گا۔ اس کے کریڈٹ میں موجود کتنے ہی پیسے کم ہو جائیں گے۔ اسے معلوم تھا تو صرف یہ کہ اس پیغام کے جواب کے انتظار کے لیے اسے گنتی گننا تھی۔ ایک' دو' تین۔۔۔ اس نے تقریباً" پون گھنٹے تک تین سے آگے گنتی نہیں گنی۔ گنتی گنتے اور جواب کا انتظار کرتے جب اس کی آنکھیں تھک کر بند ہونے لگیں۔ سیل فون کی اسکرین کی روشنی نے اسے چونکا دیا۔

"میں بہت لاپروا اور غیر ذمہ دار ہوں۔ مجھے تمہیں اطلاع کر کے آنا چاہیے تھا' مگر میں نے بتایا نا کہ میں خاصا غیر ذمہ دار ہوں۔ یہاں آنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ تم منتظر ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ اچانک تمہیں میری ضرورت پڑے اور تم گنتی گنو اور مایوسی کا شکار ہو جاؤ۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں ہر وقت کسی بھی جگہ تمہارے لیے حاضر ہوں۔"

سارہ نے اپنے پیغام کا جواب پڑھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی گنتی نے اسے مایوس نہیں کیا تھا۔ سارہ خان کی وہ رات بہت اچھی گزری تھی۔ اسے گہری اور پر سکون نیند آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

کئی دن کی مسلسل کوشش کے بعد جب کہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ نمبر جو اس کے سیل فون کے اہم ترین دوستوں کی فہرست میں محفوظ تھا' سے کبھی جواب آئے گا۔ نہ اس کا بھیجا پیغام یہ نمبر وصول کرے گا۔۔۔ ماہ نور نے اس رات ایک بار پھر اس نمبر پر کال کرنے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں اسے کئی بار کی طرح آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے جیسے الفاظ ایک بار پھر سننے کو ملے تھے۔

"سوچ لو ہو سکتا ہے میں کوئی کرمنل نکل آؤں۔" اسے اچانک یہ الفاظ یاد آئے۔

"پتا نہیں" اتفاقات کے بارے میں پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

"میں تمہیں اس سونگ کا لنک بھیج دوں گا۔"

"گڈ بائے ماہ نور!"

"گڈ بائے' گڈ بائے' گڈ بائے۔" یہ دو الفاظ باز گشت کی طرح اس کے ارد گرد بکھرنے لگے۔

"میں نے تم پر اتنا اعتبار کیا کہ تمہارے علاوہ تم سے تمہارے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کیا۔

میں نے تم سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم اور تمہارے ڈیڈی کیا کام کرتے ہو اور کہاں رہتے ہو۔

میں نے تم سے یہ سوال بھی نہیں کیا کہ اگر تمہاری بہن تمہارے باپ کی شناخت کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے تو وہ نادیہ بلال کیوں ہے اور تم سعد سلطان کیوں ہو۔

میں نے تمہارے ہر روپ میں تمہیں پہچان لیا مگر میں تمہارے اصلی روپ کو نہیں پہچان پائی۔ تم اصل میں کیا ہو' میں ایک بار بھی اندازہ نہیں لگا پائی۔ تم نے میرے سامنے دوستی کا ہاتھ کیوں بڑھایا' مجھے سمجھ میں نہیں آیا اور میں غیر محسوس طریقے سے تم سے اتنی مانوس ہو گئی کہ مجھے لگا کہ تم تو ہر جگہ ہر وقت میری دسترس میں ہو۔"

ماہ نور نے اپنے بیڈ پر کمر کے بل لیٹے لیٹے سوچا اور اپنی بھیگتی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرنے لگی۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کے فون میں محفوظ کئی پیغام گھوم رہے تھے۔

چارکول اسکیچ کے بارے میں آنے والے پیغام پر اس کے ردِ عمل کا فوری جواب' فلزا ظہور کی تلاش میں کیے جانے والے پیغام کا فوری جواب' اس کی واپسی کے بارے میں پیغام کا فوری ردِ عمل اور ابراہیم کے ریسٹورنٹ میں مدعو کیے جانا۔۔۔"

کیا تمہارے پہلے سارے روپ' تمہارے بہروپ تھے یا پھر تمہارا اصل روپ تمہارا بہروپ تھا۔

اس نے ایک بار پھر اپنی بھیگی آنکھیں پونچھیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

جو بھی تھا اور جیسے بھی تھا میری ذات کو تم کیوں اپنے مشاغل کے دائرے میں گھسیٹ لے گئے اور میں سدا کی احمق تمہارے لفظ لفظ پر یقین کرتی رہی۔ میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ تم جو اتنے بڑے بہروپئے ہو تمہاری کون سی بات قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔"

اس نے اپنے سامنے دیوار پر لگے دیوار گیر آئینے میں لیمپ کی روشنی میں ابھرتا اپنا عکس دیکھا۔

"آج تم بہت مختلف لگ رہی ہو' خاصی Sane (معقول) لگ رہی ہے آج تو۔"

"میرے دل میں جو بات ہوتی ہے' وہ کہہ دیتا ہوں۔"

ماہ نور نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے اپنے بکھرے بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں لپیٹے۔ ایک بار پھر اس کی نظر آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر پڑی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں گر گئے اور اس کے بال ایک بار پھر بکھر گئے۔

"اس کے بال بلا تردد عمدگی سے اس کے شانوں پر بکھرتے ہیں۔"

الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے۔

"یہ خیال کتنا المناک ہے کہ وہ خود کو اس نظر سے نہیں دیکھتی جس سے میں اسے دیکھتا ہوں۔"

"تمہارا جو روپ ہے' وہ مبہوت کن ہے۔"

ماہ نور کو محسوس ہوا۔ اب وہ مسلسل بے آواز رو رہی تھی۔ وہ رات ماہ نور کے لیے بہت طویل اور غم انگیز تھی۔ رات بھر ایک لمحہ کے لیے بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نادیہ نے اپنے ای میل باکس کو یہ دیکھنے کی غرض سے کھولا تھا کہ شاید اس میں اس درخواست کا جواب موصول ہوا ہو' جو اس نے ایک کمپنی کو آئندہ چھ ماہ کے تعلیمی وظیفے کے لیے بھجوائی تھی مگر یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ اس درخواست کا جواب موجود نہیں تھا۔ مایوسی کے عالم میں لاگ آوٹ کرنے سے پہلے اس نے سرسری نظر باقی میلز پر ڈالی جو مختلف تجارتی کمپنیوں کے پیغامات سے بھری پڑی تھی۔ کہاں اور کب سیل لگ رہی تھی۔ سیل میں کیا کیا دستیاب تھا۔ کس سوشل ویب سائٹ پر کون اس کا دوست بننے کا خواہش مند تھا۔ چیزوں کی آن لائن خرید فروخت کے اعلانات' اس نے ایک ساتھ کئی پیغامات کو ختم کرنے کی غرض سے ان پر نشان لگانے شروع کیے۔ نشان لگاتے لگاتے ایک پیغام پر آکر اس کی انگلی رک گئی۔ اس نے پہلے اس پیغام کو غور سے نہیں پڑھا تھا۔ اس نے انگلی سے کلک کرکے اس پیغام کو کھولا۔

پیغام کی تفصیلات میں لندن کی کسی ٹریول ایجنسی کی طرف سے اس کے پاسپورٹ اور ویزہ کی نقول مانگی گئی تھیں اور اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بذریعہ ای میل جلد یہ نقول بھیج دے تاکہ آئندہ پندرہ دن کے اندر اس کے سفری انتظامات مکمل کیے جاسکیں۔

نادیہ کے لیے یہ پیغام غیر متوقع اور حیران کن تھا۔ اس نے کہیں بھی لندن تک کے سفر کے لیے درخواست نہیں بھیج رکھی تھی۔ دو تین بار اس پیغام کو پڑھنے کے بعد اس نے اس کے جواب میں پاسپورٹ اور ویزہ کی نقول مانگنے کی وجہ دریافت کی اور پیغامات ختم کرنے کا ارادہ ملتوی کرکے سائن آوٹ کرلیا۔

اب اس کا ذہن اس پیغام میں الجھ گیا تھا۔ یہ کسی اشتہاری مہم کا حصہ نہیں لگ رہا تھا' نہ ہی نادیہ نے کسی انعامی مقابلے میں کوئی تفریحی ٹرپ جیت رکھا تھا۔ موسم گرما کے آغاز پر اس طرح کے ٹرپ کا تصور اگرچہ بہت

خوش کن تھا مگر اس کی سمجھ میں بہت سوچنے کے بعد بھی یہ نہیں آیا تھا کہ وہ پیغام اسے کیوں موصول ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

کھاری نے ماہ نور کے گھر میں پہلی دفعہ قدم رکھتے ہی بھانپ لیا تھا کہ ماہ نور کے گھر کے رہن سہن اور چوہدری صاحب کے گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ بچپن سے چوہدری صاحب کے ان بھائی کو کبھی کبھار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں آتے دیکھ رہا تھا' جو لاہور شہر میں رہتے تھے اور بہت پڑھے لکھے تھے۔

کھاری کو ہمیشہ یہ بات اچھی لگتی تھی کہ چوہدری صاحب کے یہ بھائی اور ان کی بیوی فارم ہاؤس کے ملازمین سے بھی بہت ادب اور پیار کے ساتھ بات کرتے تھے' البتہ ان کا انداز لیے دیے رہنے والا ہوتا تھا۔ چوہدری صاحب کے بھتیجے اور بھتیجی کو بھی وہ بچپن سے دیکھ رہا تھا مگر ماہ نور بی بی کے گزشتہ برس کے قدرے طویل قیام کے دوران جو وہ ان کے اخلاق اور مروت کا دلدادہ ہوا تھا۔ اس کا تو کوئی بدل ہی نہیں تھا۔

چوہدرانی کے ساتھ لاہور آنے میں اور سب خوش کن باتوں پر یہ تصور بھاری تھا کہ وہ ماہ نور بی بی سے ملاقات کر سکے گا مگر ماہ نور کے گھر میں ایک دن کے قیام کے اندر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ چھٹیوں کی بے فکری میں وقت گزارتی ماہ نور بی بی اور شہر میں اپنی مصروفیات میں گم مشین بنی ماہ نور بی بی میں خاصا فرق ہے۔

جس دن کھاری چوہدرانی کے ساتھ لاہور پہنچا' اس روز تو اس کی ماہ نور سے ملاقات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ اگلے روز صبح جب وہ چوکیدار کے ساتھ گیٹ پر اسٹول رکھ کر بیٹھا تھا' اسے ماہ نور گھر کے گیراج میں کھڑی نظر آئی۔

"اسلام علیکم!" کھاری بھاگ کر گیراج کی طرف آیا اور دانت نکالتے ہوئے بولا۔

"وعلیکم السلام۔" ماہ نور نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ اس کی نظریں اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کی اسکرین پر جمی تھیں اور دھیان تیزی سے فون کے نمبر دبانے کی طرف تھا' پھر وہ فون کان کے ساتھ لگا کر کسی سے بات کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اس کا چہرہ بھی دوسری طرف تھا۔ کھاری کو یوں اپنا نظر انداز کیا جانا تھوڑا مایوس کر گیا لیکن پھر بھی وہ وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر فون پر گفتگو کے بعد فون بند کرتے ہوئے ماہ نور نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کی کھاری پر نظر پڑ گئی۔

"ارے کھاری! یہ تم ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "کتنے بڑے ہو گئے ہو۔"

کھاری کی چند پل پہلے کی مایوسی ایک دم ہوا ہو گئی۔ وہ مسکرایا اور اس نے اپنی ایڑیوں کو ذرا سا اٹھا کر مزید لمبا نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے ماہ نور کی طرف دیکھا۔

"واٹ اے سرپرائز۔" وہ انگریزی زبان میں کچھ بولی۔ جس کا مطلب کھاری نے یہ لیا کہ وہ کہہ رہی تھی تم کتنے لمبے ہو گئے ہو۔

"میں تے جی' کل وی انتظار کردا رہا کہ آپ سے ملاقات ہو جائے پر آپ نظر ہی نہیں آئے۔" کھاری نے اپنی غیر معمولی خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... آئی ایم سوری۔" ماہ نور نے افسوس کا اظہار کیا۔ "کل میں ایک کمپین میں بہت مصروف تھی گھر واپس آتے آتے بہت دیر ہو گئی۔"

کھاری نے کچھ نہ بھی سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"تم ٹھیک رہ رہے ہو نا یہاں' ناشتا کر لیا تم نے؟" ماہ نور نے قدرے عجلت میں پوچھا۔ کھاری کے ایک بار پھر سر ہلانے پر ماہ نور نے چوکیدار کو آواز دی۔ "عظمت گل! کھاری کا بہت خیال رکھنا ہے بھئی۔" چوکیدار سر ہلاتے ہوئے گیٹ کھولنے لگا۔

کھاری نے دیکھا گھر کا اندرونی دروازہ کھلا اور ماہ نور کا بھائی سلمان ہاتھ میں فائلیں' فون' اپنا بٹوہ اور ٹائی پکڑے تیزی سے باہر نکلا۔

"جلدی' جلدی ماہ نور! دیر ہو گئی۔"

وہ تیزی سے کہتا گیراج میں کھڑی ایک چھوٹی گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"اچھا کھاری! پھر کسی وقت تم سے بات ہو گی۔ ابھی تو میں جا رہی ہوں۔"

ماہ نور نے ہلکے سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کھاری سے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کھاری سر اور ہاتھ ہلاتا گاڑی کے راستے سے ہٹ گیا۔ پل کے پل میں گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور گیٹ سے باہر نکل گئی۔

گاڑی کے جانے کے بعد کھاری کو یاد آیا۔ اس نے سوچا تھا ماہ نور کو اس کے گزشتہ قیام کے بارے میں یاد دلائے گا۔ اس وقت ماہ نور کی وجہ سے اسے اپنے روزمرہ کے کاموں سے کتنی بار چھٹی ملی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ وہ ماہ نور کو یہ بھی بتائے گا کہ اس بار بابے منگو کے میلے میں بندر والے نے بندر اور ریچھ کے ساتھ ساتھ بھالو اور چیتے کے کرتب بھی دکھائے تھے مگر اس روز تو کیا کھاری کے قیام کے اگلے کئی دن تک ماہ نور سے اس کا سامنا نہیں ہو سکا تھا اور اسے اپنے یہاں قیام سے شدید بوریت محسوس ہونے لگی تھی۔ ماہ نور کے گھر کا رقبہ اگرچہ کم نہیں تھا مگر کھاری کو یہاں عجیب سی گھٹن محسوس ہوتی تھی۔

چھوٹا سا لان' چھوٹا سا ڈرائیو وے' جس پر چند قدم چلنے کے بعد ہی گیٹ آجاتا تھا اور گیٹ سے باہر نئی ہی دنیا سامنے موجود ہوتی تھی۔ جہاں کم ہی کوئی دوسرے کو جانتا تھا۔ جہاں انسان مشینوں کی طرح وقت پر چلتے اور رکتے تھے۔ کوئی کسی سے مانوس اور آشنا نظر نہیں آتا تھا۔ کھاری کو چوہدرانی کے ساتھ شہر کی مارکیٹوں اور شاپنگ سینٹرز میں بھی گھومنا پڑتا تھا' جہاں بجلی سے چلنے والی سیڑھیاں تھیں جن پر قدم رکھنے سے پہلے چوہدرانی ایک دوبار چیخ مارتی اور پھر کھاری کا ہاتھ پکڑ کر ان پر قدم رکھتی۔ ہر بار انہیں ایسا لگتا وہ گر جائیں گی لیکن اوپر اور پھر اس سے اوپر کی منزلوں کا سامان دیکھنے کے لیے انہیں ان سیڑھیوں پر کھڑے ہونا پڑتا۔

"ساری دکانوں میں ایک جیسا ہی سامان رکھا ہوتا ہے بی بی جی! تسی ایویں ای خوار ہو رہے ہو۔" کھاری چوہدرانی کے ذوق و شوق کو دیکھ کر کہتا۔

"دکاناں نہیں شدائیا! یہ مال ہیں مال۔" چوہدرانی اپنی معلومات جھاڑتے ہوئے کھاری کا مذاق اڑاتی۔

"لو مال تو ان دکانوں کے اندر رکھیا ہے' یہ دکانیں تو مال نہیں نا۔"

کھاری سمجھتا چوہدرانی کے فہم میں کہیں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ وہ ہنس کر رضیہ سے کہتا' جو آنکھیں منہ پھاڑے نئے نئے منظر دیکھتی ہونقوں کی طرح سر ہلاتی رہتی۔

"اک گل تہاڈی جان بی بی جی! اتنا سامان کیا کرنا ہے۔" پھر وہ چوہدرانی کی خریدی چیزوں کے شاپنگ بیگز پکڑتے ہوئے کہتا۔

"میں نے کون سا روز روز لاہور آنا ہے۔ ایک ہی بار لے جاؤں چیزیں پھر پتا نہیں کب آنا ہو۔" چوہدرانی برا مانے بغیر جواب دیتی۔

"فیزہ بی بی (فائزہ بی بی) کو دیکھا ہے' روز نیا جوڑا پہنتی ہیں۔ نئے نئے ٹاپس' نئے نئے جوتے' نئی نئی انگوٹھیاں' وہ بھی تو ڈھیر ساری چیزیں خریدتی ہوں گی نا اسی لیے تو روز نویں نکور بن جاتی ہیں۔"

رضیہ کھاری کو گھورتی اور کھاری کے ذہن میں فائزہ بی بی آجاتیں۔ "ان کا اپنی چوہدرانی جی سے کیا مقابلہ' انہوں نے تو نوکری پر جانا ہوتا ہے جھلیے!"

وہ رضیہ سے کہنا چاہتا تھا مگر اسے اس کے منہ لگنے سے چڑ تھی۔ سو ہر روز وہ چوہدرانی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی مہم میں شریک ہوتا۔ ہر روز وہ مخصوص باتیں کرتے اور تھک کر گھر واپس آجاتے۔

"امیر ہونا بھی کتنا مشکل کم کام ہے۔" ہر رات کھاری سونے سے پہلے سوچتا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو یہ میں ہوں۔ میں چاہ رہا ہوں کہ میں فرینکفرٹ سے پاکستان جانے سے پہلے تم سے ملوں۔ تم نے اپنے پاسپورٹ اور ویزا کی کاپی میل نہیں کی۔ کیا تم اپنے مصروف وقت سے دو دن نکال کر لندن آسکتی ہو۔

خیر خواہ سعد سلطان۔"

نادیہ نے اس میل کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھا اور خوشی سے جھومتے دل پر قابو پاتے ہوئے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ کیا اسے اس پر اعتبار کر لینا چاہیے۔

"کتنی پاگل ہو تم!" پھر اس نے خود کو ڈانٹا۔ "اس دنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو تم سے اتنے کنسرنڈ ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو تمہارے لیے ایک ٹرپ ارینج کریں گے۔ پھر اس میل پر کیسا شک اور اس کے بھیجنے والے کی آئی ڈی پر کیسی بے اعتباری۔"

اس نے اپنی میل باکس کے صفحے کو اوپر نیچے کیا۔ اسی ٹریولنگ ایجنسی سے اسے اس کے سوال کے جواب میں ایک یاددہانی کی میل آئی ہوئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس سے اس کی تفصیلات پوچھ رہی تھی۔ اس بار نادیہ نے اپنے کاغذات اسکین کر کے ان کی نقول بھجوانے میں آدھا گھنٹہ بھی نہیں لگایا۔

☼ ☼ ☼

"ہمیں پتا بھی نہیں چلا اور سعدیہ ایک دم بڑی بھی ہو گئی۔" آپا رابعہ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ مولوی صاحب کے پاس ان کی بات کا کوئی معقول جواب نہیں ہو گا' کہا۔

"ہوں!" مولوی صاحب کے پاس معقول تو کیا' کوئی جواب ہی نہیں تھا۔

"وہ سوال کرنے لگی ہے۔" آپا رابعہ نے بتانا چاہا کہ انہیں کیسے پتا چلا تھا کہ سعدیہ بڑی ہو گئی تھی۔

"ایسے سوال جن کا یا تو جواب دیا جائے یا بچے کو جھڑک دیا جائے' مگر جھڑک دینے سے اس کے ذہن میں اور سوال پیدا ہوں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہوں۔"

"تمہارا اٹھنا بیٹھنا پڑھے لکھے لوگوں میں رہا ہے۔ میں تو ایک عام سا کم علم انسان ہوں' میرا دماغ بڑی بات سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے' لہٰذا میرے خیال سے تو تم ہی سعدیہ کو بہتر سمجھا سکتی ہو کہ سوال کرنا اچھی عادت نہیں۔"

مولوی سراج نے ایک بار پھر معاملے کی گٹھڑی ان کی طرف اچھال دی تھی۔

"اگر میری سمجھ میں آگیا ہوتا تو میں اسے سمجھا چکی ہوتی۔ مجھے کیا ضرورت تھی' آپ کے ننھے سے دماغ پر بوجھ ڈالنے کی۔"

آپا رابعہ نے جل کر کہنا چاہا مگر الفاظ زبان پر ہی روک لیے۔ شوہر کے سامنے زبان چلانے پر انہیں آگ کی وہ لپٹیں نظر آنے لگتیں جو ان عورتوں کی منتظر ہوں گی' جو شوہروں کو ان کا مقام دیتی ہیں نہ ان کا احترام کرتی ہیں۔

"وہ اپنے دادا' دادی' نانا' نانی اور پھپھی چاچوں کے بارے میں پوچھتی ہے۔ اسے حیرت ہوتی ہے کہ کوئی خالہ' کوئی ماموں کبھی اس کے گھر کیوں نہیں آتا۔" انہوں نے اپنے دل کی جلن پر قابو پاتے ہوئے ایک بار پھر مولوی سراج سے مشورہ لینے کی کوشش کی۔

"اسے بتانا تھا نا سب مر مرا گئے۔" مولوی صاحب نے سکون سے جواب دیا۔

"اور اپنے ہر خطبے میں آپ سچ بولنے اور جھوٹ سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔" انہوں نے مولوی صاحب کو

یاد دلایا۔

"دروغ مصلحت آمیز کی بات کر رہا ہوں میں۔" مولوی صاحب نے اپنی بات کی وجہ ظاہر کی۔

"دروغ' دروغ' دروغ۔" آپا رابعہ نے تین بار دہرایا "ہماری تو زندگیاں ہی دروغ مصلحت آمیز کا چلتا پھرتا نمونہ بن کر رہ گئی ہیں۔"

"بصورت دیگر جو ہوگا اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہے تو بتادو سعدیہ کو۔"

مولوی سراج ٹھنڈے ٹھنڈے جواب دے رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ درانتی جس کے دونوں طرف کاٹ دار کانٹے تھے' کی درمیانی جگہ۔ جہاں وہ دونوں قدم جما جما کر چلتے تھے بہت کم چوڑی ہے بلکہ اتنی تنگ تھی کہ ایک غلط قدم ان کے پاؤں کاٹنے کے لیے کافی ہوگا۔

"جیتے رہیں آپ مولوی صاحب! آپ کو رب نے بھاگ لگائے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ ایک سے دن ایک سی راتیں اور آپ مست ہوئے پڑے ہیں۔ کاش! ایسی بے نیازی' ایسی فاقہ مستی سب کو عطا ہوجائے۔" آپا رابعہ دل ہی دل میں کلستی سوچتی رہیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں سعدیہ کو سختی سے ڈانٹ دیتی ہوں کہ پڑھائی میں دل لگائے۔ بورڈ کے امتحان کا سال ہے' ادھر ادھر کی سوچنے کے بجائے اچھے نمبر لینے پر توجہ دے۔ جو عمر بھر کام آنے ہیں۔"

کتنی دیر سوچنے اور کلسنے کے بعد انہوں نے بھی معاملے کی گٹھڑی کچھ دیر کے لیے سر سے اتار کر طاق پر رکھ دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے سوچا اور اگلے روز جب ناشتا کرتے ہوئے سعدیہ نے ان سے اسی قسم کا سوال کیا تو انہوں نے اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے سختی سے سوال کرنے سے منع کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ سعدیہ ابھی اتنی بھی بڑی نہیں ہوئی تھی کہ اس ڈانٹ کے جواب میں ڈرنے کے بجائے مزید سوال سوچنے لگے گی۔ وہ بے خبر تھیں کہ سعدیہ نے معنی کے ایک جہان کی سیر کرنا شروع کر رکھی تھی۔ زندگی کی حقیقتیں اس کی عمر کی ان بچیوں جن کو بہت کچھ بغیر مانگے ہی میسر تھا' کی نسبت سعدیہ پر جلدی جلدی حملہ آور ہو رہی تھیں کہ ان کی کھوج لگائی جائے۔ ان کے بارے میں جانا جائے۔ آپا رابعہ کی ہڑبڑاہٹ اور مولوی صاحب کی مصلحت آمیز خاموشی بلکہ فرار سعدیہ کے ذہن میں نت نئے سوال اٹھا رہی تھی۔ آپا رابعہ کی ڈانٹ پر اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اس کے ماں باپ کی دال میں کچھ کالا تھا' جب ہی پکنے کے بعد بھی الگ نظر آتا تھا۔

☼ ☼ ☼
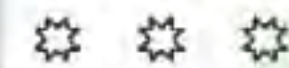
ماہ نور نے شیشے کی دیوار سے پرے ہونے والی بوندا باندی کو غیر دلچسپی سے دیکھا۔ یہ بوندا باندی سڑک پر گزرتی گاڑیوں کی ونڈ اسکرین کو دھندلانے کے لیے کافی تھی۔ سب گاڑیوں کی ونڈ اسکرین پر وائپر زچل رہے تھے۔ اس منظر میں جو اس کے سامنے تھا اس کے لیے دلچسپی کی کوئی بات نہیں تھی یا وہ ذہنی طور پر پریشان تھی' جو اسے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنی تائی صابرہ کے پُرزور اصرار پر ان کو کمپنی دینے کی خاطر اس ریسٹورنٹ میں چائے پینے آئی تھی۔

اس ہائی ٹی کی میزبان تائی صابرہ تھیں اور وہ اس کے سامنے بیٹھی ہائی ٹی میں موجود تمام لوازمات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسلسل باتوں میں مصروف تھیں۔ ماہ نور ان کی ہر بات کا ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔ اسی دوران تائی صابرہ کو اپنے سیل فون کی بیل بجتی سنائی دی اور وہ اپنے کنگ سائز شولڈر بیگ میں سے اپنا فون تلاش کرنے میں مصروف ہوگئیں۔

ماہ نور نے ایک بار پھر شیشے کی دیوار سے پار کے منظر پر نظریں جمالیں۔ کھاری ریسٹورنٹ سے باہر گرین بیلٹس میں لگے جھولوں پر بیٹھے بچوں کے ساتھ ہنستا کھیلتا نظر آرہا تھا۔ اس روز بھی اس نے موتیا رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور بالوں میں تیل لگا کر سیدھی مانگ نکالی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں میں کالے رنگ کے چپل تھے اور وہ بچوں کے ساتھ ادھر ادھر بھاگتا پھر رہا تھا۔

"کتنا خوش قسمت ہے کھاری۔ ہر طرح کی صورت حال میں خود کو ایڈجسٹ کرلیتا ہے اور کتنا پُراعتماد بھی ہے۔ کوئی اور اس کی جگہ ہوتا تو شہر اور شہر والوں کی دہشت کے مارے اپنی جگہ سے ہلتا بھی نہیں۔"

اسے کھاری پر رشک آیا۔ اسی دم ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے پر کھڑا کسی کارٹون کریکٹر کا روپ دھارے لڑکا کھاری سے جاملا اور اب کھاری اس خرگوش بنے لڑکے کے ساتھ ٹانگیں اور بازو ہلا ہلا کر وہاں موجود بچوں کو محظوظ کرنے لگے تھے۔ ماہ نور نے ہنستے' مسکراتے' تالیاں بجاتے بچوں کو بھی رشک سے دیکھا۔

"کیسی بے فکری ہے۔ کتنے مزے ہیں ان بچوں کے۔" اس نے سوچا۔

"مگر میں اتنی زود رنج کیوں ہو رہی ہوں۔" پھر اسے خود پر غصہ آنے لگا۔

"میں کیوں دوسروں پر رشک کیے جارہی ہوں۔ میری زندگی میں کس چیز کی کمی ہے۔" وہ خود سے سوال کرنے لگی۔

"لے ماہ نور! تو نے تو کچھ کھایا ہی نہیں دھی رانی!" اس سے پیشتر کہ وہ مزید خود سے ناراض ہوتی' تائی صابرہ نے اسے اس کی سوچوں سے باہر نکال لیا۔

"اتنا کچھ ویسے ہی پڑا ہے۔" وہ مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ "اب بل تو انہوں نے اتنا وڈا لے لینا ہے نا جیسے ہم سب کچھ ہاتھ لگائے بغیر ہی چھوڑ جائیں۔"

"آپ فکر نہیں کریں' میں ان سے کہہ کر پیک کروالیتی ہوں۔ کھاری اور رضیہ کھالیں گے۔"

ماہ نور نے انہیں تسلی دینے کی خاطر کہا اور ایک نظر باہر ڈالی۔ لمبے لمبے کانوں والے خرگوش بنے لڑکے اور کھاری میں گاڑھی چھنتی نظر آرہی تھی۔ کھاری کے ہاتھ میں جوس کا ٹن تھا اور وہ اس لڑکے سے یوں باتیں کر رہا تھا جیسے برسوں کی واقفیت ہو۔ ماہ نور نے ویٹر سے کہہ کر بچ جانے والے تمام لوازمات پیک کروائے اور بل ادا کرنے کے بعد تائی صابرہ کے ساتھ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔

"اوئے ہوئے! باہر تو ابھی بھی سورج گرم ہے۔" باہر قدم رکھتے ہی تائی صابرہ نے دہائی دی۔ ان دونوں کو باہر نکلتا دیکھ کر ڈرائیور پارکنگ سے گاڑی نکال کر آگے لے آیا۔ کھاری بھی انہیں دیکھ کر اپنا کھیل تماشا چھوڑ کر گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ خرگوش بنا لڑکا بھی اپنے لمبے لمبے کان ہلاتا' اچھلتا کودتا کھاری کے ساتھ باتیں کرتا ادھر کو آرہا تھا۔

"چلیے جی!" کھاری گاڑی کے قریب آکر بولا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرے پر مسرّت جھلک رہی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی کے دروازے ماہ نور اور تائی صابرہ کے لیے کھولے۔ ماہ نور کے گاڑی میں بیٹھ جانے کے بعد خرگوش نے اس کی سائیڈ کا دروازہ بند کرکے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ ماہ نور کو یکدم خیال آیا۔ اس نے بٹن پر انگلی رکھ کر شیشہ نیچے کیا اور اپنے پرس سے پچاس روپے نکال کر خرگوش کو پکڑا دیے۔ جواب میں ایک بار پھر اس نے جھک کر ماہ نور کا شکریہ ادا کیا۔ ماہ نور کی کھڑکی کا شیشہ آہستہ آہستہ بند ہوگیا اور گاڑی آگے چل دی۔

"توبہ توبہ! بندہ کیا کچھ نہیں کرتا روزی کمانے کے لیے۔" تائی صابرہ نے کہا۔ "اسے دیکھو! بے چارہ جانور ہی بن گیا روٹی کی خاطر۔ سارا دن اچھل کود کے' گا بجا کر اس کی بھلا کتنی کوئی مزدوری بن جاتی ہوگی ماہ نور!" انہوں نے ماہ نور سے پوچھا۔

"پتا نہیں تائی جی!" ماہ نور کو بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ دن میں کتنا کما سکتا تھا۔ "گزارہ ہو ہی جاتا ہوگا تب ہی تو یہ کام کرتا ہے نا۔"

"او جی واہ واہ کمائیاں ہوتی ہیں اس کو' مجھے خود بتایا ہے اس نے۔" کھاری نے خود کو اس گفتگو میں گھساتے ہوئے کہا۔ "میرے سامنے جی کئی لوگوں نے پنجا پنجا' سو سو کے نوٹ پھڑائے ہیں اسے۔"

"اچھا! پھر تو اچھالے جاتا ہے یہ۔" تائی صابرہ نے اچنبھے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"بی بی جی! یہ جو لڑکا ہے نا' یہ ادھر کا ہے بھی نہیں۔ یہ باہر سے منگوایا ہوا ہے ہوٹل والوں نے' جپان (جاپان) سے بلا کر نوکری دی ہے اس کو۔ پر اردو ساری جانتا ہے۔" کھاری بتا رہا تھا' اسی دم گاڑی سگنل پر رک گئی۔

"اردو ہی نہیں پنجابی بھی آتی ہے اس نوں۔" کھاری کہہ رہا تھا۔

"جاؤ کھاری! تم بھی لمبی لمبی چھوڑتے ہو' تمہیں کیا پتا اس کاسٹیوم کے نیچے چھپا لڑکا پاکستانی ہے' ایرانی ہے کہ جاپانی۔" ماہ نور نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"او جی ماہ نور بی بی! مجھے خود اس نے اپنا منہ اتار کر شکل دکھائی ہے اپنی' پورا جپانی تھا۔ چھوٹی چھوٹی اکھیوں والا' پھینی ناک والا۔" کھاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہمارے فارم ہاؤس پر جپانی آتے نئیں بی بی جی!" پھر اس نے اپنی بات کے حق میں ووٹ لینے کی خاطر چہرہ پیچھے کی طرف موڑ کر تائی صابرہ سے پوچھا۔ "میں ان کی اکھیاں منہ سب پہچانتا ہوں جی۔"

"ان کے لیے تو چودھری صاحب سوشی منگاتے ہیں شہر سے۔" اس نے ماہ نور کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو مجھے کون سی بات کا علم نہیں۔

"اچھا بھئی ہوگا۔" ماہ نور نے ہار مانتے ہوئے کہا۔ "تمہارا تو اچھا دوست بن گیا کوئی اتا پتا بھی لیا اس سے کہ دوستی شروع کر کے یہیں ختم کر آئے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"اے دیکھو جی!" کھاری نے جیب میں رکھا ہوٹل کا کارڈ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "اس تے اس کا نام پتا' فون نمبر سب لکھوالیا ہے۔ چوہدری صاب سے اجازت لے کر اسے فارم ہاؤس بلاؤں گا۔ میں نے اسے بابے منگو دے میلے دے بارے میں بتایا۔ وہ کہہ رہا تھا اسے وہ کرتب بھی آتا ہے وہ جو کنہیاں گینداں اکو واری اوپر اچھالتے ہیں فیر واری واری پھڑ لیتے ہیں' پر گرنے نہیں دیتے ایک بھی' پہلے سرکس میں کام کرتا تھا یہ۔"

اب کھاری ڈرائیور سے مخاطب تھا۔

"پاجی! آپ نے کبھی سرکس دیکھا ہے؟ بابے علم دین دے میلے پر لگتا تھا۔ پہلے تو ہم دیکھنے جاتے تھے۔ لڑکے لڑکیوں والے کپڑے پہن کر سانپوں والا ناچ دکھاتے تھے۔"

کھاری اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا اور ماہ نور کو سرکس کے نام پر سارہ خان' اس کی معذوری اور سعد کی سارہ کے لیے شدت پسندی بری طرح یاد آنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چھ سال کے بعد لندن آئی تھی۔ اس شہر میں کبھی اس کے نانا رہا کرتے تھے۔ ممی اسے جب پاکستان سے واپس لے کر آئی تھیں پہلے لندن ہی میں رکی تھیں۔ اس وقت وہ اپنے نانا سے پہلی بار ملی تھی۔ نیلی آنکھوں اور گرے بالوں والے نانا خاصے ضعیف تھے اور بیمار بھی۔ اسے یاد تھا ممی اور نانا کی بحث دن رات چلتی تھی' ممی چلا چلا کر نانا کو کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں اور نانا بری طرح کھانستے ہوئے ممی سے جو بھی کہتے تھے۔ اس میں سے ایک ہی بات اس سمجھ میں بھی آتی تھی اور یاد بھی رہ گئی تھی۔ وہ ممی سے کہتے تھے کہ ان کی ضد' خود غرضی اور

ہٹ دھرمی ان کی بیٹی کی زندگی برباد کر دے گی۔

"میں تمہیں اور تمہارے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں ڈورا!" نانا اپنی کھانسی پر قابو پاتے ہوئے کہتے۔

"تم جس مقصد کے لیے لڑکی کو اس سے چھین لائی ہو' اس میں اس کی صرف تباہی چھپی ہوئی ہے تباہی۔"

"تم نے کب مجھے غلط نہیں کہا۔" ممی چمک کر بولیں۔ "میں تمہارے پاس نصیحتیں سننے یا پیشن گوئیاں کرانے نہیں آئی میں تم سے صرف تمہاری اس جائیداد میں سے اپنا حصہ لینے آئی ہوں جس میں جولیا کے ساتھ میں بھی حصہ دار ہوں۔"

"چلاؤ مت۔" نانا اپنے سینے پر ہاتھ ملتے ہوئے کہتے۔ "میری جائیداد میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم نے ہمیشہ مجھ سے بغاوت کی۔ کبھی کسی ایشین سے شادی کی اور کبھی کسی امریکن سے دوستی گانٹھی۔ نہ تم ان کی سگی بنیں نہ میری۔ تمہارے جیسی اولاد کا باپ ہونا کسی سزا سے کم نہیں اور تمہاری جیسی اولاد کا کبھی کوئی حصہ نہیں ہوا کرتا ماں باپ کی جائیداد میں۔"

"میں دیکھتی ہوں تم کیسے نہیں دیتے۔" ممی فرش پر پاؤں مار کر کہتیں اور پھر سارا سارا دن کے لیے کہیں غائب ہو جاتیں۔

وہ ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے نانا کے اس چھوٹے سے گھر کے دو کمروں میں گھومتی رہتی جن میں سے ایک میں نانا ایک بڑی سی آرام کرسی پر بیٹھے جھولتے رہتے اور دوسرے میں اس کی اداس آنکھوں والی آنٹی جولیا جو سننے اور بولنے کی قوت سے محروم تھی' بیٹھی آرپ کی تاروں پر انگلیاں پھیرتی رہتی۔ جس پس منظر سے اسے اٹھا کر یہاں لا بٹھایا گیا تھا' اس کے اثرات کے زیر اثر نادیہ کو لندن کا یہ روپ قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

"لنڈن گندا ہے' سب سے اچھی جگہ اسلام آباد ہے اور مری ہلز۔" وہ اپنی خالہ سے کہتی جو اس کی بات سن سکتی تھی نہ اس کا جواب دے سکتی تھی۔

پھر ممی اسے لے کر امریکہ چلی گئیں۔ بیمار اور بوڑھے نانا اور گونگی بہری خالہ پیچھے رہ گئیں۔ ممی نے نانا کے خلاف قانونی جنگ جیت کر ان کی جائیداد میں سے اپنا حصہ ہتھیا لیا تھا۔ پاکستان سے واپس امریکہ تک کے سفر میں دو فتوحات کے طغرے ان کے شانے پر سجے تھے۔ وہ نادیہ کو اس کے ڈیڈی سے چھین لائی تھیں اور انہوں نے اپنے باپ سے اپنا حصہ وصول کر لیا تھا۔ نادیہ کے معصوم ذہن میں ممی کی فتوحات کے تذکرے تو نہیں بیٹھ پائے تھے' اسے بس یہ ہی احساس رہتا تھا کہ جو کچھ بھی تھا اس کا کوئی بڑا نقصان ہو چکا تھا۔ اس کے بعد آنے والے سالوں نے نادیہ کے اس خیال کو عملی شکل دیتے ہوئے زندگی سے اس کا جو تعارف کروایا تھا' اس کے مطابق نادیہ کا بڑا ہی نہیں' بہت بڑا نقصان ہو چکا تھا۔ چودہ سال کی عمر کو پہنچنے پر ممی اسے بتانے لگیں کہ اپنے ہم عمر امیر لڑکوں کو پھنسانے کے ایک سو ایک بہترین طریقے کیا تھے۔

"ایک اچھا بوائے فرینڈ تمہارے لیے کم از کم ایک اچھے لباس' اچھے سینڈلز اور ایک وقت کے بہترین کھانے کا بندوبست تو کر ہی سکتا ہے۔"

ممی نے اسے لالچ دیتے ہوئے کہا تھا اور اگر تم پندرہ ایسے بوائے فرینڈز بنا لیتی ہو تو دو دن ہر دوست کے ساتھ کے مطابق ایک مہینے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔"

ممی یہ سب بتاتے ہوئے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتیں اور نادیہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہتی' جو اسے لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے لباس پہننے کے سو طریقے مزید بتاتیں۔

"یہ تمہاری زندگی ہے نادیہ! جسے تم نے خود جینا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اپنے لیے کیا بہترین فیصلہ کرتی ہو۔"

"مجھے ابھی پڑھنا ہے ممی!" وہ بے یقینی سے ممی کی بات سنتی اور جھنجلا کر کہتی۔
"پڑھنا ہے۔" ممی دانت پیستیں۔ "تمہارے اخراجات تمہارا باپ پورے کرے گا؟؟"
"وہ ضرور کرتا اگر آپ مجھے اس سے چھین کر یہاں نہ لے آتیں۔" نادیہ کے دل میں گزرے دنوں کی یاد کی کسک اٹھتی۔
"تمہیں کیا پتا تمہارا باپ کون ہے۔" وہ اسے اسی بات پر بلیک میل کرنے کی کوشش کرتیں جس سے انہوں نے ڈیڈی کو بلیک میل کیا تھا۔
"میں نہیں جانتی۔" نادیہ کا لہجہ گستاخ ہو جاتا۔ "مگر جو آپ کا طرز زندگی ہے اس سے لگتا ہے شاید آپ خود بھی نہیں جانتیں۔"
"بکواس بند کرو۔" ممی ڈپٹنے کی کوشش کرتیں۔
"اب آپ کو یہ باتیں بکواس ہی لگیں گی۔ حقیقت میں آپ نے میری زندگی کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اچھی بھلی میں ڈیڈی کے ساتھ سکون کی زندگی گزار رہی تھی' آپ نجانے کون سے عزائم پورے کرنے کے لیے ایک پورا ڈرامہ رچا کر مجھے یہاں لے آئیں اور اب میری زندگی تباہ کرنے کے لیے اپنے بے ہودہ مشورے دیتی رہتی ہیں۔ آپ مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر ممی کی آنکھوں کے سامنے کرتی۔
"تو جاؤ۔۔۔" وہ بھڑک کر کہتیں۔ "جاؤ واپس اپنے ڈیڈی کے پاس چلی جاؤ۔"
"ہونہہ!" نادیہ تمسخر اڑانے والے انداز میں سر جھٹکتی۔ "آپ نے مجھے ان کے پاس واپس جانے کے قابل چھوڑا ہوتا تو ضرور چلی جاتی۔"
"تم اچھی طرح جان لو نادیہ!" ممی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہتیں۔ "میں تمہاری کوئی مالی مدد نہیں کروں گی' تمہیں اپنی روزی روٹی کے اخراجات خود ہی پورے کرنے ہوں گے۔"
"فکر مت کریں۔ میں آپ سے کچھ لینا بھی نہیں چاہوں گی۔" وہ غصے سے کہتی۔
"یہ میرا سر درد ہے کہ میں اپنے اخراجات کیسے پورے کروں گی؟؟"
اس کے اور ممی کے درمیان ایسی بحثیں کئی بار چھڑیں۔ وہ ممی کے بنائے ہوئے اصولوں پر چلنے پر خود کو آمادہ کر سکی نہ ممی اس کی مالی امداد پر راضی ہوئیں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں مادر پدر آزادی پیدائشی حق قرار دی جاتی تھی' خود کو لاشعور میں بیٹھے ان تعصبات کے زیر اثر ہر ممکنہ حد تک بچا کر رکھنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کسی دین کے اصولوں کی تقلید کر رہی تھی نہ روایات و اخلاقیات کے درس کی' لیکن پھر بھی اسے بہت بچپن میں سنی کئی باتیں رہ رہ کر یاد آتیں۔
ایک ایسے معاشرے کی روایات یاد آتیں جس سے اس کا تعلق کئی سال پہلے ٹوٹ چکا تھا اور وہ خود کو کسی کام سے یہ کہہ کر روک لیتی "نہیں نادیہ! تم ابھی پندرہ سال سے کم عمر ہو۔"
حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اس دلیل میں کوئی منطق نہیں تھی مگر اسے اپنے لیے وجوہات درکار تھیں۔ وہ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے خواب بنتی اور اپنے پاس پیسہ جمع کرنے کا شوق پالتے بڑی ہو گئی تھی۔
اب وہ مادر پدر آزاد معاشرہ اسے پوری طاقت کے ساتھ خود میں جذب ہو جانے کی دعوت دینے لگا تھا اور اسی معاشرے کا ایک فرد جان خود اس گھر میں رہتا تھا جس کی مالکن ممی تھیں۔ جان سے ممی نے شادی کی تھی یا ویسے ہی اس کے ساتھ رہ رہی تھیں یہ نادیہ کو کبھی پتا نہیں چل سکا تھا مگر جولیا' کوبی اور ماریہ بہرحال ممی اور جان کی اولادیں تھیں کیونکہ ان تینوں کے چہروں میں ممی اور جان دونوں کی مشابہت تھی۔
جولیا' کوبی اور ماریہ کو گھر میں جائز بچوں کا درجہ بھی شاید اسی لیے حاصل تھا' مگر نادیہ کی اس گھر میں کیا حیثیت

تھی۔ یہ نادیہ کو کسی سے کوئی سوال کیے بغیر ہی علم تھا۔ ابھی وہ گھر سے باہر کی دنیا کے رویوں پر ردعمل ظاہر کرنے کی منصوبہ بندی کر رہی تھی کہ گھر کے اندر سے اس پر سیندھ لگنا شروع ہو گئی۔ جان نے تین بار اس سے دست درازی کی جو کوششیں کی تھیں' اس نے لفظ بہ لفظ ممی کے گوش گزار کر دی تھیں۔
"جب تک تم خود اپنے لیے نہیں کماؤ گی' اس وقت تک تمہارے ساتھ اندر' باہر یہ ہی ہوتا رہے گا۔"
ممی کے نزدیک اقتصادیات اور معاشیات کے سبق ازبر کر لینا سب سے اہم بات تھی۔ ان سب حالات اور رویوں کا ہی ردعمل تھا کہ نادیہ نے اس گھر اور ایک نام نہاد رشتے سے جان چھڑا لینے کا سوچا تھا۔ وہ انٹرنیٹ پر پڑھائی کے لیے کسی سستے مقام کی تلاش میں رہتی اور اسے اس چھوٹے سے ملک فن لینڈ میں پڑھائی اور رہائش کا خرچہ اپنی حیثیت اور مختلف جگہوں سے ملنے والے وظائف کے عین مطابق لگا۔ ایک جہنم سے نکل کر وہ زندگی کے دوسرے بھیانک چہرے سے نمٹنے کے لیے ہیلسنکی پہنچی' جہاں طویل اندھیرے اور برف کی قبر جیسے ماحول نے اس کا استقبال کیا تھا۔
گزشتہ کئی سالوں سے جو کٹھن زندگی وہ گزار رہی تھی' اس نے اسے حالات سے مقابلہ کرنے اور انہیں جیسے وہ تھے کی حیثیت میں قبول کر لینے کا ہنر سکھا دیا تھا۔ ہیلسنکی میں زندگی سخت تھی' لیکن وہ ان بہت سی ذہنی اذیتوں سے دور چلی آئی تھی جن کا سامنا اسے آئے روز کرنا پڑتا تھا۔ ہیلسنکی میں آمد کے بعد جب وہ موسم اور حالات کی عادی ہوئی تو اس نے یکسوئی سے انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا کی کھوج لگانا شروع کی۔ اس کی شدت سے یہ خواہش تھی کہ وہ اپنے بچپن میں جن لوگوں سے مانوس تھی' ان میں سے کوئی اسے کہیں مل جائے' پھر اس ایک کے ذریعے وہ باقیوں تک پہنچ سکتی تھی۔ اس کی لگن تھی یا اس کی نیک نیتی کہ اپنے اس کھوج کے نتیجے میں سب سے پہلے وہ سعد سلطان تک پہنچ گئی' جس تک پہنچنے کی آرزو نجانے کب سے اس کے دل میں تھی۔ اسے کئی دن تک یقین نہیں آیا تھا کہ وہ سعد تک پہنچ گئی اور سعد نے بھی اسے پہچان لیا تھا۔
"یہ تو معجزہ ہو جانے والی بات ہے۔"
وہ کئی بار خود سے کہتی۔ سعد سے ہونے والی کبھی کبھار کی گفتگو اس کے لیے زندگی کا سب سے پرکشش کام بن چکا تھا۔ کوئی تھا جسے کسی بھی تعلق' کسی بھی رشتے کی بنا پر وہ اپنا کہہ سکتی تھی۔ اس کے لیے اس سے بہترین احساس کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اسی میں بہت خوش تھی لیکن سعد کی وہ میل جس میں اسے لندن آکر ملاقات کی دعوت دی گئی تھی' اس کے نزدیک اس صدی کا سب سے ناقابل یقین واقعہ تھا۔
وہ کئی دن تک اس دعوت نامے پر یقین کرنے اور بے یقین ہو جانے کی کیفیت میں ڈولی رہی تھی لیکن جب اسے جہاز کے ریٹرن ٹکٹ' ہوٹل بکنگ کی کنفرمیشن اور اس کے سفر کے دیگر انتظامات سے متعلق میلز وصول ہوئیں تو اسے یقین آگیا کہ انسان کی زندگی میں ایک سے زیادہ بار بھی معجزے ہو سکتے تھے۔ اسی دعوت نامے اور انہی سہولتوں کے نتیجے میں اس روز وہ لندن میں تھی۔
ایک فور اسٹار ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں بیٹھی وہ اس شخص کا انتظار کر رہی تھی جو رشتے میں اس کا سوتیلا بھائی تھا۔

☆ ☆ ☆

"ٹریڈ فیئر کے اختتام پر تمہیں واپس اسلام آباد آنا تھا' تم نے اپنا روٹ کیوں تبدیل کر لیا۔" اپنے کلائنٹس اور سعد کے ساتھ ایک ویڈیو کانفرنس کے بعد سب شرکاء کے اٹھ جانے پر بلال نے سعد سے کہا۔
"میرے سپرد کیا گیا ہر کام حیران کن انداز میں اچھے اور ٹھیک طریقے سے پایہ تکمیل تک پہنچ گیا اور آپ جانتے

ہیں کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔" سعد نے ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"تو؟" وہ قطعی متاثر ہونے کے موڈ میں نہیں تھے۔
"تو یہ کہ مجھے دو دن کا بریک چاہیے۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے اس بریک کے دوران میں آپ کے کاروبار کے لیے مزید کارنامے سرانجام دے لوں۔"
"تمہارا اشارہ برائن اینڈ کمپنی کی طرف ہے۔" انہوں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
"ہاں وہ بھی ہے' ایک دو مرغے اور بھی ہیں میری نظر میں' میں نے سوچا لگے ہاتھوں انہیں بھی پھنسا لوں۔"
"ہوں!" وہ سوچ میں پڑ گئے۔
"ڈیڈی! آپ کے پاس میری بات ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ ہے ہی نہیں' آپ برائن اینڈ کمپنی کی اہمیت سے خوب واقف ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔
"چلو ٹھیک ہے' تم کوشش کر کے دیکھ لو۔" کاروباری مصلحت سعد کو زچ کرنے کی آرزو کے آڑے آ گئی۔
"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈیڈی!" وہ ہاتھ میں پکڑا قلم دانتوں سے بجاتے ہوئے بولا۔ "وقت آپ کو بلیک میل نہیں کر سکتا' مگر دو جمع دو چار کرنے کی آرزو آپ کو خوب بلیک میل کر سکتی ہے۔"
"تم جانتے ہو کہ بہت گہرائی میں جا کر مجھے صرف اور صرف ایک چیز بلیک میل کر سکتی ہے تم ہر معلول میں اس بلیک میلنگ علت کو ڈھونڈ سکتے ہو اگر دماغ ساتھ دے تو۔" وہ چڑ کر بولے۔
"اور آپ کہتے ہیں علتیں پالنے کا کوئی پلان آپ کے چارٹر میں شامل نہیں ہے۔" وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر بولا۔
"تمہارے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ تم بات سے بات نکالتے جاؤ اور میرے پاس بھی اتنا وقت ہوتا ہے کہ تمہاری ہر بات کا معقول دلائل کے ساتھ جواب دوں' مگر اس وقت تم یاد کرو' تمہیں اس وفد کے ساتھ ڈنر کرنا ہے صاحبزادے! اگرچہ میں تمہارا سیکریٹری نہیں ہوں جو تمہیں تمہاری اپائنٹمنٹس یاد کرواتا رہے' مگر کیونکہ یہ دن میرے لیے بہت اہم ہے اس لیے تمہیں یاد دلا رہا ہوں۔" وہ خالص کاروباری لہجے میں بولے۔
"اوہ! رائٹ باس۔ میں مشکور ہوں آپ نے مجھے اس ٹرپ کے کسی چوک سے بروقت بچا لیا۔"
وہ سر جھکاتے ہوئے بولا اور اگلے ہی لمحے وہ اسکرین سے غائب تھا۔ البتہ بلال اپنی جگہ بیٹھے کتنی ہی دیر اس کی گفتگو پر غور کرتے رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

اس نے فون پر نادیہ کو اپنی آمد سے مطلع کیا تھا۔ نادیہ کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور نادیہ کی اجازت ملنے پر دروازہ ہلکی سی کلک کے ساتھ کھل گیا۔
نادیہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ دراز قد تھا' اس کا جسم کسرتی اور اسمارٹ تھا' اس کے بال سیاہ تھے اور آنکھیں بھی' اس نے گرے پینٹ پر نیلا پل اوور پہن رکھا تھا۔ وہ ہو بہو ویسا تھا جیسا اس نے اپنے بچپن میں ڈیڈی کو دیکھا تھا۔
اس کے سامنے آنے پر نادیہ کو محسوس ہوا وہ اس شخصیت کے سامنے کھڑی تھی' جس کے سینے سے لگنے کی خواہش نجانے کب سے اس کے دل میں تڑپ رہی تھی لیکن اگلے لمحے اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ وہ شخص نہیں اس کا بیٹا تھا اور اسے اپنے جذبات پر پورا قابو رکھنا چاہیے۔
"تم بڑی ہو گئیں اور تمہارے چہرے سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تم خاصی ذمہ دار ہو چکی ہو۔" وہ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔

"اور تم صرف بڑے ہوئے ہو۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے تم ابھی بھی ویسے ہی لاپروا اور غیر ذمہ دار ہو۔" نادیہ نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا' اس کے دل میں سعد کے لیے ڈھیروں پیار اُمڈ رہا تھا۔
"اچھا تو تم بھی چہرے پڑھنے کا فن جانتی ہو۔" وہ ہنسا اور بے تکلفی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔
"آؤ ہم دونوں مل کر صرف تمہاری باتیں کرتے ہیں۔" اس نے نادیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔
نادیہ نے اس کے بہت اچھی طرح پالش کیے ہوئے جوتوں کی چمک پر غور کیا اور پھر اس کی نظریں اس کی پینٹ کی کریز سے اوپر اٹھتی اس کے چہرے تک چلی گئیں۔
اس کی ہر چیز کتنی پرفیکٹ ہے۔" اس نے سوچا اور جسے ایک صحت مند بھرپور زندگی اپنی تمام آسائشوں کے ساتھ میسر ہو تو اس کے ہر انداز میں پرفیکشن خود بخود ہی آ جاتی ہے۔" پھر اس نے خود کو بتایا۔
اس کے وجود سے کسی قیمتی پرفیوم کی خوشبو آ رہی تھی اور اس کی کلائی پر ایک بڑی مہنگی گھڑی بجی تھی۔ آئی فون کے نیو ورژن کا سیٹ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا۔
تم میں کیا کم تھا نادیہ بلال جو سعد سلطان میں زیادہ تھا۔ جو تم اس باپ کی بیٹی ہوتے ہوئے اس کی بیٹی قرار نہ پا سکیں۔" سعد کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کرتے ہوئے اس نے بارہا سوچا۔
وہ دن اور اس سے اگلا دن' اس کی ٹھہری ہوئی مخصوص روٹین والی زندگی میں آنے والے گنے چنے غیر معمولی دنوں میں سے ایک تھا۔ وہ عرصہ پہلے بھول چکی تھی کہ آسائشیں اور سر اٹھا کر دیکھی جانے والی چیزیں جب میسر ہوں تو کیسا لگتا ہے۔ لندن تک کا ہوائی سفر ایک طویل عرصے کے بعد آسائش کا مزا چکھنے کا پہلا قدم تھا۔
اس کے بعد اس ہوٹل میں قیام سے لے کر سعد کے ساتھ لندن کے معروف تفریحی مقامات پر گھومتے پھرتے پکاڈلی سرکس کے رنگ و روشنی سے بھرپور نظارے' ویسٹ اینڈ میں سینٹ مارٹنز تھیٹر میں برس ہا برس سے دکھایا جانے والا ماؤس ٹریپ' ہیرڈز اور سلفریجز سے شاپنگ' بہترین فوڈ اسپائس کے کھانے۔ نادیہ کو کسی اور ہی دنیا میں لے گئے۔
"دور سے سنہری نظر آنے والی چیزیں اتنی آسانی سے آپ کی دسترس میں بھی آ سکتی ہیں۔" وہ ایک بے یقینی کی کیفیت میں سب کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی رہی لیکن اس کا دل جانتا تھا کہ ایک مشقت بھری زندگی سے کچھ وقت کے لیے دور اس ٹرپ میں ہر چیز اور ہر بات سے زیادہ اہم سعد کے ساتھ گزارے لمحے تھے۔ اس کی محبت کا وہ اظہار تھا' جو وہ الفاظ سے نہیں اپنے عمل سے کر رہا تھا۔
نادیہ کی چھوٹی چھوٹی خواہشات اور خوشیوں کو وہ خود سے سمجھ رہا تھا اور خود بخود وہ سب کر رہا تھا' جو نادیہ کے دل میں تھا۔ اس نے نادیہ کو ضرورت کے کئی کپڑے' جوتے' سویٹر' جیکٹس' ٹائٹس اور مفلر خرید کر دیے۔ گرم بستر اور اوڑھنے کی گرم چیزوں کی خریداری کی۔ کھانے کی ٹن بند اشیا کے ڈھیر اور چھوٹی موٹی جیولری۔ اس کی نظر زیادہ تر ان چیزوں پر تھی' جو نادیہ کے کام آ سکتی تھیں اور اس کی زندگی میں آسانیاں لا سکتی تھیں۔
"تمہارے اکاؤنٹ میں' میں نے کچھ رقم ٹرانسفر کروائی ہے۔" دوسری رات ڈنر کے دوران اس نے نادیہ کو بتایا۔ "اور میں آنے والے وقت میں بھی وقتاً" فوقتاً" کچھ رقم تمہیں بھجواتا رہوں گا' اس وقت جو ٹریولرز چیک تمہارے پاس ہیں وہ اتنے ہیں کہ واپس جا کر بھی تمہیں ان سے کافی رقم مل سکتی ہے۔"
"مگر۔" نادیہ نے کچھ کہنا چاہا۔
"مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دو۔" سعد نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کیا "جب تک تمہاری پڑھائی ختم نہیں ہو جاتی تمہاری ذمہ داری میری ہے۔ ہاں جب تم پڑھ لکھ کر اپنا کیریئر بنا لوگی پھر تم مجھے سپورٹ کیا کرنا۔" وہ مسکرایا۔

"لیکن تم اتنا سب کیسے مینج کرو گے اور کیوں کرو گے؟" نادیہ نے بے چینی سے کہا۔

"یہ میں اسی رقم سے مینج کروں گا جو میرے ساتھ ساتھ تمہارا بھی باپ کماتا ہے اور اتنا کماتا ہے کہ بعض اوقات اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی کمائی کا مصرف کیا ہو سکتا ہے' سو کپڑے ادھیڑ ادھیڑ کر بننے کے بجائے بہتر ہے کہ رقم کا کچھ حصہ جائز جگہ اور جائز کام پر استعمال ہو۔" اس نے کہا۔

"ویسے بھی یہ رقم میرے ذاتی اکاؤنٹس سے تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل ہوا کرے گی' انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ میں ایسا کیوں کروں گا۔" اس نے کانٹا پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے دل پر یہ بوجھ ہے کہ میں اکیلا تمہارا حق بھی کھا رہا ہوں۔ مجھے اپنے لیے میسر ہر چیز کو اپنے لیے جائز کرنے کی خواہش ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے اپنے ساتھ جائز حق داروں کو ان کا حق پہنچاؤں۔"

وہ سر جھٹک کر ہنسا۔ "سمجھو اس میں میرا اپنا بھی لالچ ہے۔"

"مگر میں ڈیڈی کو جانتی ہوں۔ وہ ضرورت پڑنے پر تمہیں اپنے پاس سے ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔" نادیہ نے کہا۔

"نہ دیں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "مجھے اپنے لیے چاہیے بھی کتنا۔ میری ضرورتیں اور دلچسپیاں بہت محدود ہیں۔ ان کے لیے مجھے بہت زیادہ رقم کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ویسے بھی ہر بزنس ڈیل میں ڈیڈی کا پچاس فیصد کا شراکت دار ہوں۔ اس لیے مجھے کوئی کمی نہیں ہوتی۔ تم فکر مت کرو۔

اور بس باقی فکریں بھی بھول جاؤ۔" اس نے پیار سے نادیہ کے گال کو چھوتے ہوئے کہا "تم اب ایک صحت مند' نارمل زندگی گزارو۔ ڈٹ کر پڑھو' بے فکری سے رہو اور خوش باش نظر آیا کرو جو کہ تم ہنستے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوتیں۔"

"حالات کی ایب نارملٹیز انسان کو نارمل رہنے نہیں دیتیں۔" نادیہ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں اور سمجھتا بھی ہوں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں' سنی سنائی باتوں کو جاننا اور سمجھنا اور بات ہے۔" نادیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "حقیقت میں ان حالات سے گزرنا اور بات ہے۔"

"تمہیں پتا ہے کہ حالات کی ایب نارملٹیز کا ایک شکار میں بھی ہوں۔" سعد نے نادیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ نادیہ نے استعجاب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ یوں سر ہلا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہوں میری بات کا یقین کر لو۔

"میں بھی نارمل نہیں ہوں۔" پھر اس نے اٹھنے سے پہلے نادیہ کو بتایا۔ نادیہ نے دکھی ہوتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار اس کے سینے سے لگ گئی۔

"آئی لو یو سعد!" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"آئی لو یو ٹو مائی ڈیئر سسٹر!" اس نے نادیہ کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

"زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"اور زندگی کی سب سے زیادہ قابل فخر بات یہ ہے کہ تم میری بہن ہو۔" جواب میں سعد نے کہا تھا۔ "مشکل اور ناموافق ترین حالات میں سر بلند رکھ کر جینے والی میری پیاری بہن! مجھے تم پر فخر ہے۔" اس نے نادیہ کو خود سے علیحدہ کر کے اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کا سر سہلایا تھا۔

"چلو اب تمہاری فلائٹ میں تھوڑا وقت باقی ہے۔" پھر اس نے نادیہ کو دونوں شانوں پر ہاتھوں سے دباؤ ڈال کر اسے ہمت باندھنے کا اذن دیتے ہوئے کہا۔

"اگلی بار جب ہم یہاں ملیں گے تو میرا وعدہ ہے میں تمہیں فینٹم آف اوپیرا بھی ضرور دکھاؤں گا۔ اس بار وقت کم تھا۔" اس نے اسے بچوں کی طرح بہلایا تھا۔ جواب میں نادیہ ایک زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرائی تھی۔

"ایک بار پھر جدائی۔" اس رات واپس ہیلسنکی جاتے ہوئے نادیہ نے سوچا "اور اس بار نجانے کتنے ماہ و سال کے لیے۔"

☼ ☼ ☼

ماہ نور نے ایک سوشل ویب سائٹ پر اپنا اکاؤنٹ کھول رکھا تھا۔ سید پور میلے کے میوزک فیسٹول کے گانے سنتے ہوئے وہ اپنے لیے آنے والے نوٹیفکیشنز دیکھ رہی تھی۔ اسی دم اسے اس ویب سائٹ پر بنے مختلف کمپنیوں کے صفحات کے اشتہار نظر آئے۔ انہی اشتہارات میں ایک صفحہ اسلام آباد میں واقع "چیریاکس ریسٹورنٹ" کا بھی تھا۔ ماہ نور نے وہ صفحہ کھول کر اس کی تفصیلات دیکھیں اور اسے اپنے پسندیدہ صفحات میں شامل کر لیا۔ اس صفحے پر ریسٹورنٹ کی تمام معلومات دی گئی تھیں اور اس سے رابطہ کرنے کے لیے فون نمبر بھی موجود تھے۔

ایک دم ماہ نور کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے سرعت سے قریب رکھا سیل فون اٹھایا اور اس صفحے پر دیے گئے ریسٹورنٹ کے نمبروں میں ایک نمبر ملانے لگی۔ تین' چار' بار بیل جانے کے بعد دوسری طرف سے کال وصول کر لی گئی۔ ماہ نور نے ریسٹورنٹ کا نمبر ہونے کی تصدیق کر لینے کے بعد ریسٹورنٹ کے مالک ابراہیم سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"آپ دوسرے نمبر پر کوشش کریں۔" جواب میں اسے یہ الفاظ سننے کو ملے۔ اس نے فون بند کر کے دوسرا نمبر ملایا۔ اس بار چوتھی بیل پر فون اٹینڈ کر لیا گیا۔

"مجھے چیریاکس کے مالک ابراہیم صاحب سے بات کرنی ہے؟" ماہ نور نے تیزی سے کہا۔

"جی فرمائیے! میں بات کر رہا ہوں۔" دوسری جانب سے کہا گیا۔ ماہ نور کو چند لمحوں تک اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ابراہیم صاحب! آپ کے دوست سعد سلطان کہاں ہیں؟" مزید کوئی بات کیے بغیر اس نے وہ سوال کیا' جسے کرنے کے لیے وہ یہ کال کر رہی تھی۔

"آپ کون؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"میں ماہ نور ہوں۔ آپ نے سعد کے ساتھ مجھے اپنے ریسٹورنٹ میں انوائٹ کیا تھا۔" اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے ابراہیم کو یاد دلایا۔

"اوہ ۔۔۔ اچھا۔" دوسری جانب سے پہچان لیے جانے پر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ اس بہروپیے کی چالاکیوں سے پردہ اٹھتا تھا۔ "سعد تو ملک میں نہیں ہے' وہ ایک ٹریڈ فیئر کے سلسلے میں فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔ آپ کو اس نے ۔۔۔"

ابراہیم کی بات درمیان ہی میں کٹ گئی اور فون سے ٹوں ٹوں کی آواز آنا شروع ہو گئی مگر ماہ نور اس آواز کو نہیں سن رہی تھی۔ اس کا ذہن اور کان ایک ہی جملے پر اٹک گئے تھے۔ "سعد تو ملک میں نہیں ہے' وہ ایک ٹریڈ فیئر کے سلسلے میں فرینکفرٹ گیا ہوا ہے۔"

وہ یک ٹک سامنے کی دیوار کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"عبدالرحیم ڈھاکہ گیا ہوا تھا' جب صاحب پچھلی بار یہاں آئے۔" طفیل نے سعد کو بتایا۔

"اسی لیے وہ گھر کے بجائے ہوٹل میں ٹھہرے۔ یہاں انہیں عبدالرحیم کے بنائے ہوئے سی فوڈ کی کھینچ ہی تو لے آتی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

طفیل اس گھر کا ہاؤس کیپر تھا جو ڈیڈی نے لندن میں خرید رکھا تھا۔ دو سال پہلے ان کو کاروبار کے سلسلے میں اکثر یہاں آنا پڑتا تھا' اسی لیے انہوں نے یہ گھر خریدا تھا۔ طفیل پاکستانی تھا جو کئی سال پہلے لندن آبسا تھا۔ طفیل کی شکل میں ڈیڈی کو بہترین ہاؤس کیپر مل گیا تھا۔

طفیل اور اس کی بیوی شاہدہ گھر کی دیکھ بھال کرتے تھے اور عبدالرحیم نے گھر کا بہت خوبی سے خیال رکھا ہوا تھا۔ اب ڈیڈی اور وہ خود کافی عرصے بعد ادھر آتے تھے اس لیے گھر کے دو تین کمرے بند ہی رہتے تھے۔

"ابھی کل ہی میں نے صاحب کے کمرے کی صفائی کروائی۔"

طفیل سعد سے کہہ رہا تھا جو لندن میں دو روز قیام کی آخری رات گزارنے یہاں آیا تھا۔

"ان کی کچھ فائلز یہاں رکھی ہیں' اب آپ آئے ہو تو ایک نظر دیکھ لو..... اگر اب وہ اتنی اہم نہیں رہیں تو ان کو ضائع کردیا جائے۔" طفیل کی بیوی شاہدہ نے سعد سے کہا۔

سعد اپنے گھر میں کبھی ڈیڈی کے کمرے میں نہیں گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ شاہدہ کی بات مان کر ان کے کمرے میں جا کر وہ فائلز دیکھے یا وہیں منگوا کر انہیں دیکھ لے۔

"اور سال پیچھے جو پھوٹو (فوٹو) صاحب نے ریجنٹ اسٹریٹ سے بنوایا تھا' وہ ام (ہم) نے بڑا کروا کر کے صاب کے کمرے میں لگوایا ہے وہ بھی دیکھ لیں۔" عبدالرحیم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اسے ناچار ڈیڈی کے کمرے میں آنا پڑا۔ کمرے کا فرنیچر سادہ مگر قیمتی تھا۔ بائیں دیوار پر وہ تصویر فریم میں سجی تھی جو عبدالرحیم اس کو دکھانا چاہ رہا تھا۔

اس نے سرسری نظر تصویر پر ڈالی اور طفیل کی بتائی فائلز دیکھنے لگا۔

"طفیل بھائی! یہ سب ہی تقریباً" غیر اہم ہیں' ان کو بے شک ضائع کروا دیجیے۔" وہ وہیں کھڑا کھڑا ایک کے بعد ایک فائل دیکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی بھی نہیں چاہیے۔" اس نے سر اٹھا کر طفیل کی طرف دیکھا اور فائلز ٹیبل پر رکھ دیں۔

اسی دوران اس کی نظر انہی فائلز کے نیچے رکھے ایک فولڈر پر پڑی۔ یہ فولڈر باقی فائلز سے شکل میں مختلف تھا۔ اس نے بے دھیانی سے فولڈر کا کور کھولا اور بری طرح چونک گیا۔ فولڈر کے اندر موجود ایک چھوٹے فولڈر پر سنہری حروف میں الفاظ درج تھے۔

My Portfolio
From
Filza Zahoor
(میرا فنکارانہ کام..... فلزا ظہور)

سعد نے وہ فولڈر اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ذرا سوچیے

ہما خان

بقر عید میں صرف دو دن باقی تھے۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ قربانی کے جانوروں کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ شاپنگ سینٹرز میں بھی بے تحاشا رش تھا۔ اس وقت بھی شام کے تقریباً" پانچ بجے تھے۔ مہوش اپنے دو بچوں اور سہیلی رابعہ کے ساتھ شاپنگ کر کے لوٹی تھی۔

"شکر ہے خدا کا۔ یہ شاپنگ کا مرحلہ بھی اختتام کو پہنچا۔" مہوش نے کہا۔

"ہاں بھئی! اب تو عیدالفطر کی طرح عید قرباں پر بھی کپڑوں اور جوتوں کی پوری تیاری کرنی پڑتی ہے۔" رابعہ نے تائید کی۔

"کیا کریں مجبوری ہے۔ زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا پڑتا ہے۔ جب سب ہی عید پر نت نئے اور اچھے اچھے کپڑے پہنتے ہیں تو ہم کیوں کسی سے پیچھے رہیں اور اگر ایسا نہ کریں تو ڈر ہے کہ بچے کہیں احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائیں۔"

"بالکل! ٹھیک کہا تم نے' میری بھی یہی سوچ ہے۔" رابعہ نے اس بار بھی بھرپور تائید کی۔ "ویسے یار! اس دفعہ سارے وہی پرانے اور گھسے پٹے ڈیزائن تھے۔ اسی لیے میں نے اپنے اور ردا کے کپڑے بوتیک سے لیے ہیں' تاکہ کچھ تو مختلف اور منفرد نظر آئیں۔ بس! اسی چکر میں تھوڑا بجٹ آؤٹ ہو گیا ہے۔" مہوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم نے لیے جو سب کے دو' دو سوٹ ہیں اور پھر ان کے ساتھ میچنگ کی جیولری اور جوتے وغیرہ بھی۔" رابعہ نے یاد دلایا۔

"ہاں! پہلے دن میرے میکے میں دعوت ہوتی ہے اور دوسرے دن سسرال میں ... تمہیں تو پتا ہے میری بڑی بھابھی' میری نند بھی ہیں اور میری جیٹھانی میری تایازاد بہن بھی لگتی ہے اس لیے دونوں دعوتوں میں ایک ہی سوٹ نہیں چل سکتا۔" مہوش نے مجبوری بتائی۔

"امی! بھوک لگ رہی ہے' کھانا دیں۔" مہوش کا بارہ سالہ بیٹا اولیس ٹیوشن پڑھ کر لوٹا تھا۔

"اوہو! کھانا تو ابھی تیار نہیں ہے' تم ایسا کرو! سب کے لیے برگر یا بریانی لے آؤ۔ کولڈ ڈرنک کے ساتھ اور ہاں! واپسی میں سامنے والی آنٹی کے ہاں سے ماسی کو بلا لانا' اس کو بتا دینا کہ میں گھر واپس آچکی ہوں۔ وہ بھی آکر کام نمٹا دے۔" مہوش نے بیٹے کو ہزار کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا مہوش! میں بھی اب چلتی ہوں۔ تمہارے ساتھ ساتھ میری بھی آج اچھی خاصی شاپنگ ہو گئی ہے۔ اب گھر کا کام بھی دیکھ لوں۔" رابعہ گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھنے لگی۔

"ارے نہیں! اویس برگر لے کر بس آتا ہی ہو گا۔ تم کھا کر ہی جانا۔" مہوش نے اسے روک لیا۔

"چلو اچھا! تھوڑی دیر اور رک جاتی ہوں ورنہ گھر پر میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ بقر عید پر تو کام دو دن پہلے شروع ہو جاتے ہیں اور عید کے کئی دن بعد تک رہتے ہیں۔ ہمارے گھر قربانی کا جانور بھی آچکا ہے' اس کا الگ پھیلاوا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

"ہاں! یہ تو ہے۔ تمہارے گھر قربانی ہوتی ہے اس لیے کام بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ویسے سچ' کبھی کبھی تو میرا بھی بہت دل چاہتا ہے کہ ہمارے گھر بھی قربانی ہو' مگر کیا کریں' مہنگائی اتنی زیادہ ہے کہ گنجائش ہی نہیں نکل پاتی۔ کیا بتاؤں' کیسی مجبوری سی مجبوری ہے۔ بڑھتی مہنگائی' اخراجات' لگی بندھی آمدنی اور قرضوں نے جیسے جکڑ رکھا ہے چاروں طرف سے۔ ابھی بھی دیکھو! تمہارے ساتھ جاتے ہوئے پرس بھر کر پیسے لے کر گئی تھی' پھر اے ٹی ایم سے مزید پیسے نکالنے پڑے۔ دو ماہ پہلے بھی عید الفطر پر اسجد کو آفس کے ایک دوست سے ادھار لینا پڑا تھا۔ جو اب تک واپس نہیں ہو سکا ہے۔" مہوش کے پاس تو گویا مسائل کا انبار تھا۔

اتنی دیر میں اویس بھی برگرز اور کولڈ ڈرنک لیے اندر داخل ہوا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی رابعہ بھی واپس اپنے گھر چلی گئی اور کام والی ماسی بھی آگئی۔ ماسی گھر کے برتن دھونا' کپڑے دھونا' جھاڑو پوچھا اور ڈسٹنگ "تقریباً" تمام کام ہی کرتی تھی۔

یہ نئی ماسی تھی۔ مہوش نے اسے "تقریباً" تین ماہ قبل ہی رکھا تھا۔ یہ پرانی ماسی سے زیادہ اچھی اور پھرتیلی تھی۔ ہمیشہ صاف ستھری رہتی اور کبھی کسی چیز یا ادھار کا تقاضا نہیں کرتی تھی۔ مہوش ہر طرح سے اس سے مطمئن تھی۔

"نجمہ! آج ذرا پنکھے صاف کر دینا اور جالے بھی اتار دینا۔" مہوش نے ماسی سے کہا۔

"جی اچھا باجی!"

"اور ہاں! یہ تو بتاؤ کہ تم بقر عید کی چھٹی تو نہیں کرو گی نا؟ دیکھو! عید کے دن سب سے پہلے میرے گھر آجانا' کیونکہ مجھے جلدی اپنے میکے جانا ہوتا ہے۔ وہ ہماری دوپہر کے کھانے پر ہی دعوت ہوتی ہے۔"

"نہیں باجی! بقر عید کے دن تو میں نہیں آسکتی۔ دوسرے دن آجاؤں گی' مگر پہلے دن تو میرا آنا ممکن نہیں ہے۔" ماسی نے قطعیت سے کہا۔

"وہ کیوں؟" مہوش کو اس کا صاف انکار ناگوار گزرا۔

"باجی! میرے اپنے گھر قربانی پہلے دن ہوتی ہے۔ میں کیسے آسکتی ہوں؟"

"اچھا! تو تم اتنی استطاعت رکھتی ہو کہ قربانی کر سکو؟" وہ حیران ہوئی۔

"بس باجی! میں کیا اور میری بساط کیا' لیکن میرے اندر قربانی کا سچا جذبہ ہے۔ پورے سال بچت کر کر کے کمیٹی ڈالتی ہوں اسی کے لیے۔ چھوٹا ہی سہی' مگر قربانی کا جانور یا گائے کا حصہ ضرور لیتے ہیں ہم لوگ۔۔۔ بس باجی! میری نیت تو بالکل سچی ہوتی ہے۔ اللہ پاک قبول فرمائے' آمین۔" ماسی نے سچائی سے کہا۔

"چلو! پھر تو قربانی کا گوشت بھی خوب تین' چار مہینے مزے سے چلاتے ہو گے تم لوگ۔" مہوش نے جتلایا۔

"نہیں باجی! ہمارے گھر فریج ہی نہیں ہے۔ ہم لوگ ایک دو دن کا گوشت رکھ کر باقی رشتے داروں میں پڑوسیوں میں اور جس مدرسے میں میرا بیٹا حفظ کر رہا ہے' ادھر بھجوا دیتے ہیں۔"

ماسی کے چہرے اور انداز میں صرف سادگی ہی سادگی تھی۔ مہوش نے تمام شاپرز بے دلی سے سمیٹے اور الماری کے اندر رکھ دیے۔ اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر سوچنے کے لیے بہت کچھ تھا۔

✡

سائرہ رضا

محبت کہانی زندگی کی کہانی

"آپ بس سیدھی سیدھی کہانی لکھیے نا۔"

"سیدھی۔۔۔ سیدھی۔" میں نے بھنوئیں سکوڑ کر اس کی صورت دیکھی۔ "یہ سیدھی سیدھی کہانی کیسی ہوتی ہے۔۔۔ رومانٹک ہوتی ہے' ٹریجک ہوتی ہے' کامیڈی۔۔۔ تھرل۔۔۔ یہ سیدھی کہانی کیسی ہو گی۔"

"اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟" وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگی۔

"جیسے سمجھا سکتی ہو۔۔۔ ویسے سمجھاؤ۔ شاید میں کوئی نتیجہ اخذ کر سکوں۔" میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

"میرے پاس تو اتنے جملے نہیں۔۔۔ مثالیں بھی نہیں۔۔۔ مگر۔۔۔ میں نے اب تک جو بھی کہانی پڑھی وہاں یا تو بہت دولت ہوتی ہے کہ بس محبت ہی کرنی باقی ہوتی ہے یا اتنی غربت کہ بس نفرت رہ جاتی ہے۔ محبت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ لکھنے والے کے پاس درمیان

کیوں نہیں ہوتا۔ خوشی ہوگی تو بے حد دکھ ہوں گے تو توبہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ مظلوم یا ظالم۔۔۔ جبکہ ہر انسان کسی نہ کسی موقع پر مظلوم بھی ہوتا ہے اور ظالم بھی اور۔۔۔"

"ارے۔۔۔!" میں بڑے غور سے اسے سن رہی تھی، چونک کر اسے ٹوک گئی۔

"اتنی خوب صورت بات، واہ! تم سے امید نہیں تھی۔" وہ بری طرح جھینپ گئی۔ مگر اگلے ہی پل اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

"لوگ ہمیشہ یہ ہی سوچتے ہیں کہ کوئی بھی اچھی بات کسی اونچی جگہ ہی سے آئے گی، پڑھے لکھے اعلا بندے کی جانب سے۔ اللہ نے سب کو ذہن و دل دیا ہے۔ دنیا دیکھنے کے لیے آنکھیں، عقل کی بات تو کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

وہ دکھ کی نئی سڑک پر چڑھ گئی۔

"بس کرو۔ اب کھرے فلسفے اور دنیا کی بے ثباتی کے دکھڑے رونے نہ بیٹھنا۔ سیدھے سیدھے۔۔۔ سیدھی کہانی لکھنے کا فارمولا بتاؤ۔ اب تک تو میں کسی کی بھی ہدایات کے بغیر یوں ہی اندھا دھند لکھے جا رہی تھی، اب ایک رہنما ملا ہے تو۔" میں نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"نہیں، آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔" وہ حسبِ عادت عقیدت مندی سے دہری ہو گئی۔

"میری مدح سرائی بعد میں کرنا، پہلے اپنی بات مکمل کرو۔ اتنا تو میں سمجھ گئی، مجھے مڈل کلاس پر لکھنا ہے، اب آگے بولو۔"

"خالی مڈل کلاس نہیں۔" وہ دوبارہ متحرک ہو گئی۔
"ہر چیز درمیانی ہو اعتدال میں۔ نہ غربت، نہ امارت، مگر خوشی ہو۔ صبر شکر ہو، ہر شے نارمل ہو۔" آپ ہیروئن کا حسن ایسا بتاتے ہیں جیسے حور ہو۔ میں تو روز صبح گھر سے نکلتی ہوں۔ روزانہ اتنی لڑکیوں سے ملتی ہوں۔ خدا کی قسم! سب اچھی ہوتی ہیں، کسی کی آنکھیں اچھی ہیں، تو کسی کے بال، مگر جیسی تشبیہات کہانیوں میں ملتی ہیں، ویسی تو کبھی نظر نہ آئیں۔"

"ٹی وی میں ملتی ہیں، ناہر صبح ایک سے ایک چہرہ سجا بنا۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"میں نے تو سالوں سے صبح کے وقت ٹی وی دیکھا ہی نہیں۔۔۔ مگر وہ جو سب صبح صبح آتی ہیں بلکہ سارا دن رات تک، وہ لڑکیاں تھوڑا ہی ہوتی ہیں۔ پلاسٹک کی گڑیاں ہوتی ہیں۔ نہ کھل کر ہنستی ہیں، نہ روتی ہیں۔ سجی بنی شوکیس کے اندر، اصلی لڑکیاں ایسی تھوڑی ہوتی ہیں؟"

"پھر کیا اصلی لڑکی شفا جیسی ہوتی ہے؟"

"ہاں بالکل شفا جیسی ہوتی ہے۔ تھوڑی موٹی، تھوڑی کالی، تھوڑی پریشان، تھوڑی خوش، محنت کرتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی۔"

"یہ تو ہے۔" میں نے فوراً تائید کی۔ "ہیروئن نہ کالی ہو نہ گوری، نہ لمبی، نہ موٹی۔ چھوٹی پھر بھی اچھی لگتی ہے جیسے کہ تم۔"

"ہونہہ!" وہ جھینپی۔

"نہ دولت مند ہو، نہ بہت فقیر۔ محنت کرتی ہو اور تھوڑے بہت پر خوش رہتی ہو جیسے کہ تم۔"

اس بار وہ قطعاً نہ شرمائی، بلکہ خود اعتمادی سے سر اثبات میں ہلایا۔ "بالکل!"

"اور ہیرو؟ ہیرو پر بھی کچھ شرائط لاگو ہوتی ہیں کہ نہیں؟"

"اللہ! ہیرو کا تو نام ہی مت لیں۔ اسے تو پتا نہیں کیا بنا کر پیش کیا جاتا ہے، مکمل جامع، جیسے میتھس کے نمبر، دس بٹا دس۔" اس کی ہنسی میں میری ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

"اونچا لمبا، گورا، رحم دل، پڑھا لکھا، دولت مند تو نہ پوچھیں۔ اتنے دیوتا تو پورے یونان میں نہ ہوں گے جتنے اب تک آپ لوگ متعارف کروا چکی ہیں۔" وہ خفگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ہیرو کو تو عام انسان ہونا چاہیے۔ عام روڈ پر کھڑا ہونے والا شخص۔ سانولا، لمبا، بس کا ڈنڈا پکڑ کر سفر کرنے والا یا پھر چھت پر بیٹھا ہوا، محنت کرتا ہوا، غصہ بھی کرتا ہو، ہنستا بھی ہو اور آپ لوگ، اف۔۔۔! عام سا

انسان کیوں نہیں پیش کرتیں۔"

"لوگ ماریں گے۔ پڑھنے والیاں کہیں گی، ایسے ناہنجار تو گلی گلی ملتے ہیں اور ہمیں بھی ایسے ہی ملتے ہیں، کم از کم ہیروئن کو تو ایسا نہ ملے، کوئی تو بامراد رہے۔"
میں نے انسانی فطرت کی خوش گمانی سے آگاہ کیا۔

"دبلا پتلا، کالا لمبا، بہت کم آمدنی، مگر خوب محنت کرنے والا ہیرو کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس کے چہرے پر غم اور ناامیدی پھیل گئی۔

"ہو سکتا ہے، کیوں نہیں ہو سکتا۔" میں نے فوراً تسلی دی۔ "کالا، لمبا، دبلا، محنتی۔" میں نے اس کی بتائی خوبیاں دہرائیں۔ "جیسے۔۔۔ جیسے شفاعت۔۔۔"

"اللہ!" میرے تکے پر اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ "آپ نے اس کا نام کیوں لیا؟"

"تو کیا نہیں لینا چاہیے تھا۔ دیکھو! عام سی لڑکی، مگر خاص لگتی ہو، جیسے شفا۔۔۔" عام سا لڑکا، کالا سا، لمبا، بہت محنتی، جیسے شفاعت۔۔۔ کہانی تو بنتی ہے یار! اب خوامخواہ منہ لٹکا کر کیوں بیٹھی ہو، تمہارے بتائے خاکے سے جو شبیہ ابھرتی ہے، وہ تو یہی ہے۔" میں نے شانے اچکا کر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ بھی نا بس۔۔۔" وہ اپنے پرس کی ڈوری کندھے پر جماتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ "بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں، خوامخواہ۔"

"بی بی! پر کا کوا بنانا اور دریا کو کوزے میں بند کرنا ہم لکھنے والوں کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اللہ کا ودیعت کردہ ہے یہ ہنر، الحمد اللہ!"

مگر شفا اور شفاعت عام سی زندگی کے عام سے کردار۔ ان کرداروں کو لے کر جو کہانی بنی جائے گی، اسے محبت کہانی کہا جائے گا، ایک دم خاص کہانی، سمجھیں۔

☼ ☼ ☼

میرا شفا سے تعارف ایک دردناک چیخ سے ہوا۔ میں اپنے ٹیرس پر براجمان قلم کو کاغذ پر نچا رہی تھی، جب تصور بھٹکا، رقص کرتا قلم چونکا اور اس کے بے ڈھنگے قدم نے کاغذ پر لکیر کھینچ دی۔

میں نے نیچے جھانکا تو ایک لڑکی زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھی تھی اور اس کے پیر سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ جوتی لتھڑ گئی تھی اور کچی مٹی پر سرخی کی نمی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں سر پر دوپٹا کستی دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتری۔ شام کے سات بجے اس جانب کوئی نہیں تھا۔ کانچ شاید گوشت کے اندر تک دھنس گیا تھا۔ پہلی زوردار چیخ کے بعد وہ دبی دبی سسکیاں بھر رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو اور پورا جسم پسینے پسینے تھا۔ میرے لیے یہ دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔ مگر ایسے لمحے میں ہمت نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور ایک جھٹکے سے لمبا کانچ باہر کھینچ لیا۔ اس نے چیخ کو روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ جما لیا تھا۔ خون بہنے کی رفتار بڑھ گئی، مگر اب خطرہ نہیں تھا۔ میں اس کے لاکھ منع کرنے پر اسے سہارا دیے اندر لے آئی تھی۔

"ابھی میرا بیٹا آئے گا تو تمہیں بائیک پر چھوڑ دے گا۔ ایسے کیسے جاؤ گی؟" وہ متامل ہوئی۔

"اچھا رکشا لا دے گا۔" میں نے حل پیش کیا۔
"اگر ہمت ہو تو اوپر آجاؤ، میں چائے بنا کر دیتی ہوں، نانی بس آتا ہو گا۔"

وہ سرہلاتی ریلنگ کا سہارا لیے اوپر آگئی۔ میں نے زخم دھو کر اچھی طرح سے پٹی باندھ دی۔ اس نے کرسی پر ٹکتے ہوئے میری ہدایت پر اپنا اسکارف اتار دیا اور گاؤن کے بٹن کھول دیے۔

میں چائے بناتے ہوئے اس کا گہرا جائزہ لے رہی تھی۔

وہ نہ تو گندمی تھی، نہ سانولی۔ جسم بھرا بھرا سا۔ مناسب چوٹی پشت پر گری تھی۔ آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں کچھ تھا، جو متوجہ کرتا تھا۔ حزن، سوچ، ٹھہراؤ۔ مٹی پر گر جانے کے باعث سیاہ گاؤن بالکل مٹی مٹی تھا اور اپنی رنگت بدل چکا تھا۔ وہ وائل کے مسٹرڈ سیاہ سوٹ میں اپنی حیثیت کا تعین کروا رہی تھی۔
میرا قیاس تھوڑی دیر بعد درست ثابت ہوا، وہ کسی

گارمنٹس فیکٹری میں کام کرتی تھی۔

مجھے اندازہ ہوا' وہ بھوکی بھی ہوگی۔ میں نے نوی اور ثانی کے لیے بنائے سینڈوچز بھی ٹرے میں رکھ دیے۔ ساتھ ہی کباب اور چائے بھی۔ پھر ایک پلیٹ میں سیب بھی رکھ دیے۔

اچانک اس کی چیخ کی آواز پر میں حواس باختہ باہر لپکی۔ اس کے ہاتھ میں ہفت روزہ میگزین اور میرا لکھا ہوا کاغذ تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پوری کھلی تھیں اور تھرتھراتے لبوں سے فقرہ ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا۔

"آپ۔۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ لہرائے' میگزین اور کاغذ۔ "آپ۔۔ آپ سحر راغب ہیں۔۔ یہ والی سحر راغب؟"

ظاہر ہے' مجھے جواب اثبات ہی میں دینا تھا۔

"ہاں!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جرم کا اقرار کیا۔

"مم۔۔ مم۔۔ مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ بے یقینی کی انتہاؤں پر تھی۔

"تو یقین دلانے کے لیے اب کیا کروں؟" میں مسکرائی۔

"کک' کچھ نہیں' مجھے یقین آگیا۔" اس نے بمشکل اپنی ہکلاہٹ پر قابو پایا۔

"وہ میگزین کے اندر یہ کاغذ تھا' میں نے بس یوں ہی رکھتے رکھتے پڑھ لیا تو۔۔ آپ اگلی قسط لکھ رہی ہیں نا۔" اس نے کچھ شرمندگی سے وجہ بتائی۔

"او کے۔۔ تم اسے رکھو اور یہ کھاؤ' بھوک کا ٹائم ہے اور کمزوری بھی ہو رہی ہوگی نا۔"

"میں سب کو بتاؤں گی گھر میں' میرے زخم پر مرہم آپ نے لگایا۔"

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے ادبا نے لگایا ہو۔"

"ادبا کا نام کیوں لیا۔ وہ کب سے مرہم لگانے لگا۔ وہ تو زخم دینے والے لوگ ہیں۔" اس نے ایسا منہ بنایا جیسے منہ میں نمبولی آگئی ہو۔

"واؤ۔۔!" میں متاثر ہوگئی۔ "تم باتیں بہت اچھی کرتی ہو۔ میری اسٹوری واقعی پڑھتی ہو یا گیس لگایا ہے؟"

"میں پڑھتی ہوں۔ ہر ہفتے' ہم سب پڑھتے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا۔ میرے چہرے پر حیرانی دیکھ کر وہ سرعت سے وجہ تک پہنچی۔

"آپ صحیح سوچ رہی ہیں۔ میگزین مہنگا ہے' خریدنا مشکل ہوتا ہے۔ میرا بھائی ہاکر ہے نا' اخبار اور میگزین ڈالتا ہے تو اس لیے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" مجھے یقین آگیا۔

"فیکٹری میں نائن ٹو فائیو کام کرنے اور کبھی اوور ٹائم کے بعد تو بالکل وقت نہیں ملتا مگر میں پڑھنے کے لیے یا کم از کم دیکھنے کے لیے ٹائم ضرور نکال لیتی ہوں۔" اس نے اپنے تئیں سب کچھ واضح کیا۔ "بارہ جماعت پاس ہوں میں؟" اس کے انداز میں تفاخر آگیا۔

"مگر تم زیادہ قابل لگتی ہو۔" میں نے سچائی بیان کی۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"میں سب کو بتاؤں گی کہ۔۔ دراصل میں نے آج تک کسی لکھنے والے کو دیکھا تک نہیں کہ۔۔" وہ تذبذب میں گھری۔

"کہ وہ انسان ہی ہوتے ہیں نا!" میں نے جملہ مکمل کیا۔

"نہیں' نہیں ایسی بات نہیں۔ ابھی مجھے چوٹ لگی تو میں نے سوچا آج بہت برا دن تھا اور اب میں کہہ رہی ہوں کہ آج میری زندگی کا سب سے اچھا دن ہے۔ انسان اپنے خیالات کتنی جلدی بدل لیتا ہے نا۔" وہ اپنی بات کے اختتام پر ہنسی۔

"بالکل بدل لیتا ہے مگر میری ایک بات کو درخواست سمجھو یا حکم یا کچھ بھی۔ پلیز میرے سحر راغب ہونے کا چرچا مت کرنا۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"وہ کیوں؟" وہ متحیر تھی۔

"بس ہے کوئی وجہ' کبھی بتاؤں گی۔"

"تو کیا ہم دوبارہ ملیں گے؟" وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ کھا گئی۔

"کیوں کیا ہم دوست نہیں بن گئے۔"

"کب؟" اس کے ابھرتے سر کو جیسے میں نے ایک اور غوطہ دیا۔

"ابھی جب میں تمہیں سہارا دے کر اوپر لا رہی تھی۔ سہارا دوست ہی دیتے ہیں نا۔"

"مگر میں تو بہت عام سی لڑکی ہوں اور آپ۔۔"

"میں تم سے بھی زیادہ عام ہوں' سمجھیں! چلو چائے لو۔"

"آپ کے گھر میں کون' کون ہے؟"

"میرے میاں اور دو بیٹے بس۔ میاں کام پر اور بیٹے کوچنگ۔ جڑواں ہیں اور میٹرک میں ہیں۔"

"اتنے بڑے بچے۔۔"

"نہیں۔۔ لیے تو چھوٹے تھے مگر رکھے رکھے بڑے ہوگئے۔" اس کے کھلے منہ اور جملے کے تحیر نے مجھے بھی متحرک کر دیا تھا۔ میں نے اسے چھیڑا۔

"ہائیں!" وہ حق دق رہ گئی۔

پھر میری شریر ہنسی میں اس کی جھینپی جھینپی سی ہنسی شامل ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

وہ اکثر تو نہیں مگر آنے لگی اور مجھے اس کا آنا اچھا لگتا تھا۔

"جب کبھی آپ کو کچھ لکھنا ہو تو مجھے بتا دینا۔ ایسا نہ ہو کہ میں آپ کا ٹائم خراب کرتی رہوں۔"

"ایسا بالکل نہیں ہے اور اگر کبھی ہوا تو میں بتا دوں گی۔"

دراصل اس کی باتیں مجھے اچھی لگنے لگی تھیں۔ وہ مجھے اس دنیا کی جھلک دکھلا رہی تھی' جو شاید میری نظروں سے اوجھل تھی۔ میرا اپنا تعلق مڈل کلاس سے تھا مگر وہ غربت کی لکیر کے نیچے رہنے والوں کے اصل سے واقف تھی اور اس کی واقفیت میرے بہت کام کی تھی۔

غربت کے بارے میں میری معلومات قیاس' قیافے تک محدود تھیں' جبکہ وہ آپ بیتی سنایا کرتی تھی' دکھایا کرتی تھی۔

اس کے پاس گنتی کے چند جوڑے تھے۔ عام سے گھر کے سلے' آڑی سیدھی سلائیوں والے۔ سستا کپڑا' چند روپے گز کے ربن' فیتے' ڈیڑھ دو سو والی جوتی' دو سو والا پرس۔ البتہ اس کا سیاہ گاؤن نیا صاف ستھرا اور چمک دار ہوتا تھا' میں نے تعریف کی تو اس نے مجھے حق دق کر دیا۔

"روز' روز فیکٹری جانا ہوتا ہے۔ اب اتنے کپڑے تو بنائے نہیں جا سکتے' میں اکثر ایسی لڑکیوں کو جانتی ہوں جو اتوار بازاروں سے استعمال شدہ کپڑے خرید لیتی ہیں۔ گھسی پٹی جوتیاں' ہاں گاؤن اچھا چڑھا لیتی ہیں۔ آپ کبھی دیکھیے گا' سر سے پیر کے تلوے کو چھوتا سیاہ حجاب ہر شے کو چھپا لیتا ہے۔ بہت سی تو اندر کام کرتے ہوئے بھی حجاب نہیں اتارتیں۔ گاؤن سب کے نئے چمکیلے ہوتے ہیں۔"

"تو اتنی محنت کا کیا فائدہ؟ اپنے لیے دو جوڑے بھی نہ بنا سکیں۔ تنخواہ کہاں جاتی ہے۔"

"تنخواہ!" وہ استہزائیہ ہنسی۔ "یہ وہ ملازمت نہیں ہوتی جو شوقیہ کی جائے جوڑے بنانے کے لیے۔ ہمیں تو یومیہ اجرت۔۔۔ مزدوری ملتی ہے۔ کچھ مہینے بھر کی مزدوری پرچون کو بقایا میں دے آتی ہیں۔ کچھ کمیٹیاں بھرتی ہیں۔ کچھ جہیز کے لیے جو سی مشین اور بیڈ شیٹس خرید کر لے آتی ہیں۔ کچھ نکمے شوہروں کی اولادوں کو پالتی ہیں۔ ہر لڑکی کے گھر میں یتیم بھانجے' بھانجیاں یا بھتیجے' بھتیجیاں ہوتے ہیں۔ کچھ سالوں میں ہمارے ملک میں بچے پیدا کم ہوئے اور یتیم زیادہ۔۔

آپ کو پتا ہے' کائنات اپنے اصل کو واپس پلٹ کر پھر انجام کو پہنچے گی۔ زمین کے آغاز پر انسان کم تھے۔ انجام تک پہنچتے پہنچتے بھی انسان کم کر دیے جائیں گے۔ دہشت گردی سے' سیلابوں' طوفانوں سے' بھوک و افلاس سے مار دیا جائے گا۔ گاجر مولیوں کی طرح کاٹ دیے جائیں گے۔ انسان پیدا ہوا تو جسم ڈھانپنے کے علم سے ناواقف تھا۔ مادر پدر آزاد گھومتا تھا۔ پھر شاید اس پر اپنی بدہیئتی نمایاں ہوئی ہوگی تو چے

باندھنے لگا۔ پھر عقل و علم بڑھا تو سر تا پیر لباس میں چھپ گیا۔ زیادہ علم و عقل دماغ پلٹا دیتی ہے۔ اب پھر سے پتے باندھنے پر آگیا ہے' ننگا گھومنے میں فخر کرتا ہے۔

آپ دیکھئے گا سحر جی! ابھی صرف دوپٹا غائب ہوا ہے' شاید ہم اس وقت نہ ہوں اور اللہ کرے نہ ہی ہوں جب دوپٹے کے بعد قمیص اور ..... جانے دیں۔ دراصل انسان دوبارہ روز اول کی طرف لوٹ رہا ہے' جب وہ صبح اٹھ کر خوراک کی تلاش میں بھٹکتا تھا۔ جان توڑ محنت کے بعد اسے اتنا کم کھانا حاصل ہوتا تھا کہ اسی پریشانی میں مبتلا ہو جاتا تھا کہ خود کیا کھائے اور گھر کیا لے کر جائے اور ابھی کل کے لیے بھی تو بچانا ہے۔ اتنے کم کو اتنے حصوں میں کیسے تقسیم کرے گا اور پھر کل ملے نہ ملے.....

ہم ڈیلی ویجز پر کام کرنے والے لوگ بھی اسی ننگے تڑنگے وحشی انسان کی طرح ہیں۔ جان توڑ محنت کرتے ہیں اور معاوضہ اتنا کم ملتا ہے کہ کسی خانے میں بھی فٹ نہیں بیٹھتا۔ ہمارے پاس بھی لباس نہیں ہوتا۔ ہم بھی پتے یعنی یہ چیتھڑے باندھتے ہیں اور ہمیں بھی کل کی فکر ہوتی ہے کہ پتا نہیں کل شکار ملے گا کہ نہیں ملے گا۔ ہڑتال' بلاوجہ فائرنگ' کرفیو' پہیہ جام' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ایک بات کہوں شفا! تم اس روز کہہ رہی تھیں کہ میرا تمہیں ملنا تمہاری زندگی بدل دے گا۔ پتا نہیں میرے اندر وہ گن ہیں یا نہیں' جو زندگیاں بدل دیتے ہیں' مگر میں تم سے مل کر بدل رہی ہوں' یقین کرو۔ تم اتنی اندر کی بات کیسے کہہ دیتی ہو' اتنی گہرائی....."

"گہرائی نہیں' پستی کہیں۔ ہم سب پستیوں میں رہتے ہیں اور وہاں ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ ہم سب ایسا ہی سوچتے ہیں' بلکہ اس سے بھی گہرا مگر کہتے نہیں ہیں کسی سے۔ آپ کے لیے یہ باتیں نئی ہوں گی' اس لیے آپ حیران ہو رہی ہیں۔ میں اپنے اردگرد کے لوگوں کو یہ سب سنانے بیٹھوں تو وہ ایک جھاڑ پلائیں گے کہ کس کو سنا رہی ہے' کوئی نئی بات کر... شاید ان کے پاس بیان کی قوت نہیں' وہ وضاحت نہیں دے سکتے۔ مگر ان سب کے دلوں میں یہی ہے۔

اور جہاں تک میری بات ہے' میں کبھی کسی کے سامنے ایسے نہیں بولتی۔ بس آپ کے سامنے نہ جانے کہاں سے جملے بنتے چلے جاتے ہیں۔ آپ کو اچھے لگتے ہیں' پتا نہیں کیوں۔" وہ اتنی علمیت دکھانے کے بعد سادگی سے مسکرا دیتی۔

"تم اشفاق احمد والا بابا تو نہیں ہو۔" میں نے جیسے گتھی سلجھائی۔

"مجھے ان کے بابوں کا تو پتا نہیں' البتہ اپنے جیسے بہت سے بابوں سے میں آپ کو ملوا سکتی ہوں' بلکہ بابے نہیں' بابیاں۔" وہ زور سے ہنس دی۔

☼ ☼ ☼

"آپ ایک کہانی لکھیں' جس کی ہیروئن کا نام شفا ہو۔" اس نے فرمائش کی تھی۔

"اور ہیرو شفاعت۔" میں نے ٹکڑا جوڑا۔

"اللہ!" وہ لال سرخ ہو گئی۔ "آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ ہیرو شفاعت ہی ہو گا۔"

"تو کیا نہیں ہے؟" میں نے جلدی سے کہا۔ وہ لاجواب ہو گئی۔

"بس ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں' بلکہ جان گئے' پتا نہیں کیسے؟" وہ الجھ سی گئی۔

"ہم مین روڈ سے بس میں اکثر اکٹھے ہوتے تھے۔ وہ بلدیہ اسٹاپ سے چڑھا کرتا تھا۔ میں اس کی شکل آشنا تو تھی۔ نام کے سلسلے میں بس اتفاق ہو گیا۔ آگے پیچھے اندر داخل ہوتے ہوئے شفاعت پکارا تو میں بھاگی گئی' شفا کہا گیا تو وہ الرٹ ہو گیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ایسے ہی جان پہچان بن گئی۔"

"تمہیں قدرت ملوا رہی ہے لڑکی! اشارہ سمجھو۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "اچھا وہ ہے کیسا؟" مجھے اشتیاق ہوا۔

"کیسا ہوتا ہے' لمبا ہے اور بہت دبلا پتلا ہے اور ہاں کالا بھی بہت ہے۔"

"کالا.....!" میں چلائی۔ "کتنا کالا.....؟"

"کالا..... کالا ہوتا ہے' کتنا کا کیا مطلب ہے؟"

"نہیں۔ کوئی مثال تو دو' سنگھاڑے جیسا' الٹے توے جیسا' یا پھر..... پنسل کے سکے جیسا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا' بس ہنستی رہی۔

"رنگ کو چھوڑیں' آپ محبت کہانی لکھیں' سیدھی سادی سی کہانی..... جس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ لڑکا لڑکی نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔ ان کے گھر والوں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا' اور ان کی شادی ہو گئی۔"

"ہائیں.....!" میں حق دق رہ گئی۔ "تو اتنی سیدھی کہانی پڑھے گا کون؟"

"لوگ یہ کیوں چاہتے ہیں کہ ہیروئن رو' رو کر پاگل ہو جائے اور ہیرو سر ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر لے۔ اگر سب کچھ ہنسی خوشی ہو رہا ہے تو پڑھنے والا کا کیا جاتا ہے۔ وہ بھی خوش ہو لے....." وہ ناگواری سے کہہ رہی تھی۔

میں فرماں برداری سے سر ہلاتی رہی۔

"پھر آپ لکھیں گی نا محبت کہانی؟"

وہ لجاجت سے میرا ہاتھ چھو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آس' امید اور مان تھا۔ میں ہار گئی۔

"ہاں لکھوں گی۔" میں نے اس کا گال تھپتھپایا۔

☼ ☼ ☼

عید منانے اور عید کے فوراً" بعد رکھی جانے والی شادیاں نپٹانے کے بعد میں لوٹی تو بچوں کے اسکول کا آغاز ہوتا تھا۔ اتنے دنوں سے بند گھر بھی توجہ مانگ رہا تھا اور سب سے بڑھ کر میرا لکھنے کا کام۔ ایک ہفتہ کیسے گزرا پتا نہیں چلا۔

ٹیرس کی صفائی ستھرائی' پودوں کو دیکھ بھال کر جب میں لکھنے کے لیے اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی تو دھیان شفا کی طرف چلا گیا۔ کتنے روز سے کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ میں ریلنگ کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ میرا گھر کونے کا تھا اور دو رویہ سڑک کے بعد میرے گھر کے عین سامنے بہت بڑا مدرسہ تھا۔ اسی مدرسے کے باعث میں ٹیرس پر بڑی بے فکری سے بیٹھ جاتی تھی۔

شفا کا گھر نیول آبادی کے باہر پیچھے کی طرف تھا۔ وہ حفاظت کے خیال سے گولف کورس اسٹاپ پر اتر کر نیول کمپاؤنڈ کے اندر سے جایا کرتی تھی۔ یہ راستہ یقیناً" کچھ لمبا تھا' مگر محفوظ تھا۔

ہماری فون پر بھی بس ایک بار بات ہوئی تھی۔

"اگر اوور ٹائم کر رہی ہوئی تو ابھی نہیں گزری ہو گی۔" میں قیاس کے گھوڑے دوڑا رہی تھی۔ اور میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ آگئی تھی۔

"میں آج ہی نہ آتی۔ مگر بس رہا نہیں گیا۔ لائٹ جلتی دیکھی تو۔" وہ جھینپتے ہوئے صفائی دے رہی تھی۔

"پر ہم تو ایک ہفتے سے آئے ہوئے ہیں۔" میں مسکائی۔

"مگر اوپر اندھیرا تھا نا؟"

"بالکل تھا' اوپن ایریا ہے نا' سب سے زیادہ گندگی یہیں تھی۔ میں نے ہفتہ لگا کر نیچے سب سمیٹا اور آج مائی' ثانی کے ساتھ مل کر نقشہ درست کیا ہے۔" میں نے چہار اطراف دیکھا۔ "کیسا لگ رہا ہے؟"

"ایک دم شان دار چمکیلا چمکیلا۔" اس نے دل سے سراہا۔

"اور تم بھی تو بہت چمک رہی ہو۔ ہے نا' بالکل نکھری نکھری' نئی نکور' کیا ہوا ہے؟"

میں اس کا عمیق نگاہی سے جائزہ لے رہی تھی۔ میرے شریر لہجے پر وہ سفید ہوئی' پھر گلابی اور پھر اس کا سلونا چہرہ تمتمانے لگا۔

"کیا ہوا ہے شفا بی بی؟" میں کچھ بہت اچھا سننے کو تیار ہوئی۔

"منگنی۔" اس نے بمشکل کہا۔

"شفاعت سے نا؟" میرا انداز "وہ مارا" والا تھا۔

وہ جواباً" کچھ نہ بولی' بس بیر بہوٹی بن گئی۔

وہ سیدھی سادی کہانی پسند کرتی تھی۔ اسے اعتدال پسند تھا۔ اسے وہی سب ملا۔ اللہ نے اس کی زندگی میں آسانی پیدا کر دی تھی۔

بہانے ہی بنتے ہیں زندگی میں ملنے کے، بچھڑنے کے۔ بس ان کے ناموں میں کچھ صوتی مماثلت تھی، جو پہچان بنی۔ وہ اتفاق سے ایک ہی بس میں آیا کرتے تھے۔ ایک دن حالات خراب ہونے پر وہ اسے کسی سے بائیک مانگ کر بہت فکرمندی سے گھر تک چھوڑ گیا۔ اب ناموں پر چونکنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ شفا اور وہ شفاعت۔

اس نے اسٹاپ پر کھڑے ہو کر باتیں مٹھارنے سے بہتر یہ جانا کہ ایک ہی بار دوٹوک بات کرلے۔ جی ہاں شادی اور شفا جھٹ مان گئی۔ وہ حقیقت پسند لڑکی تھی۔ اسے خبر تھی۔ اس کے طبقے کی لڑکیاں ایسی آفر کے انتظار میں بالوں کی چاندی تک کو نوچنے پر آجاتی ہیں۔

وہ زندگی کی مشکلوں، بلاوجہ کے کھڑاک سے گھبراتی تھی۔ اس کے گھر میں اس رشتے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور شفاعت کے گھر میں شفا کو۔۔۔ وہ دونوں مل کر کام کریں گے جیسے ابھی کرتے ہیں۔ مشترکہ فیصلہ۔۔۔

"میں نے سال پہلے اپنے گھر کے اوپر اپنے لیے کمرا ڈلوایا ہے۔ گرمیوں میں تپتا ہے، مگر تم فکر نہ کرو میں چھت پر تھرموپول شیٹس رکھ دوں گا اور بہت سے گملے۔۔۔ اور ہم کون سا گھر میں ہوا کریں گے دن میں۔۔۔ صبح اکٹھے نکلے شام کو واپس۔ رات کو چھت پر چارپائی ڈالو تو ایسی ٹھنڈی ہوا آتی ہے، ہاکس بے کے ساحل کی جانب سے کہ بس۔۔۔"

دونوں نے یہ بھی طے کرلیا تھا کہ ان کے بس دو بچے ہوں گے، بھلے بیٹے ہوں یا بیٹیاں۔ لمبی لائن نہیں۔

"تم بہت لائق اور سمجھ دار ہو شفا! بچے بھی تمہارے جیسے ہوں گے محنتی اور صاف گو۔" شفا کے لیے یہی سب سے بڑی خوبی تھی۔

"اب تو ملنا پڑے گا جناب شفاعت صاحب سے۔" میرے اندر سے خواہش پھوٹی۔

"ہاں نا۔۔۔ تو وہ بھی تو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہہ رہا تھا میں تو ہزار بار اس گھر کے پاس سے گزرا ہوں۔ مجھے نہیں پتا وہاں اتنی بڑی رائٹر رہتی ہیں۔"

"پاگل ہو تم۔۔۔" اپنی تعریف پر میں ہمیشہ ایسے ہی آئیں بائیں شائیں پر آجاتی تھی۔

"ویسے آپ کیوں نہیں چاہتیں کہ لوگ آپ کو جانیں پہچانیں؟"

"تم بار، بار یہ سوال کیوں کرتی ہو؟"

"آپ ہر بار ٹالتی کیوں ہیں؟"

"یہاں اس علاقے میں میری عزت، پہچان ایک ہاؤس وائف کی ہے۔ میرے بچے، میرے شوہر، عام عورت کی طرح رہتی ہوں۔ لوگوں کے اندر تک گھس جاتی ہوں، گھنی میسنی بن کر۔ خاص ہو کر سب کے سامنے آئی تو تنہا رہ جاؤں گی۔ ابھی تو لوگ اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ پھر کوسوں دور بھاگنے لگیں گے۔ میں نے کئی بار آزمایا ہے اور مجھے یوں عام بن کر رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جہاں خاص ہوں، وہاں ہوں۔"

"یہ تو آپ نے بہت ہی اندر کی بات بتائی۔" اس کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔

"کبھی بھی کچھ محلے پڑوس کی عورتیں کہتی ہیں۔ سارا دن گھر میں گھسی رہتی ہے۔ دو بچے ہیں اس کے۔ گھر میں کام ہی کیا ہے، مغرور ہے۔"

میں ہنسی تو وہ بھی زور سے ہنس دی۔

اس کی ہنسی میں بڑی جلترنگ تھی، نیا پن۔

آنکھوں میں ستاروں کو ماند کرتی چمک۔

وہ آٹھ نو سو والے فیروزی رنگ کے چکن کے سوٹ میں ملبوس تھی اور وہ اسے شفاعت نے دلایا تھا ہفتہ بازار سے، اس کے پیروں میں نئی چپل تھی اور پرس بھی نیا تھا۔

چہرہ ہمیشہ کی طرح سادہ تھا، مگر اندرونی خوشی و جوش نے کسی آرائش کی کمی نہ چھوڑی تھی۔

"کہانی تو بہت عام سی ہے شفا! سیدھی سیدھی۔ مگر اس کے مکمل ہونے پر جو خوشی ملی ہے اس کا مول کیا لگاؤں سچ میں! آئے دن انجام لکھتی ہوں، موڑ دیتی ہوں، سنسنی پھیلاتی ہوں، پھر سمیٹ لیتی ہوں، مگر اتنا سکھ کبھی نہ ملا۔ تم ایسی ہی سیدھی کہانی لکھنے کو کہہ رہی تھیں نا۔"

وہ جواباً کچھ نہ بولی، اپنی مدھم ہوتی مہندی کے نقش کھوجتی رہی۔

"نہ بہت دولت، نہ خون چوستی غربت۔ محنت، اخلاص، تعاون، صبر شکر، قناعت کے دائرے میں گھومتی زندگی۔ کوئی ظالم سماج نہیں۔ کوئی اعتراض نہیں۔۔۔ میں اس کہانی کو بہت اہتمام سے لکھوں گی۔"

"پر آپ تو کہتی ہیں لوگ ایسی کہانی نہیں پڑھتے؟"

"ہیرو، ہیروئن تو پڑھیں گے نا۔" میں نے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ "ہر کہانی ہر ایک کے پڑھنے کے لیے نہیں ہوتی۔"

☼ ☼ ☼

اور محبت کہانی سیدھی ہو سکتی ہے۔

مگر۔۔۔

زندگی کہانی کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ پرپیچ، بے لچک، کٹھور، بے حس، اندھی، بہری، بے رحم۔۔۔

"تم اپنے قبیل کی دوسری لڑکیوں نسبت بہت سادہ رہتی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ میں ایسی ہی ہوں، مگر آپ کی الجھن صحیح ہے۔ فیکٹریوں میں کام کرنے والیاں سنگھار کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ مگر وسائل نہیں ہوتے۔ وہ اپنی چند بڑے نوٹوں والی تنخواہوں سے کچھ سکے، کچھ چھوٹے نوٹ مٹھی میں بند کرکے اتوار بازاروں کا رخ کرتی ہیں۔

دس روپے کا کلپ۔۔۔ بیس روپے کا کڑا۔۔۔ پانچ روپے والی پونیاں۔۔۔ کلائی میں سرخ یا سیاہ دھاگہ باندھ لیں گی۔

ننانوے فیصد حجاب لیتی ہیں۔

مگر آنکھوں کو سجانے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ کاجل ہی سے مسکارا اور لائنر کا کام لے کر آنکھوں کو سنوارتی ہیں۔

ہاتھوں پیروں کو سستی نیل پالش سے سجاتی ہیں اور کانچ کے چھلے اور اسٹیل کی انگوٹھیاں۔ پیروں میں پازیب یا وہی کالا دھاگا۔

ہر ایک پرس میں آئینہ لازمی ہوگا۔ مسلسل محنت کی تھکان چہرے پر نقش بن کر ابھر آتی ہے۔ مگر ہر روز سارے دن کے لیے مشینوں کے آگے جھک جاتی ہیں۔ شام کو چڑیوں کے غول کی طرح واپسی کی اڑان بھرتی ہیں اور پتا ہے، چہچہاتی بھی ہیں۔ مگر ان کی زبانیں بہت تلخ ہوتی ہیں اور دنیا جہان کی گالیاں بھی انہیں ازبر ہوتی ہیں۔ ابن آدم کی بدنگاہی اور زبان کی غلاظت سے نپٹنے کے لیے گالیاں سب سے کارگر ہتھیار ہوتی ہیں۔"

یہاں اس شامیانے میں جگہ جگہ اتنی کہانیاں بکھری تھیں کہ یہ زندگی تو کم تھی انہیں صفحہ قرطاس پر بکھیرنے کے لیے۔ شاید دو چار جنم مل جائیں تو۔۔۔

مگر فائدہ۔۔۔ اتنی کہانیاں اور تمام کی تمام دکھی۔۔۔

"میں نے محبت کہانی کو لکھ لیا تھا شفا! بہت خوب صورت۔ الفاظ سے آراستہ کرکے۔ جملے، تشبیہات، پھول، خوشبو، ہوا، بادل، مسکراہٹ، خوشی۔۔۔ میں نے سیدھی محبت کہانی کو مرصع و مسجع کرکے کاغذ پر بکھیر دیا تھا۔

وہ خوشی کی کہانی تھی۔ قناعت و صبر کی، اعتماد و اعتبار کی سکھ اور سہولت کی۔

میرے بہتے آنسو کسی کو سوال پر نہیں اکسا رہے تھے۔

یہاں سب آنکھیں بہہ رہی تھیں یا پتھرا گئی تھیں۔

میں گھنی میسنی بن کر پوشیدہ رہ کر پنڈال میں بیٹھی تھی۔

ہم لکھنے والے ہمیشہ کہانی کی تلاش میں رہتے ہیں۔

خود غرض۔۔۔

لیکن میں انسان بھی تو ہوں۔۔۔ میں اتنا دکھ کیسے سہوں، کیسے دیکھوں۔

اور کیسے لکھ سکتی ہوں اور پیش کیسے کروں گی۔

خوشی کہانی کو دکھ کا انجام کیسے دوں؟

اور سنگھار کی شائق لڑکیاں۔۔۔

پہچان میں نہ آرہی تھیں۔ ان کے شوق، ان کی شناخت سب بھسم ہو چکے تھے۔

ان کے وہ آئینوں والے پرس بھی خاکستر ہو گئے۔
اچھا ہوا نا....
ورنہ اب کی بار آئینے جو چہرہ دکھاتے 'کیا ان کو چہرہ کہتے ہیں۔
اسٹریچر پر کوئی لاش چت نہیں تھی۔ اکڑی 'لٹکی 'مدد کو پکارتے ہوا میں لہراتے ہاتھ .... آسمان کو اٹھی ٹانگیں.... اٹھی ہوئی گردنیں....
وہ سب پہچان میں نہیں آتے تھے۔ مگر وہ انسان تو تھے نا۔
جلے گوشت کی بو....
"تمہارا کون مرا ہے؟" کوئی عورت میرے ساتھ آ لگی۔
اور میں کیا کہتی 'میرا کون مرا ہے۔ ان چالیس جنازوں میں میرا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔
اور ان جل جانے والوں کا تو خون بھی جل گیا تھا۔ پہچان ہو تو کس صورت سے۔
میں شفا کے گھر چلی آئی۔ اس کا بھائی مجھے دیکھتے ہی پہچان گیا۔
"مجھے یقین تھا آپ آئیں گی۔"
"میں یہاں سے واپس کیسے جاؤں گی؟" میرے لبوں سے چیخیں نکل رہی تھیں۔
وہ اسٹور نما کمرا تھا۔ جہاں ایک چارپائی پر سفید پرٹی آسمانی چادر سلیقے سے بچھی تھی۔ بستر بے شکن تھا مگر اس کی مالکہ کا جسم سلوٹ سلوٹ 'سکڑ کر اتنا مختصر رہ گیا تھا کہ اسے قبر میں ایک گٹھڑی کی طرح رکھ دیا گیا تھا۔
کمرے میں رسائل اور اخبارات کا ڈھیر تھا۔ سالوں پرانے شمارے 'اخبار 'مضامین 'اس کا پرانا گاؤن 'کھونٹی پر ٹنگا تھا۔ اس کی ٹوٹی جوتی دروازے کے پاس پڑی تھی۔
"تم بہت عقل مند ہو۔ بہت اعلا پائے کی گفتگو کرتی ہو۔"
"عقل مند نہیں 'چالاک کہیں۔ جو کچھ اخباروں 'رسالوں میں پڑھتی ہوں 'انہیں اپنی گفتگو میں مکاری سے ایسے جوڑتی ہوں کہ لگے میرے اپنے الفاظ و خیالات ہیں۔" وہ شرارت سے کہتی۔
"پر یہ فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ لوگوں کے سر سے سالہا سال کا گیان گزر جاتا ہے۔ آخری پل تک گدھے کے گدھے ہی رہتے ہیں۔" میں نے اسے سراہا تھا۔ "یہ بھی تو تمہاری ذہانت کی دلیل ہے نا کہ کس چیز کو کہاں 'کیسے 'کب پیش کرنا ہے۔"
"آپ کو میری تعریفیں کر کے پتا نہیں کیا ملتا ہے۔" وہ الجھ کر شرماتی۔ "میں ایسی باتیں اپنے ابا 'اماں کے سامنے کروں نا تو وہ مجھے پگلی کہیں۔ اماں تو صاف بھائی کو الزام دیں گی 'تو ہی الٹا سیدھا پڑھنے کو دیتا ہے۔"
اس بوسیدہ کمرے کے ہر کونے میں شفا تھی.... مگر شفا نہیں تھی۔ وہ اب کہیں نہیں تھی۔
اس کی آواز 'اس کی آنکھیں ہر شے سے جھانک رہی تھیں۔ مگر وہ نہیں تھی۔
اور....
میری اس کی پہلی ملاقات کا باعث ایک دردناک 'دلخراش چیخ تھی۔ اس کے پیر سے بھل بھل نکلتا خون 'آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا تھا اور ہر موئے جاں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ تکلیف کی شدت 'برداشت کی انتہا۔
"مجھے ان چھوٹے چھوٹے زخموں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے خون سے 'آگ سے 'کٹ جانے سے بہت خوف آتا ہے۔ میں کسی کو زخمی دیکھ ہی نہیں سکتی۔ زخمی سے زیادہ حال میرا خراب ہو جاتا ہے۔ استھما کے مریض کی طرح سانسیں بے قابو ہو جاتی ہیں۔"
"اور تم کتنا چیخی ہو گی شفا!" میں اس کی چارپائی پر پیر لٹکائے بیٹھی تھی۔ "تم نے یہ تو بتایا تھا تمہیں چھوٹے زخموں سے ڈر لگتا ہے۔ بڑے سے کیسے نہ لگتا ہو گا۔"
"زندگی ایسی کیوں نہیں ہو سکتی کہ سب سہل ہو۔"
"اپنی خواہشات کا پہاڑ بنا لیتے ہیں اور اس پر چڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کوئی ہم تک پہنچے تو کیسے پہنچے۔"

آوازیں یادداشت سے سر اٹھاتی جا رہی تھیں۔
"وہ میرے ساتھ جینے مرنے کی قسم کھا رہا تھا۔ میں بس ہنس دی۔"
"ایسا کیوں ہوتا ہے سحر جی! لوگ ساتھ جی لیں۔ تو دنیا داد دیتی ہے۔ ساتھ مر جائیں تو ایک عالم ماتم کے لیے آ جاتا ہے۔ دنیا یہ کیوں نہیں سوچتی کہ کہنے والے کی قسم پوری ہوئی۔ عہد تکمیل کو پہنچا۔ ارادہ اٹل رہا۔"
"مجھے شفاعت کے ہر جملے پر یقین آ جاتا ہے 'وہ دعوے نہیں کرتا۔ میں اس کے ساتھ جی کے خوش رہوں گی۔ خالی جینے کی بات نہیں میں اس کے ساتھ مر کے بھی خوش رہوں گی۔"
"شفاعت.... شفاعت کا پتا لگا؟" میرا گلا بے آواز رو رو کر بیٹھ چکا تھا۔
"نہیں۔ وہ نیچے گودام میں تھا۔ شاید آج ڈی این اے کے ذریعے معلوم ہو۔"
"مجھے بتانا۔" میں تو اسے دیکھنا چاہتی تھی 'اس سے ملنا چاہتی تھی۔
شفا کہنے لگی "وہ شرما گیا تھا۔"
میں نے کہا "شادی پر دیکھ لوں گی۔"

☆ ☆ ☆

میں ضیاء کے لاکھ منع کرنے اور رانی 'ثانی کے متامل انداز کے باوجود چلی گئی تھی۔ شفاعت کے گھر....
چھت پر کھڑا کمرہ ایک گھونسلہ تھا ایک چہچہاتی گھری بات کرتی چڑیا کا اور کسی کے خوابوں کا مسکن تھا۔
یہاں مجھے پہچاننے والا کوئی نہیں تھا۔ دوست دشمن 'اپنے پرائے ایک جنازے سے اٹھتے تھے اور دوسرے پر جا بیٹھتے تھے۔
میں نے شفا کی آنکھوں کی چمک میں شفاعت کو کھوجا تھا۔
مسکراہٹ کے عقب میں اسے جانچا تھا۔
ہنسی کی جھنکار میں شفاعت تھا۔ مگر میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔
"اچھا کیسا ہے وہ....؟"
"کیسا ہونا چاہیے؟ لمبا ہے اور بہت دبلا پتلا ہے اور ہاں کالا بھی بہت ہے۔"
"کالا.... کتنا کالا....؟"
"کالا 'کالا ہوتا ہے 'کتنا کیا مطلب؟"
"نہیں 'کوئی مثال دو۔ سنگھاڑے جیسا 'الٹے توے جیسا 'یا پھر پنسل کے سکے جیسا۔"
ایک ہنسی ساعتوں کے در کھٹکھٹانے لگی۔
"صرف کہانیوں کے ہیرو گورے چٹے سنہرے بالوں والے 'عنابی لبوں والے ہوتے ہیں حقیقی ہیرو تو کالا ہی ہو گا۔"
"ہاں تو ٹھیک ہے کالا ہی رہے 'مگر آخر کتنا؟"
اس کے بہت کالا 'دبلا 'پتلا 'لمبا کہنے سے میرے ذہن میں جو تصویر بنتی تھی۔ توبہ.... لاحول!
"آخر پتا تو چلے کتنا کالا؟"
وہ میری پریشانی کا حل ڈھونڈنے کے لیے میرے گھر کو طائرانہ دیکھتی۔ فرش کو 'چھت کو.... مگر کوئی تشبیہ مناسب نہ لگتی۔ وہ مختلف جانب دیکھتی 'پھر نفی میں سر ہلاتی۔ پھر الٹی سیدھی چیزوں کے نام لیتی۔
"حبشی حلوہ کھایا ہے کبھی؟"
"جامن کالے 'بکری کا توڑ 'ہونہہ.... اوں۔"
"بینگن.... ہی ہی ہی۔"
میں اسے خشمگیں نظروں سے گھورتی اور اس کی ہنستے چہرے اور ہنستی آنکھوں کو دیکھ کر خود بھی ہنس دیتی۔
"تم نے سارے جہان کی مثالیں دے دیں۔" میں نے شدید خوف کے عالم میں بے ساختہ اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا۔ تابوت کے اندر.... وہ.... شفاعت)
جھرجھری کے باعث جسم لرزہ براندام تھا اور رواں رواں کھڑا ہوا۔
ساری تشبیہات استعمال کیں 'بس یہ نہ کہا۔
"جل کر راکھ.... سیاہ کوئلے جیسا۔"
میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆

دلِ مبتلا ٹھہر جائے

نزہت شبانہ حیدر

ناولٹ

تاباں نے منہ باہر نکالا' پھر ایک دم سے اندر کرلیا۔

"کیا ہوا؟" دائم نے تجسس سے پوچھا۔ "اب کون مہمان آرہا ہے۔"

"یہ گھر، گھر کم سرائے زیادہ لگتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا امی جان کو کیا شوق ہے۔ ہر ایک کو گھر میں بلاتی رہتی۔"

"اب کون آرہا ہے؟" اس نے چڑ کر دوبارہ پوچھا۔

"ہوگا کوئی رشتہ دار اور نہیں ہوگا تو زبردستی بنالیا جائے گا۔"

"زبردستی کے رشتے دار کیسے بنائے جاتے ہیں' یہ تو میں نے پہلی دفعہ سنا ہے۔" دائم نے اسے چھیڑا۔

"اف! ایک تم دوسرے تمہاری عقل۔"

"کیوں' میری عقل کو کیا ہوگیا؟" اس نے ناراضی سے کہا۔

"عقل کو کچھ نہیں ہوا۔ تمہیں ضرور کچھ ہوگیا ہے۔ تم دن بدن بھولی بھالی ہوتی جارہی ہو۔" تاباں نے تپ کر کہا۔

"اچھا بس۔ زیادہ مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چچی جان سے شکایت لگادوں گی۔"

"ہاں اور تمہیں آتا بھی کیا ہے۔ امی سے شکایت لگانے کے علاوہ۔" تاباں نے جل کر کہا۔ "اس دن بھی امی نے مجھے ٹھیک ٹھاک ڈانٹا تھا۔"

"کس بات پر؟"

"اسی بات پر کہ میں تمہارا خیال نہیں کرتی ہوں۔ جبکہ مجھے خیال کرنا چاہیے بڑی بہن ہونے کے ناتے۔ تم سے صرف دو سال بڑی ہوں میں اور امی کی باتیں کوئی سن لے تو لگے گا کہ سات آٹھ سال بڑی آپا ہوا ہوں۔"

"اچھا! اب اگر تمہیں مجھ سے اتنی شکایتیں ہوگئی ہیں تو اس کا کچھ نہ کچھ تو علاج سوچنا پڑے گا۔" دائم نے سر کھجایا۔

"دیکھو! علاج سوچنے میں وہ پنک والا سوٹ ذہن میں رکھنا۔"

تاباں نے جلدی سے کہا اور کمرا ان دونوں کے ہنسنے کی آواز سے گونج اٹھا۔

"یہ ہر وقت کا لڑکیوں کا ہٹھی ٹھی کرنا مجھے ایک آنکھ نہیں پسند۔" امینہ پھپھو نے پہلو بدلا۔

"تو لڑکیاں اب کیا کریں۔ یہی ان کے ہنسنے بولنے کے دن ہیں۔" چچی جان نے فوراً دونوں کا دفاع کیا۔

"اس گھر میں ہی ایسے چونچلے دیکھے ہیں۔ لڑکیوں کو اتنا سر پر چڑھا نا کیا۔ اگلے گھر بھی جائیں گی یہ۔"

"اگلے گھر جانے کی تو شاید ضرورت ہی پیش نہ آئے۔" تاباں نے کھلکھلا کر آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

"کیوں؟ کیا ساری زندگی چچی جان کے صبر کا امتحان لینا ہے۔"
"چچی کے نہیں خود پھپھو کے صبر کا امتحان..... کیسا؟"
"کیا مطلب؟" دائم کا منہ پورا منہ کھل گیا۔
"منہ تو بند کرو بے وقوف! میں نے کیا ایسی انوکھی بات کر ڈالی۔"
"انوکھی..... جاہل ہو کیا؟ یہ تو بالکل خودکشی والی بات ہے۔ پھپھو کا بیٹا بالکل نالائق اور کوڑھ مغز ہے۔"
"بس ہر ایک کو اپنی طرح ہی سمجھنا۔ اطلاعاً" عرض ہے کہ وہ سول انجینئر ہے۔"
"ہاں تو میں پڑھائی کے متعلق کب بات کر رہی ہوں۔ میں تو کوئی دوسری بات کر رہی تھی۔"
"بس کرو اپنی دوسری بات۔ دنیا میں کوئی آئیڈیل نہیں ملتا۔ تم اپنی سوچ ذرا انسانوں والی رکھ لو' ورنہ سر پر ہاتھ رکھ کر رونا پڑے گا۔"
"زہر لگتا ہے مجھے یہ جملہ سر پر ہاتھ رکھ کر رونا..... پرانے زمانے کی ہیروئن کی طرح۔"
شہریار کمرے میں داخل ہوا تو دونوں اسی طرح باتوں میں مصروف تھیں۔
"کتنی باتیں ہیں تم لوگوں کے پاس۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انسانوں کی طرح تم لوگ پڑھ رہی ہو۔ پتا نہیں پاس کس طرح ہو جاتی ہو۔"
"اس کو دیکھو! بالکل لڑاکا عورت لگ رہا ہے۔"
دائم نے جلدی سے رجسٹر پر لکھ کر تاباں کو دکھایا۔
"زیادہ بکواس نہیں کرو اور خبردار! جو میرے اتنے اچھے ہینڈسم بھائی کو کچھ کہا تو..... منہ توڑ دوں گی۔"
تاباں نے اسے فوراً" لکھ کر دکھایا۔
"اس پورے جملے میں صرف ایک لفظ صحیح ہے بھائی۔۔۔ باقی جملہ مجھے کچھ پسند نہیں آیا۔" اس نے دوبارہ لکھا۔
"یہ تم دونوں کیا کر رہی ہو؟" شہریار نے دونوں کو غصے سے گھورا۔
"کچھ نہیں' نوٹس لکھ کر یاد کر رہے ہیں۔"
"اچھا!" شہریار کو ذرا جو یقین آیا ہو۔
"جنہوں نے کبھی آنکھوں سے نہیں پڑھا۔ وہ لکھ کر یاد کریں گے؟"
"دیکھ لیا نا!" شہریار کے جانے کے بعد دائم نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ "میں نے تمہارے بھائی کے لیے بالکل صحیح الفاظ استعمال کیے تھے۔ اسے ہم دونوں میں ہر برائی نظر آتی ہے۔"
"تو یار! تم بھی تو اسے تنگ کرتی ہو' اپنی غلطی کبھی نہیں مانتا۔ اور ویسے اس کی بات غلط بھی نہیں تھی۔"
دائم کو واقعی نہیں لگتا تھا کہ اس سے کبھی کوئی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ سب کے لاڈ پیار نے اسے حد درجہ بگاڑ دیا تھا۔
ہر بات' ہر جگہ اس کا فیصلہ مانا جاتا تھا۔ اب چاہے وہ غلط ہو یا صحیح "اس بارے میں خود اس کے اپنے نظریے تھے" انسان کو فیصلہ ضرور کرنا چاہیے۔ چاہے وہ غلط ہو یا صحیح۔" اور تاباں یہ بات سن کر ہمیشہ ہی خاموش ہو جاتی لیکن دل میں وہ اس کے لیے دعا کرنا نہیں بھولتی۔ "خدا کرے اسے کبھی وہ فیصلہ نہ کرنا پڑے جس کے بعد اسے غلط ہونے کا احساس ہو۔ زندگی جن کے لیے خوب صورتی ہے' روشنی ہے "ان کے لیے اس کے معنی ہمیشہ وہی رہیں۔"
"تم لوگوں نے شہریار کو کھانے کا پوچھا؟"
"نہیں امی! بھائی اصل میں غصے میں تھے۔"
"تم لوگوں نے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت کی ہو گی' ورنہ میں کیا اپنے بیٹے کو جانتی نہیں۔"
"ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے کوئی ہماری معصومیت پر یقین کرنے کو ہی تیار نہیں۔"
"ذکیہ بیگم نے سب کو ہی سر پر چڑھایا ہوا ہے۔" امینہ پھپھو کے چہرے پر سارے زمانے کی بے زاری تھی۔
"اور اتنا چھوٹا سا تو سر ہے چچی جان کا' سب پھسل کر گر پڑتے ہیں' کیوں تاباں؟"

"توبہ! زبان ہے کہ چرخی۔ مجال ہے کہ رک جائے۔"
یہ آخری جملہ تھا جو پھپھو نے ادا کیا۔ اس کے بعد وہ چپ کر کے بیٹھ گئیں۔ یہاں کوئی ان کے رعب میں آنے کو تیار نہیں تھا۔ ورنہ اپنے گھر میں تو وہ سب کو اپنی آنکھوں کے اشارے پر چلاتی تھیں یہ اور سب لوگ ڈرتے بھی تھے۔ کاش! یہ دائم ان کے گھر آئی ہوتی تو اس کو تیر کی طرح سیدھا کر دیتیں وہ۔ یہاں سب کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑا ہوا تھا۔
"دنیا میں بہت سارے لوگوں کے ماں' باپ مر جاتے ہیں تو کیا وہ ساری لڑکیاں ایسی بے لگام ہو جاتی ہیں۔ میں ذکیہ سے کہوں گی کہ یہ اب میرے ساتھ جائے گی۔ دو دن میں اسے سیدھا کر دوں گی۔"
"آپا! کس کو سیدھا کیا جا رہا ہے؟"
"اف!" پھپھو نے سر پر ہاتھ مارا۔ جانے یہ عادت کب ختم ہو گی' سوچتے ہوئے کوئی نہ کوئی بات منہ سے نکل ہی جاتی تھی۔
"نہیں بس یوں ہی۔" انہوں نے جلدی سے پان منہ میں رکھ لیا۔
"نہیں نہیں' پھر بھی بتائیں تو سہی' جہاں تک میرا خیال ہے' آپ تاباں اور دائم کے متعلق ہی سوچ رہی تھیں۔"
"سوچ کیا رہی تھی' میرے بس میں ہو تو ایک گھنٹے میں صحیح کر دوں۔ تم نے لاڈ پیار میں دونوں کو بگاڑا ہوا ہے۔"
"آپا! بیٹیوں کو پیار محبت سے رکھنا انہیں بگاڑنا نہیں ہوتا۔ یہ دونوں میرے آنگن کی چڑیاں ہیں۔ ایک دن اپنے گھروں کو چلی جائیں گی۔ پھر جب یہ کبھی یاد کریں گی تو ان کے چہرے پر مسکراہٹ ہو گی اور دل میں خوشی کہ میکے میں انہوں نے اپنا یہ وقت بہت اچھا گزارا جو دل چاہا کیا۔"
"جو دل چاہا وہ کیا نہیں' وہ بگاڑا۔"
اب کے ذکیہ بیگم نے کوئی تصحیح نہیں کی۔ بوڑھے لوگوں کے دماغ میں جو بات ایک دفعہ گھس جائے وہ مشکل سے ہی نکلتی ہے۔ جیسا سوچ رہے ہیں "نہیں سوچنے دو۔ صبح کے لیے تیاری بھی کرنی تھی۔ افنان آفس کے کام سے آ رہا تھا۔ اس نے ایک ہفتہ یہیں قیام کرنا تھا۔ سارے رشتے دار اگر پنڈی میں ہوں اور ایک آدھ کراچی میں ہو تو آئے دن کی مہمان داری ہو جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن انہوں نے صبح ہی صبح دونوں کو اٹھا دیا۔
"امی! کالج کی چھٹی ہے' قسم سے پھر بھی سکون نہیں۔" تاباں چادر کے اندر سے منمنائی۔
"چھٹی ہونے کا کیا مطلب ہے۔ چلو اٹھ جاؤ۔ بہت آرام کر لیا۔" انہوں نے دونوں پر سے چادر کھینچی۔
"دیکھو! کتنا ظلم ہے' اچھی خاصی سردی ہو رہی ہے اور چچی جان نے کھیس بھی چھپا دیا۔" دائم نے منہ بسورا۔ "تاب! دیکھو تمہیں نہیں لگتا کہ اب چچی ہم لوگوں پر ظلم کرنے لگی ہیں۔"
"اتنا جھوٹ بولو گی تو اور گناہ ملے گا۔"
"میں نے کیا جھوٹ بولا ہے..... "ابھی دس دن پہلے جب سالن میں اتنی تیز مرچیں تھیں تو چچی جان نے کہا کہ جو پکا ہے بس وہی کھانا ہے۔ بس اس دن کے بعد سے لگتا ہے کہ معدے میں زخم ہو گئے ہیں۔"
"ہائیں!" تاباں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "اتنی بڑی بیماری خود سے پیدا کر لی' کوئی ایکسرے ٹیسٹ کروایا تھا۔"
"میں نے کہا کہ مجھے لگتا ہے کوئی کنفرم بات تھوڑی ہے۔"
"اور مجھے کیا لگتا ہے پتا ہے..... جی چاہتا ہے تمہیں قتل کر دوں اور یہ بات بالکل کنفرم ہے۔" تاباں نے دانت پیسے۔

"اسی بات کی کسر رہ گئی تھی۔ اب کیا کہوں تمہیں ۔۔۔ میں آنے والے مہمان کے لیے کتنا زبردست پلان سوچ رہی تھی۔" "مگر سمجھو فیل ہی ہو گیا اور وہ بھی تمہاری وجہ سے۔"

"کیوں میں نے کیا کر دیا۔ مجھے تو تمہارے پلان کی الف ب بھی نہیں پتا' اب بتاؤ کیا تھا۔"

"دراصل میں۔۔۔" وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔

"ہاں شاباش بولو' ابھی تو بہت زبان چل رہی تھی۔"

"دراصل میں وہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"کیا؟" تاباں چلائی۔ مطلب گندی بات ہے۔ تم نے کیا فلمیں دیکھنی شروع کر دی ہیں۔

"میں کہاں فلمیں دیکھتی ہوں۔ اس پر بھی پابندی ہے مگر بات کچھ فلمی سی ہی ہے۔"

"بات گندی بھی ہے اور فلمی بھی۔ اگر یہ گفتگو امینہ پھپھو نے سن لی تو بے ہوش ہو جائیں گی اور اب جلدی سے بتاؤ' مجھ میں مزید برداشت نہیں ہے۔"

"افنان بھائی آرہے ہیں۔ ان کو بے وقوف بناتے ہیں۔"

"بے وقوف بناتے ہیں۔ کیا وہ کوئی چھوٹے بچے ہیں؟"

"چھوٹے بچوں کا تو بے وقوف بننا مشکل ہے جبکہ بڑے آرام سے بن جاتے ہیں۔"

"تم یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"ارے بھئی' فلموں میں دیکھا ہے۔ بے چاری غریب اور یتیم ہیروئن پر سب ظلم کرتے ہیں اور ایک عدد خوب صورت ہیرو اپنی ساری خوب صورت اور تیز کزنز کو چھوڑ کر اسی کو پسند کر لیتا ہے۔"

"اس ساری سچویشن میں تم کہاں ہو۔ تم پر تو کچھ فٹ نہیں آتا۔"

"اسی بات کا تو رونا ہے۔ اپنی مظلومیت کے قصے سنانے کے لیے میرے پاس دو باتیں بھی نہیں ہیں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر چچی جان تھوڑا سا ظلم کر لیتیں۔ بہت ڈھونڈ کر تو میں نے یہ دو قصے نکالے تھے۔"

"دفع ہو جاؤ۔"

"کیا ہے تھوڑا سا مذاق ہی تو ہے اور بس' کالج کی بھی چھٹیاں ہیں۔ اگر ہم نے تھوڑا سا یہ مذاق کر لیا تو باقی دنوں میں یاد کر کے کم از کم ہنسا تو کریں گے۔"

"اچھا!" تاباں سوچ میں پڑ گئی۔

"افنان کا کمرا ٹھیک کر دیا' بستر کی چادر بدل دی ہے؟"

"جی پھپھو! سب کام کر دیا ہے۔ اگر اب بھی کوئی کام رہتا ہے تو آپ دائم سے کہہ دیجیے۔"

"اف!" پھپھو نے سر پیٹا۔ "کس کا نام لے لیا۔ وہ تو سیدھا کام بھی بگاڑ دیں اور میں ان سے کسی کام کا کہوں؟"

"پھپھو! میں سچ کہہ رہی ہوں' دائم بالکل بدل گئی ہے۔"

"کیسے بدل گئی' ابھی کل تک تو وہی حرکتیں تھیں۔ ایک دن میں انقلاب آگیا۔"

"انقلاب آنے کے لیے تو ایک لمحہ بھی بہت ہے۔ آپ کو جتنے بھی کام ہیں' آپ دائم سے کہہ دیجیے گا۔ میرے سر میں تو بڑا درد ہو رہا ہے۔"

"اچھا!" پھپھو کو یقین تو نہیں آیا' پھر بھی کہنے میں کیا حرج تھا۔ اس لیے انہوں نے دائم کو آواز دے دی۔

"جی پھپھو!" وہ ایک آواز میں حاضر ہو گئی۔

"کیا کر رہی تھیں؟ اور یہ تم نے کپڑے کیسے پہن رکھے ہیں؟"

"کیوں کیا ہو گیا ان کپڑوں کو' ٹھیک تو ہیں پھپھو!"

"اچھا' پتا نہیں کہاں سے ٹھیک ہیں۔" انہوں نے دل میں سوچا۔ "کہاں تو صبح' شام جوڑے بدلے جاتے تھے خیر!" انہوں نے سر جھٹکا۔

"تاباں کہہ رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہے۔ اس لیے تم سے پوچھ رہی ہوں۔" انہوں نے سابقہ تجربوں کے پیش نظر سنبھل کر کہا۔

"کھانا دیکھ لیا ہے؟"

"جی۔۔۔ سب کچھ تیار ہے پھپھو!" اس نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ "اور آپ نے جو لوکی کا حلوہ کہا تھا' وہ بھی بن گیا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ اصل میں افنان کو پسند ہے۔"

"مگر اس دن تو آپ کہہ رہی تھیں کہ افنان بھائی کو میٹھا پسند نہیں ہے۔" روکتے روکتے بھی اس کی زبان پھسل گئی۔

"اچھا اب ہر بات کی جرح کرنے نہ بیٹھ جایا کرو۔"

"جی اچھا!" اس نے ادب سے کہا۔

"صحیح کہہ رہی تھی وہ۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور بدلا ہے۔ اب یہ پتا نہیں کہ کب تک ایسا رہے گا۔ خیر میرے لیے تو بہت ہی اچھا ہے' کم از کم میرا بی پی تو نارمل رہے گا۔"

مگر رات کو شہریار اس کے سر پر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا دماغ صحیح ہے۔ تم کیوں کر رہی ہو یہ سارے کام؟"

"کون سے کام میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"بوا کہاں ہیں' ان سے کہو۔"

"اُفوہ!" وہ جھنجلا گئی۔ "اب جو کھانے مجھے بنانے تھے' وہ بوا کس طرح بنا سکتی ہیں۔ ان کو چائنیز بنانے کب آتے ہیں۔"

"تو تمہیں بھی کیا ضرورت ہے چائنیز بنانے کی۔ سیدھا سا کھانا نہیں بن سکتا تھا؟"

"انسان تو سیدھا ہو سکتا ہے' مگر کھانا کس طرح سیدھا ہو سکتا ہے۔" اس نے ہنسی ضبط کی۔

"ہاں تم سے سیدھی بات تو ہوتی نہیں' کھانا کس طرح سیدھا پک سکتا ہے۔" شہریار جھنجلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

"اس کو کیا ہو گیا؟" وہ سوچتی ہوئی دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہوئی۔

رات تک وہ تھک کر چُور ہو گئی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر تاباں کو غصہ آنے لگا۔

"بس کرو۔ یہ تمہارے بس کا کام نہیں' جن لوگوں نے بیٹھ کر صرف حکم چلانا سیکھا ہو' وہ تو دو دن میں فوت ہو جائیں گے۔"

کمرے سے باہر آتے ہوئے افنان نے بھی یہ جملہ سنا۔ ایک دم اس کا دل خراب ہوا۔

وہ جس وقت سے آیا تھا۔ اس وقت سے یہ لڑکی بھاگ بھاگ کر سب کے کام کر رہی تھی ملگجے اور میلے سے کپڑے پہنے۔ لگ رہا تھا کہ دو دن سے سر میں کنگھا بھی نہیں ہوا۔ پھر اس پر باتیں سنانا۔ بظاہر تو یہ فیملی اتنی اچھی لگ رہی ہے۔

"یار! تھک تو واقعی گئی ہوں۔ تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے کافی پلا دو۔"

"ایک غریب ہیروئن کبھی کافی نہیں پیتی بلکہ سب کو پلاتی ہے' پھر ہیرو کو خیال آتا ہے اور اپنی کافی اسے پیش کر دیتا ہے۔"

"جھوٹ' میں نے ایسی کوئی فلم نہیں دیکھی اور دوسری بات یہ کہ کسی کی بچی ہوئی کافی میں تو کبھی نہ پیوں۔"

"پہلے آفر کی بات تو آنے دو' پھر منہ انکار کے لیے پیش کرنا اور صبح تم ناشتے میں کیا بنا رہی ہو؟"

"کچھ نہیں' ڈبل روٹی' انڈے۔۔۔ جو روزانہ ہوتا ہے۔"

"ایک تو تمہیں بھولنے کی بڑی بیماری ہے' تم نے چھولے پوری پلان کیا تھا۔"

"نہیں نہیں۔ مجھ سے پوریاں کبھی گول نہیں بنتیں' پھر چچی جان ڈانٹیں گی۔"

"تو سن لینا ڈانٹ۔ یہ تو اور اچھا ہو جائے گا' تمہاری فلمی کہانی میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے۔"

"یہ بات صحیح ہے۔" اس نے چٹکی بجائی۔

☆ ☆ ☆

"مجھے لگ رہا ہے افنان بھائی پر کچھ کچھ تو اثر ہو گیا ہے۔ کل تمہیں بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔"

"کس وقت؟"

"جس وقت امی پوریاں غلط بنانے پر تمہاری عزت

افزائی کر رہی تھیں۔"

"ہاں یاد آگیا۔ ویسے چچی جان کو اس بات پر اتنا غصہ کیوں آتا ہے؟ تم کوشش کرو معلوم کرنے کی کہ اس کے پیچھے کیا مسٹری ہے۔"

"میرا دماغ نہیں خراب کہ میں ہر وقت تمہاری باتوں کے پیچھے چلتی رہوں، ابھی تو یہ ڈراما چل رہا ہے، اگر شیری کو پتا چل گیا تو ہم دونوں کو کان سے پکڑ کر باہر نکال دے گا۔ تم جانتی ہو نا یہ بات۔"

"ہاں!" اس نے مری مری آواز میں کہا۔

"اسے بڑا شوق ہے ہم لوگوں کا گارڈ فادر بننے کا۔"

"تمہاری کوئی بھی شرارت اس کی آنکھوں سے چھپی نہیں رہتی، کیا اس کا اپنے پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔ کہنے کو تو وہ..."

"صحیح بات ہے۔ ابھی پرسوں بھی میرے کان کھا رہا تھا کہ تاباں! تم اپنا کام خود کیوں نہیں کرتی ہو۔ اور یہ کہ تم بہت کاہل ہو گئی ہو۔ ویسے حیرت کی بات ہے، مجھے لگتا تھا کہ شیری کو کسی کا خیال نہیں ہے، لیکن اب پتا چل گیا کہ میرے بھائی کو سب کا خیال ہے۔"

"اسی کا تو غم ہے۔" دائم نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اگر شہریار کا ڈر نہیں ہوتا تو اس ڈرامے میں تھوڑا سا ٹوئسٹ اور ڈالتے۔ بے چاری امینہ پھپھو کی تو حیرانی نہیں ختم ہوتی۔ پرسوں مجھے بلا کر کہہ رہی تھیں کہ مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ میں نے تمہیں غلط سمجھا، تم تو بہت پیاری بچی ہو۔"

"تمہیں شرم تو نہیں آئی ہوگی یقیناً۔" تاباں نے اسے گھورا۔

"ہاں نہیں آئی، تو اب کیا کریں۔" وہ شام کی بات بتانا چاہ رہی تھی۔ لیکن ذہن الجھ گیا تھا۔ اس لیے اس نے بتانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

چار سال سے وہ اس گھر میں تھی اور اس گھر میں رہنے والے کسی فرد کا وہ دل نہیں توڑ سکتی تھی۔ افنان کی بات اور تھی۔ یونہی مذاق چھوٹا سا مگر شہریار کو وہ صاف بتانا چاہتی تھی کہ اس کے خواب اس کی منزلوں میں کہیں بھی اس نام کے شخص کا پڑاؤ نہیں ہے۔ وہ اس کے لیے اچھا دوست ہو سکتا ہے، اچھا کزن اور بس۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔

بعض لوگوں پر قسمت بڑی مہربان ہوتی ہے۔ وہ امی، بابا کی لاڈلی تھی۔ اس کے منہ سے نکلی ہر بات کو انہوں نے پورا کیا۔ جب جہاز کے حادثے میں ان کا انتقال ہوا تو چچی جان اور چچا ابا نے اسے کبھی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ یہاں تاباں کا ساتھ تھا جو دوست بھی تھی اور بہن بھی۔ اور اسے یہ سارے رشتے بڑے عزیز تھے۔

"شہریار! تم نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ کیا ضرورت تھی اس قدر فالتو باتیں کرنے کی۔ لیکن خیر، اتنی فالتو بات بھی نہیں کی ابھی۔"

اس نے خود ہی صاف دلی سے اعتراف کر لیا۔

☆ ☆ ☆

"اچھی لڑکی ہے۔" ابھی ابھی دائم کمرے کی صفائی کر کے نکلی تھی اور اس کے جانے کے بعد افنان کے منہ سے یہ جملہ نکلا۔

"ہیں! کون اچھی لڑکی ہے؟" پھپھو فوراً افنان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"میں دائم کی بات کر رہا ہوں۔" افنان نے کی بورڈ پر ہاتھ چلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"اللہ بہتر جانتا ہے، مگر مجھے لگتا ہے اس گھر پر کوئی آسیب ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ کبھی ان فضول واہموں سے باہر نہیں نکلیے گا۔ ذرا سوچ سمجھ تو لیا کریں۔" افنان نے ناراضی سے کہا۔

"اچھا اب ماں کو نصیحتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کوئی غلط بات نہیں کر رہی ہوں۔ جب میں آئی تھی تب تو اس میں بالکل کوئی دوسری روح تھی اور اب تو لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی لڑکی ہے، بہت ہی حیرت کی بات ہے۔"

"اُف..." افنان نے جھنجلا کر کہا۔ "بالکل پرانے زمانے والے خیالات ہیں، اثر آسیب ہو جاتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مجھے ذرا موڈی سی لگی ہے اور جہاں اس قسم کا ماحول ہو وہاں پر تو بندہ سائیکی ہی ہو سکتا ہے۔"

"کس قسم کا ماحول؟" پھپھو نے حیرانی سے کہا۔

"ماحول تو بالکل صحیح ہے، بلکہ کچھ زیادہ ہی آزاد ہے۔ لڑکیوں کو اس قدر سر چڑھایا ہوا ہے کہ بس کیا بتاؤں۔"

"ہاں دیکھ تو رہا ہوں اور امی! آپ بہت عرصے سے میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی تھیں نا تو بس پھر دائم کے لیے بات کر لیجیے۔"

"کیا؟" ان کا دماغ گھوم گیا۔ "تم ہوش میں ہو۔"

"ایسی کون سی غلط بات کر دی میں نے شادی تو کرنی ہے نا تو بس یہی صحیح ہے۔"

"خاک صحیح ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ لڑکی میرے گھر آئی تو میں اسے ٹھیک کر دیتی۔"

"امی! یہ بالکل ٹھیک ہے۔ پتا نہیں آپ کیوں ایسی باتیں کر رہی ہیں، جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔" افنان نے صاف گوئی سے کہا۔ "اور ٹھیک لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔ صبح اس نے سب کو ناشتا دیا۔ پھر آپ کے کمرے کی صفائی کی۔ ساری چیزیں اپنی جگہ پر رکھیں۔ پھر آپ نے کہا۔ میرے سر میں تیل لگا دو، بہت درد ہو رہا ہے تو اس نے آپ کے سر میں تیل بھی لگایا۔"

"مطلب مجھے صحیح لگ رہا تھا کہ تم اپنا آفس کا کام صرف لیے بیٹھے ہو۔ کرنا کچھ نہیں تھا تم نے۔" انہوں نے کہا۔

افنان کو بے ساختہ ہی ہنسی آ گئی۔ "یعنی آپ راضی ہیں نا امی؟"

"ظاہری بات ہے، شادی تمہیں کرنی ہے تو پسند بھی تمہاری ہی ہو یہی صحیح رہتا ہے۔"

"اوف... اگر پاکستان کی ساری ماؤں کے خیالات آپ جیسے ہو جائیں تو کیا بات ہے۔"

"اچھا... اچھا اب خاموش ہو جاؤ۔ مناسب موقع دیکھ کر میں خود بات کر لوں گی۔"

☆ ☆ ☆

"دائم! حالات کچھ خراب جا رہے ہیں۔" تاباں نے فکرمندی سے کہا۔

"ہیں کون سے حالات؟ وہ تو کبھی بھی صحیح نہیں رہے۔ ویسے تم نے وہ شعر نہیں سنا۔

ہنستے پھرتے ہیں سرِ بزم انا کی خاطر
ورنہ حالات تو ایسے تھے کہ رویا کرتے

"میں تمہارے اس شعری ذوق سے بہت پریشان ہو گئی ہوں۔ پتا نہیں کون کون سے شعر سناتی رہتی ہو۔ ابھی جو خبر میرے کانوں تک آئی ہے، وہ سن لو گی تو صرف رونا نہیں آئے گا، بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونا آئے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونا بہت آسان کام ہے۔ بندہ تمہارے منگیتر کو دیکھ لے، بس پھوٹ پھوٹ کر رونا خود ہی آ جائے گا۔"

"اڑا لو مذاق، جب بات سنو گی تو چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔"

تاباں کے اس قدر پراسرار انداز میں کہنے پر اسے سنجیدہ ہونا ہی پڑا۔

"اچھا چلو بتاؤ۔" اس نے تکیے میں سے منہ نکالا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ تم فراز کا مذاق اڑاؤ اور میں تمہیں خبریں پہنچاتی رہوں۔"

"ارے مذاق کون اڑا رہا تھا۔ یوں ہی مجھ پر کبھی کبھار سچ بولنے کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"اب تم دفع ہو جاؤ۔" تاباں دھم دھم کرتی کمرے سے نکل گئی۔

"گدھی، الو۔" وہ دانت پیس رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔

"یہ گالیاں کسے دی جا رہی ہیں۔" افنان نے حیرت سے کہا۔

"اور... کون ہے۔ ہمارے گھر میں، صرف ایک ہی

ہستی ہے جسے یہ ساری باتیں کہی جاسکتی ہیں۔"

"اچھا۔!" افنان کو افسوس ہوا۔ آج کے دور میں بھی ہم لوگ اتنے ظالم ہیں کہ لوگوں کو ذلیل کرنے میں ایک منٹ نہیں لگاتے۔ کہنے کو یہ ساری فیملی کتنی سلجھی ہوئی لگتی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ رگڑ رگڑ کر کاؤنٹر کی صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ جب اچانک اسے اپنے پیچھے آہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ تیزی سے مڑی مگر شہریار کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"توبہ شیری! تم نے تو ڈرا ہی دیا۔" اس نے ایک دم دل پر ہاتھ رکھا۔

"کیوں میں نے ایسا کیا کر دیا؟"

"اتنے آہستہ سے آتے ہو اچانک چپکے چپکے۔"

"ہم مرد یہ کام نہیں کرتے۔" شہریار نے رکھائی سے کہا۔ "اچانک اور چپکے چپکے۔"

"اُفوہ! شیری! تم تو زبان پکڑتے ہو۔" وہ جھنجلائی۔ "اچھا بتاؤ کوئی کام تھا؟"

"نہیں۔" اب بھی ایک لفظ — اسے تشویش ہونے لگی۔

"بھئی شہریار! مسئلہ کیا ہے، تم طریقے سے بات کرو۔"

"کیا بات کروں؟ تم نے کون سا راستہ چھوڑا ہے بات کرنے کا۔"

"میں کہاں تمہارے راستے میں ہوں۔ یہاں ایک سائیڈ پر سنک کے ساتھ ہی لگی کھڑی ہوں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"تم جانتی ہو تمہارے لیے افنان کا رشتہ آیا ہے۔"

"کیا؟" وہ ایک دم جھٹکا کھا کر پیچھے ہٹی۔

"کیوں اب تمہیں کیا ہوا، یہی تو چاہتی تھیں نا تم۔"

"خوامخواہ! میں کیوں چاہنے لگی۔ بندے کو زندگی میں اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ بس وہ محبت ہی کرتا رہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب۔ مطلب تو کچھ نہیں ہے۔" اس نے اپنے آپ کو دل میں ڈانٹا۔ واقعی مجھے اپنی زبان پر کنٹرول نہیں ہے۔

کل وہ پوری رات جاگی بھی تھی اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ رات کا جاگنا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ آپ کوئی بات صحیح طریقے سے نہ سوچ سکتے ہیں، نہ کر سکتے ہیں۔ سر بھی — بھاری ہو رہا تھا اور اس پر شہریار پتا نہیں کون سی باتیں کر رہا تھا۔

"افنان کا رشتہ کس لیے بھئی! یہ سب تو ڈرامے میں شامل ہی نہیں تھا۔ وہ تو بس یوں ہی ایک تجربہ کرنا چاہ رہی تھی۔

ذرا سا مذاق، تھوڑی سی تفریح۔

اور نہ وہ مذاق ہی رہا، نہ تفریح۔ کوئی عجیب سی چیز بن گئی جیسے سر کا درد۔

"تم کہاں کھو گئی ہو، میں تم سے بات کر رہا ہوں۔"

"سن تو رہی ہوں۔" اس نے مری مری آواز میں کہا۔

"صرف سننا ہی کافی نہیں ہوتا، جواب بھی دیا جاتا ہے۔ تمہارا کیا جواب ہو گا؟"

"ظاہر سی بات ہے انکار۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

دائم نے کبھی کسی کے چہرے پر اتنی روشن مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔ جیسی اس وقت اس نے شہریار کے چہرے پر دیکھی۔ ایک روشن اجلی اور پیاری سی مسکراہٹ، لیکن اسے اس مسکراہٹ کے پیچھے نہیں جانا تھا۔ اس کا راستہ کہیں اور تھا۔ اس کی منزل یہ مسکراہٹ نہیں تھی۔ اور یہ وہ بات تھی جو تاباں کو بھی پتا نہیں تھی اور اس نے یہ سب کچھ — جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے پاس بتانے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ فقط دو ملاقاتیں — اگر انہیں ملاقاتیں کہا جائے تو۔

☆ ☆ ☆

وہ مریم کا بھائی تھا۔ مریم اس کی بچپن کی دوست تھی، لیکن یہ دوستی بس کالج کی ہی تھی۔ چچی جان اس معاملے میں سخت تھیں۔ ان کے اصول کے مطابق کالج کی دوستی کو وہیں تک رہنا چاہیے۔ اسے گھر میں لانے کی ضرورت نہیں۔

وہ پہلی دفعہ مریم کی سالگرہ پر اس کے گھر گئی تھی اور وہیں اس نے اس کے بھائی کو دیکھا تھا۔ وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا دائم سوچتی تھی۔ ہیرو جیسا، جو کسی محفل میں داخل ہو تو سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ جائیں۔ وہ جدھر جدھر جائے، سب کی نگاہوں کا مرکز وہی رہے۔

ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمی رہ جاتی ہو گی۔ دائم نے پورے دو گھنٹے اسے دل لگا کر دیکھا مگر اسے وہ باتیں بھی ایسی نظر نہیں آئیں جن کے متعلق وہ سوچتی کہ کاش اس شخص میں نہیں ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔

پھر مریم نے اسے عالی شان سے ملوایا۔

اس کا نام اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

اس نے تھوڑی دیر اس سے بات کی۔ پھر معذرت کرتے ہوئے دوسری طرف چلا گیا اور وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ جیسے کسی نے اسے جادو سے مجسمہ میں تبدیل کر دیا ہو۔

"کیا ہو گیا، اس طرح کیوں کھڑی ہو؟" مریم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں۔" اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

روشنیاں کیسے اپنا وجود کھوتی ہیں۔
ہنستی ہوئی محفل کیسے پھیکی پڑ جاتی ہے۔

یہ دائم نے اس دن جانا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے زندگی اتنی سادہ گزری تھی کہ سامنے کی بات بھی دھیان سے گزر جاتی تھی تو زندگی کی اتنی مشکل چیزوں میں کہاں گھستا تھا۔

اس دن وہ بہت رات تک جاگتی رہی اور اسی دن اسے پتا چلا کہ رات کو نیند پوری نہ ہو تو زندگی اور بھی اجیرن ہو جاتی ہے اور سر میں درد الگ۔

وہ پورا ہفتہ جھنجلائی ہوئی رہی۔ اور تاباں اس کا بغور مشاہدہ کرتی رہی۔

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ۔ اللہ نے رات بنائی ہے آرام کے لیے، سکون کے لیے۔" تاباں نے اسے بچوں کی طرح سمجھایا۔

"اور اس کے ساتھ پھر ایک دل بھی تو بنا دیا۔"

"یا اللہ! یہ جو تم نے ابھی کہا ہے، اسے فلسفہ کہتے ہیں نا، تو خدا کے واسطے یہ تمہارے اوپر سوٹ نہیں کرتا۔ اس لیے آئندہ کبھی نہیں بولنا۔"

"مطلب یہ کہ زندگی تمہارے مشورے سے گزاروں؟" اس نے چڑ کر کہا۔

"ظاہر سی بات ہے۔ کیونکہ وہ ایک چیز جسے عقل کہتے ہیں، اس کی غیر موجودگی میں کسی کو تو رہنما بنانا ہی پڑے گا۔ اس لیے اب یہ رہنما تم سے سوال پوچھ رہا ہے کہ کیا بات ہے — بلی کی طرح راتوں کو کیوں گھومتی رہتی ہو۔"

پاؤں جلی پر دائم نے گھور کر اسے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

"ہری اپ، بتاؤ۔"

دائم نے کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر بند کر لیا۔ وہ بات بتانے کی نہیں تھی، صرف خود کو سمجھانے کی تھی کہ ایک شخص اچھا لگا اور زندگی حرام ہوئی۔

"تم بولتے بولتے رک کیوں گئیں؟" تاباں نے اسے گھورا۔

"نہیں۔ دراصل میں سوچ رہی تھی کہ تمہیں کس قدر عادت ہو گئی ہے خود سے بات گھڑنے کی۔"

"ہاں میں تو پاگل ہوں۔" اس نے خفگی سے کہا۔

دوسرے دن کالج میں مریم نے اس سے کہا۔ "پتا ہے عالی شان بھائی کہہ رہے تھے کہ تمہاری دوست بہت معصوم ہے اور خوب صورت بھی۔"

یہ بات بہت سارے لوگوں نے کہی تھی۔ لیکن آج یہ بات جتنی نئی اور جتنی کانوں کو بھلی لگی تھی ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس نے رات کو سوتے ہوئے کتنی دفعہ یہ جملہ

دہرایا تھا۔ حتیٰ کہ دل و دماغ دونوں تھک گئے اور جبڑوں میں درد ہو گیا تو اس نے سختی سے اپنا منہ بند کر لیا تھا۔

"آج گھر چلو گی؟" مریم نے نوٹس بناتے بناتے سر اٹھا کر اس سے پوچھا۔

"کیوں؟" اس نے حیرانی سے کہا۔

"کیوں کیا مطلب' کیا ہم نے پہلے کمبائن اسٹڈی نہیں کی ہے؟"

"مگر وہ تمہارے بھائی۔"

"انہوں نے کیا کرنا ہے' وہ تو یوں بھی آفس میں ہوتے ہیں' انہوں نے آفس جوائن کر لیا ہے۔"

"اچھا!" دائم نے گہری سانس لی۔ اس وقت وہ خود بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ اس خبر سے اسے طمانیت حاصل ہوئی تھی یا پھر دل بے سکون ہوا تھا۔

کوئی چیز تھی جو اس کے قدم روکتی تھی۔ شاید اس کی تربیت میں دو ماؤں کا ہاتھ تھا۔ جب والدین کا جہاز کے حادثے میں انتقال ہوا تھا اس وقت وہ میٹرک میں تھی' اس لیے وہ نقش بھی مدھم نہیں تھے۔ پھر چچی جان جنہوں نے ماں کی طرح ہی دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی تھی اور ایک وہ دوست' جس نے کل ہی اپنے آپ کو رہنما کا خطاب دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"تمہیں کس بات پر ہنسی آرہی ہے؟" مریم نے ڈائننگ ٹیبل پر چیز رکھتے ہوئے اسے گھورا۔

"نہیں کچھ نہیں' مجھے تاباں کی بات یاد آگئی تھی۔"

"اس وقت بھی۔۔۔ تاباں نہ ہوئی' تمہاری زندگی میں کوئی ہیرو ہو گئی' جس کی باتیں تمہیں ہر وقت یاد آنے لگی ہیں۔" مریم نے مصنوعی آہ بھری۔

"آج کل ہیرو رہ کہاں گئے ہیں اور جو اپنے آپ کو سمجھتے ہیں' دیکھا جائے تو۔۔۔"

وہ ایک دم کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اسے کیا ضرورت ہے اتنی لمبی لمبی باتیں کرنے کی۔

"کون ہیرو ہے' کون زیرو' یہ تو حالات پر منحصر ہوتا ہے۔"

اور ابھی جس شخص نے اسے سر تا پا بدلا تھا' وہ کیا تھا۔ بالکل کسی فلم کے ہیرو جیسا ہی تو تھا۔ یعنی ہمیشہ ساری زندگی ہمیں ہیرو جیسی خوب صورتی رکھنے والے لوگ ہی متاثر کرتے ہیں۔ اس نے سر جھکا کر یہ باتیں سوچیں اور جب سر اٹھایا تو وہ بالکل سامنے موجود تھا۔ وہ اتنا اچانک نظر آیا تھا کہ وہ ڈر گئی۔

"آپ تو آفس میں ہوتے ہیں۔" اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

عالی شان نے پانی پیتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"آپ میری جاسوسی کر رہی ہیں کہ میں کس وقت گھر پر ہوتا ہوں اور کب آفس میں۔"

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ تو بس یوں ہی میرے منہ سے نکل گیا تھا۔"

"چلیں ایک چیز تو کلیئر ہوئی۔ اب دوسری بات کا جواب دیں۔ آپ مجھے دیکھ کر ڈر کیوں گئی تھیں۔"

"یا اللہ! کس مصیبت میں جان پھنس گئی ہے۔" اس نے سر جھکا کر دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگی اور تھوڑی دیر میں مریم آگئی۔

"ارے تم بور تو نہیں ہوئیں!" اس نے کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا۔

یہاں جان سولی پر اٹکی ہوئی تھی اور وہ اتنا آسان سوال پوچھ رہی تھی۔ "بور تو نہیں ہوئیں؟"

"تمہارے منہ کو کیا ہوا اور تم کچھ کھا پی بھی نہیں رہی ہو۔"

"کیا ہو گیا ہے کھا تو رہی ہوں۔"

"اچھا تم اتنا تھوڑا کب کھاتی ہو؟"

مریم نے حیرت سے کہا اور دائم کا دل چاہا' سالن کا ڈونگا اس کے سر پر الٹ دے۔ بھلا کیا ضرورت تھی ابھی یہ ساری باتیں کرنے کی۔ صبر کرنا اور چپ رہنا بھی لغت میں کوئی لفظ ہے کہ نہیں' لیکن یہ وقت غصہ کرنے کا تھا نہ مریم کو باتیں سنانے کا۔ اس لیے سر جھکائے چھوٹے چھوٹے لقمے منہ میں ڈالتی رہی۔

"آپ پلیٹ پر اس قدر جھک کر کیوں کھا رہی

ہیں۔" عالی شان نے حیرت سے اس کے سراپے پر نظر ڈالی۔ "یہ پلیٹ کہیں بھاگ نہیں جائے گی۔ اگر کوئی دور سے دیکھے تو یقین مانیں کہ وہ یہی سمجھے گا کہ آپ ضرور اس کھانے پر کوئی عمل کر رہی ہیں۔"

"عالی شان بھائی بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔" مریم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "حالانکہ یہ حضرت بھی صحیح بات کم کرتے ہیں مگر آج تو مزا آگیا۔"

"مسخرے کی بچی۔" عالی شان کے جانے کے بعد وہ مریم پر برس پڑی۔ "تم سے زیادہ بدتمیز دوست دنیا میں کسی کی نہیں ہو گی۔"

"میں نے کیا کر دیا۔ صرف ہنسی مذاق تو ہو رہا تھا جو ہم زندگی میں ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔" مریم نے حیرت سے کہا۔

"اگر ہمیشہ کرتے رہے ہیں تو کیا ضروری ہے کہ آگے بھی کریں۔"

"تم کو اچانک ہو کیا گیا ہے۔ مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔"

"کیوں۔ اب مجھے کیا ہو گیا ہے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"ارے۔ آہستہ بولو۔ کیسی پنجے مارنے والی بلی بنی ہوئی ہو۔" عالی شان بھائی کہیں گے' یہ ہے وہ لڑکی جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ اتنی معصوم لڑکیاں اب کہاں نظر آتی ہیں۔"

مریم نے اپنی ہی دھن میں کہا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ کسی کے چہرے کا رنگ کس قدر تیزی سے بدلا ہے۔ پورے جسم کا خون یوں لگ رہا تھا جیسے چہرے پہ سمٹ آیا ہو۔

وہ خود بھی حیران ۔۔۔ تھی۔ ہمیشہ ہر موقع پر ساتھ دینے والا دل اتنا بے مہر کس طرح ہو سکتا ہے کہ اس کی کوئی بات ہی نہ سنے۔

اگر اس وقت مریم اس کی طرف متوجہ ہوتی تو ایک منٹ میں سمجھ جاتی لیکن شکر تھا کہ اس نے بروقت اپنا منہ پھیر لیا تھا۔

"آج ذرا بھی پڑھائی نہیں ہوئی۔" مریم نے نوٹس بیگ میں گھساتے ہوئے کہا۔

"پڑھائی نہیں ہوئی تو کیا ہوا' بے عزتی تو بہت اچھی ہو گئی۔" اس نے بڑبڑا کر کہا۔

"تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ عالی شان بھائی کوئی باہر کے آدمی تو ہیں نہیں جو تم اتنی زیادہ سیریس ہو رہی ہو اور دوسری بات یہ کہ عالی شان بھائی کو اتنا زیادہ فرق نہیں پڑتا' عزت' بے عزتی۔۔۔" اس کے لہجے میں کوئی بات تھی عجیب سی' دائم نے اس کا چہرہ دیکھا مگر کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہی۔

"اچھا۔۔۔ مجھے گھر چھوڑ دو' مغرب ۔۔۔ ہونے والی ہے۔" اس نے بیگ کاندھے پر ڈالا۔

"سنی تو کرکٹ کھیلنے گیا ہے۔ میں عالی شان بھائی کے ساتھ چھوڑ کر آجاتی ہوں۔" مریم نے سلیپر پاؤں میں اٹکائے۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی' شہریار سامنے ہی ٹہل رہا تھا۔

"حد ہو گئی دائم۔" اس نے ناراضی سے کہا۔ "تمہیں پتا بھی تھا کہ آج ان لوگوں کے باہر جانے کا پروگرام تھا۔ پھر بھی تم اسٹڈی کرنے چلی گئیں۔"

"اف۔۔۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "یقین مانو بالکل دماغ سے نکل گیا۔ تم لوگ مجھے ایک فون ہی کر لیتے میں آجاتی۔"

"میں نے سوچا تھا' لیکن پھر سوچا کہ شاید تمہاری کوئی ضروری اپائنٹمنٹ ہو' اس لیے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا۔"

"ضروری اپائنٹمنٹ۔" اس نے گہری سانس لی۔ "اگر ابھی بتا دوں کہ دل کن باتوں کے پیچھے وہاں لے گیا تھا اور کتنا ضروری کام تھا تو پتا نہیں کیا ہو۔"

وہ تھکی تھکی سی وہیں لان میں کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا ہوا' تھک گئی ہو تو چائے بنا کر لادوں۔"

"نہیں' نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ شہریار بہت آرام سے دونوں کے کام کر دیا کرتا تھا ہاسٹل میں رہ کر اسے بہت سارے کام خود سے کرنے آگئے تھے۔ جن میں سرفہرست چائے بنانا تھی۔ وہ چائے بہت اچھی

بنا تا تھا اور وہ دونوں ڈھیٹ بن کر اکثر اس سے بنوا بھی لیا کرتی تھیں۔

"مجھے لگ رہا ہے تم پڑھ پڑھ کر واقعی تھک گئی ہو۔ جاکر آرام کرلو۔" اس کے چہرے پر غصے کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ شہریار کو یوں بھی غصہ کم ہی آتا تھا اور جب آتا تھا' دونوں کی جان جاتی تھی۔ تاباں کہتی۔

"مجھے تو شہریار کے مستقبل سے خوف آتا ہے۔ ہم تو اسے زن مرید ہونے کا طعنہ بھی نہیں دے سکتے۔ جب یہ ہم لوگوں کی اتنی پروا کرتا ہے تو بیوی کی بھی خوب کرے گا؟"

"اور تم پرانے زمانے کی نندوں کی طرح جل جل کر مرجانا۔" وہ اسے فوراً ٹوک دیتی۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں تم سے جیلس ہو جاؤں۔" تاباں نے بے دھیانی سے کہا۔

"کیا۔۔۔ دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟" وہ چلائی تھی۔

"کیوں کیا ہو گیا۔ میرے بھائی میں کیا خرابی ہے۔" تاباں نے خفگی سے کہا۔

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ کبھی کبھی بات خرابی کی نہیں ہوتی۔ اس خلل کی ہوتی ہے جسے محبت کہا جاتا ہے۔ دل کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔ اپنی خواہشیں ہوتی ہیں اور اپنی چاہتیں ہوتی ہیں۔ اور کون جان سکتا ہے کہ ان چاہتوں' ان خواہشوں کے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ جب آپ رات رات بھر جاگتے ہوں اور پھر یوں لگتا ہو کہ دنیا میں آپ کے لیے کہیں کچھ نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ تھک گئی تھی اس تمام صورت حال سے اور اللہ جانے نکلنے کا کوئی راستہ تھا بھی کہ نہیں۔ تاباں دو دفعہ اندر آئی لیکن اس نے دائم کو اٹھایا نہیں وہ اس کے ہر رنگ سے مانوس تھی۔ اس کی ہر بات کی خبر رکھتی تھی لیکن اب نہ اس کے رنگ سمجھ میں آرہے تھے' نہ وہ خود سمجھ میں آرہی تھی۔

ابھی تو وہ شرارت بھی انجام کو نہیں پہنچی جس کو بہت ذوق و شوق سے شروع کیا تھا۔ وہ بھی عجب قصہ ہوا۔ افنان اچھا شخص تھا اگرچہ شہریار کی بات نہیں ہوتی۔ امینہ پھپھو نے تو بات بھی کرلی تھی مگر امی کو ساری باتیں اندر ہی ختم کرنی پڑیں اور تاباں کو بڑی مشکل سے سمجھانا پڑا کہ دائم اس گھر سے کہیں جائے گی۔

"مگر کس لیے؟" امی نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"بے شک ابھی شادی نہ کریں۔ منگنی کرلیتے ہیں۔ روز روز ایسے رشتے کہاں ملتے ہیں۔"

"نہ ملیں اور پھپھو کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے پہل تو انہوں نے دائم میں اتنے کیڑے نکالے کہ حد نہیں اور اب اچانک رشتہ بھی ڈال دیا؟"

"ان کی اپنی مرضی ہے۔ کیا کہہ سکتے ہیں اور تمہیں کیا تکلیف ہے جو تم اچھے بھلے رشتے میں رخنے ڈال رہی ہو۔ کل کو دنیا کی باتیں سنی ہیں کہ گھر بٹھا کر رکھ لیا اور شادی نہیں کی۔"

"حد ہو گئی' یہاں تو کسی کو کوئی بات سمجھانی ہی مشکل ہے۔ فوراً" دنیا کی پروا کرلی۔ اپنے بیٹے کا خیال نہیں آیا۔"

"اس کا کیا خیال کروں' اس کی بھی ہو جائے گی۔ بیٹوں کی شادی کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

"قسم سے امی! مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ اتنی بھولی ہوں گی۔ اب آپ کو صاف صاف بتاتی ہوں۔ دائم کی شادی شیری سے ہوگی بس میں نے کہہ دیا۔"

"عجیب بات ہے۔" امی نے برا مان کر کہا۔ "اس وقت نہ شہریار موجود ہے۔ نہ دائم۔ تمہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ اپنے فیصلے زبردستی مسلط کرو ان پر۔"

"امی! اس میں زبردستی کہاں ہے۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہی ہے۔"

"غلط بات ہے بیٹا! یہ زندگی بھر کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ یونہی نہیں کہہ دیتے۔ زندگی کے یہ سارے فیصلے اصل میں فیصلے نہیں آگ کے دریا ہوتے ہیں۔ آپ نے ایسا فیصلہ کرنا ہے کہ آپ دریا کے پار بھی اتر جائیں اور جلیں بھی نہیں۔"

"امی۔۔۔ آپ کیسی خوف ناک بات کر رہی ہیں۔"

تاباں نے منہ بنایا۔

"اور اگر پھپھو نے ابا سے بات کرلی۔۔۔ پھر کیا ہو گا؟"

اس کو فکر بھی ہو رہی تھی اور اب دائم پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ بھلا کیا ضرورت تھی مظلوم ہیروئن بننے کی کہ مارے ہمدردی کے رشتہ ہی آگیا ہے۔ لیکن اس سے ایک بات تو پتا چل گئی کہ افسانوں' ڈراموں میں سب ہی کچھ جھوٹ نہیں ہوتا۔"

"اب تم کہاں کھو گئیں۔" امی نے بے زاری سے کہا۔

"نہیں کچھ نہیں۔ آپ بتائیں۔ کیا کہہ رہی تھیں؟"

"جو میں کہہ رہی تھی۔ وہ تمہیں سمجھ میں آیا یا نہیں۔"

"ہاں آگیا۔ اب خدا کرے سب کی سمجھ میں یہ بات آجائے۔"

اس نے دل ہی دل میں کہا اور اٹھ کر کمرے میں آ گئی۔

دائم ابھی تک بستر میں تھی۔

"شاپنگ پہ چل رہی ہو۔"

"ہاں چلو۔" وہ چھلانگ مار کر بستر سے باہر آگئی۔

"سچ بڑے دن ہو گئے ہیں۔ زندگی کا کوئی نارمل کام کیے ہوئے۔"

"اچھا! حالانکہ ہم لوگ جیسی شاپنگ کرتے ہیں۔ اسے دیکھ کر تو شہریار کہتا ہے' مجھے تم لوگ کہیں سے بھی نارمل ہی نہیں لگتیں۔"

"دفع کرو اس مظلوم ہیروئن کو۔ میں ایک مہینے سے یہ ڈراما کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ پتا نہیں لوگ اتنا کام کس طرح کرلیتے ہیں۔ سچ! برتن دھو دھو کر میرے ہاتھوں میں درد ہو گیا تھا۔ ہاں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ گھر کے سارے برتن چمک گئے تھے۔"

جس وقت وہ دونوں تیار ہو کر نکل رہی تھیں۔ افنان نے دونوں کو دیکھ لیا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ دونوں؟"

"شاپنگ کرنے۔" دائم نے اطمینان سے جواب دیا۔

"آئیں۔ میں چھوڑ دیتا ہوں۔ شہریار کی گاڑی آج گھر پر ہی ہے۔"

"نہیں جی شکریہ۔ ہم لوگ چلے جائیں گے۔"

دائم نے ایسا ٹکا توڑ جواب دیا کہ تاباں اس کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی۔

"شرم تو نہیں آتی۔"

"کیوں اب میں نے کیا کر دیا۔" اس نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "منع ہی تو کیا ہے پتھر اٹھا کر تو نہیں مار دیا تھا۔"

"اس سے تو بہتر ہی ہوتا۔" تاباں نے بڑبڑا کر کہا۔ "وہ مہمان ہے۔ مہمانوں کی عزت کی جاتی ہے۔"

"اور۔۔۔۔ لڑکی کی عزت۔ وہ بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں۔"

"ہیں!" تاباں نے حیرانی سے کہا۔

"تمہاری عزت کو اچانک کون سے خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ اس بے چارے نے یہی تو کہا تھا کہ میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔۔ اور اس کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ جی چاہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نوچ لوں۔"

"نہیں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں بھی تمہارے ساتھ ہی کھڑی تھی اور مجھے بھی نظر آرہا تھا۔ تم سے زیادہ بہتر تم سے زیادہ اچھا۔"

"اور مجھے پتا چل گیا ہے' اتنی دیر سے تم مذاق کر رہی ہو نا۔"

تاباں ایک دم خوش ہو گئی۔ آج کتنے عرصے بعد یہ موقع آیا تھا کہ وہ اس طرح شرارتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہ دونوں مل کر کیا کرتی تھیں اور اسی طرح شاپنگ کی' جس کا ہمیشہ شہریار مذاق اڑاتا تھا۔

دکان والا بے چارہ اپنی چیزیں پھیلائے کھڑا ہے۔ تعریفیں کر کے اس کا حلق سوکھ گیا ہے اور دائم کی نظریں برابر کی دکان کی کسی چیز پر ٹکی ہوئی ہیں۔

"آؤ! وہ دیکھ کر آتے ہیں۔ وہ زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔"

"باجی جی... اس کو تو دیکھ لیں۔"
"تم دیکھ لینا' آئندہ۔ یہ ہمیں اپنی شاپ میں گھسنے بھی نہیں دے گا۔"
"اس کی ایسی کی تیسی۔ دکان کیا اس کے باپ کی ہے۔"
"اگر اس کے باپ کی نہیں تو تمہارے باپ کی بھی نہیں ہے۔"
"یہ بات بھی صحیح ہے تو پھر کیا کریں۔"
"کچھ نہیں کرنا۔ کیونکہ اب ہم وہاں سے نکل آئے ہیں۔"
"تاب! ادھر آؤ۔"
"کیا ہوا؟"
"یہ وہی شاپ ہے نا۔ جہاں اس نے ہم سے پورے دو سو روپے زیادہ لیے تھے۔"
"دیکھو... وانم!" تاب ڈر گئی۔ "اب تم ادھر جا کر کوئی بدتمیزی نہیں کرنا۔"
"بدتمیزی نہیں کر رہی کوئی لیکن بے ایمانی کی سزا تو ملنی چاہیے نا۔" وہ ہاتھ چھڑا کر دکان میں گھس گئی۔
"اف اللہ!" تاباں نے ٹھنڈی سانس لی اور دل کڑا کر کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر مزے کا سین تھا۔
دکان دار صفائیاں دے دے کر پریشان تھا مگر وانم نے اس کی ایک نہیں سنی۔ اس کی چیزوں میں نقص نکالا۔ اس کے تین کسٹمر نے ضرورت کی خریدی ہوئی چیزیں بھی واپس کر دیں تو اطمینان سے باہر نکل آئی۔
"چلو اب کچھ کھا پی لیتے ہیں۔"
"ہاں چلو مگر ساری میری پسند کی چیزیں منگوانا۔"
"شیری صحیح کہتا ہے۔ ہم دونوں کا انتقال کسی فوڈ سینٹر میں ہو گا۔ ابھی آدھا تکہ منہ میں کہ روح قبض۔"
"قسم سے اگر تحقیق کی جائے تو ہمیں پتا چلے گا کہ شیری ضرور کسی جنم میں ساس کے عہدے پر فائز رہا ہو گا۔ کیا ضرورت ہے اتنی خوفناک بات کرنے کی ویسے میں نے سنا ہے۔ ساس ہر وقت بہو کے کھانے پینے پر نظر رکھتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ یہ صحیح بات ہے؟"
"مجھے... کیا پتا میں نے کون سی سا سیں بھگتائی ہیں اور تمہیں جو خریدنا ہے' اب خرید لو بہت ڈرامے کر لیے۔"
"بہت دن ہو گئے تھے نا یہ سب کچھ کیے ہوئے۔"
"شکر ہے تمہیں کچھ یاد بھی ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ سب کچھ بھلا دیا۔" تاباں کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی افسردہ ہو گیا۔
"پاگل ہو تم تو۔" اس نے کہا ضرور لیکن لہجے کا کھوکھلا پن خود سے بھی چھپا نہیں رہ سکا۔
کون پاگل ہونا چاہتا ہے۔ ایک عجیب سلسلہ تھا۔ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔
افنان نے منہ سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہتی تھیں اور پھر شیری تھا جس کے ساتھ دوستوں والا رشتہ تھا۔
اور جس کے ساتھ دل نے محبوب والا رشتہ بنایا تھا۔ وہ شاید دنیا کا سب سے سنگ دل شخص تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا کہ ایک لڑکی چپکے چپکے اس کو کتنا سوچتی ہے۔ اس کی نظر کرم اور التفات کی منتظر رہتی ہے۔
تاباں نے چلتے چلتے ایک نظر اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے پر ڈالی۔ وہ پھر ایک فیز سے نکل کر دوسرے فیز میں داخل ہو رہی تھی۔ اور اس کے اختیار میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ جس سے وہ اسے روک پاتی۔ چیزیں اپنے دائرہ کار میں نہیں ہوتی ہیں۔ تقدیر کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور تدبیر تک اس کی رسائی نہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"ارے تم سوچنے میں کتنا ٹائم لگاتی ہو۔ پہلے تو کبھی نہیں سوچا۔" مریم نے حیرت سے کہا۔
"پہلے سوچنے والے حالات نہیں تھے۔" اس نے رسان سے کہا۔
"تو اب کون سی آفت آ گئی۔ جلدی سے بتاؤ۔"
"کوئی بھی چیز بتا کر تھوڑی آتی ہے۔" اس کا لہجہ بالکل مدھم تھا۔ "اور میں اب تمہارے گھر بھی نہیں جاؤں گی۔" اس کا انداز قطعی تھا۔
"بالکل پاگل ہو گئی ہو۔" مریم نے مڑ کر کہا۔
"تاباں بھی یہی کہتی ہے۔ میں واقعی پاگل ہوں۔" اس کے لہجے میں نامعلوم سا دکھ اتر آیا۔ اسی وقت فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔
"یہ کیا ہوا؟" مریم گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔
"پتا نہیں۔ ہم لوگ اب ان سب چیزوں کے عادی کیوں نہیں ہو جاتے۔" اس نے بےزاری سے کہا۔
"کیوں عادی ہو جائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم ایک بے حس اور مردہ قوم ہیں۔" مریم نے چمک کر کہا۔
"اب بھی کیا شک ہے اس چیز کے ہونے میں۔"
"تم تو قنوطی ہوتی جا رہی ہو۔ ہر چیز کا صرف تاریک پہلو ہی دیکھتی ہو۔ علامہ اقبال فرما گئے ہیں۔ 'پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ'"
"مگر شجر پیوستہ ہی تو نہیں ہے۔" اس نے سرد آہ بھری۔
اسی وقت کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور یہ کہیں باہر کی آواز نہیں تھی۔ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ بہت قریب ہوا تھا۔ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو گیا۔ دھماکے نے جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی چھین لی تھیں۔
وہ اتنی بھی بہادر نہیں نکلی۔ جتنا خود کو سمجھتی تھی۔ صرف اسے یہ نظر آ رہا تھا کہ ابھی ابھی وہ جس قوم کی بے حسی پر نوحہ کناں تھی۔ وہی لوگ بہت جانفشانی سے کام کر رہے تھے۔ بھاگ دوڑ کر رہے تھے ان دوسرے لوگوں کی زندگیاں بچانے کے لیے' جن سے ان کا کوئی بھی رشتہ نہیں تھا۔ اس بات سے بھی بے پروا ہو کر کہ ہو سکتا ہے۔ ابھی یہاں پر دوسرا دھماکا ہو جائے۔
اس کے بیگ میں پڑا موبائل بج بج کر خاموش ہو گیا تھا' مگر اس کے ہاتھوں میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ اسے اٹھا کر ریسیو ہی کر لیتی۔
حادثے کے بارے میں پڑھنا اور خود اس کا حصہ بننا۔ دو بالکل مختلف باتیں ہیں۔ مریم نے ہی اس کا فون ریسیو کیا۔ خیریت کی اطلاع دی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لائی۔
"چلو گاڑی میں بیٹھو۔" اس نے تقریباً" اسے دھکا دیا۔ اس کا ذہن اتنا ماؤف تھا کہ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ اس کی گاڑی کون چلا رہا ہے۔
گاڑی کا ماحول ٹھنڈا اور پرسکون تھا' خوشبو میں بسا ہوا۔ صرف آدھے گھنٹے میں وقت اور منظر دونوں بدل جاتے ہیں۔ اس نے سر پیچھے کی طرف ٹکا دیا۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ گہری نیند۔
دوبارہ وہ جاگی تو پہلے تو اسے یاد ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے' پھر آہستہ آہستہ ذہن نے کام کرنا شروع کیا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس کا کمرا نہیں تھا۔ وہ کہاں تھی۔ "کیا مریم کے گھر میں۔ آج ہی تو اس نے..."
کیا بندے کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ ایک چھوٹی سی بات بھی نہیں... اور دعوے وہ کتنے بڑے بڑے کرتا ہے۔ اسی وقت دروازے پر دستک دے کر کسی نے قدم رکھا۔
"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" عالی شان کے لہجے میں فکرمندی تھی۔
"ٹھیک ہوں۔"
"لگ تو نہیں رہا۔"
اب اس کا۔ وہ کیا جواب دیتی۔
"آپ لڑکیوں کے دل اتنے کمزور کیوں ہوتے ہیں نازک سے۔ بھئی انسان کو مضبوط ہونا چاہیے۔ آج کل دنیا میں لڑکیاں کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں اور ایک ہمارے پاکستان کی لڑکیاں ہیں... فوراً" بے ہوش۔"
"پاکستان کی لڑکیاں... یہ کیا جملہ ہے۔" اس نے ناگواری سے کہا۔ دل میں شدید غصہ بھی آ رہا تھا۔
"کس نے کہا تھا منہ اٹھا کر بے ہوش ہو جانے کو؟"

"ہم لڑکیوں جتنی بہادر تو کسی قوم کی لڑکیاں نہیں ہو سکتیں۔ ہماری لڑکیاں گھر بھی سنبھالتی ہیں' جاب بھی کرتی ہیں۔ پورے سسرال کا بھی خیال کرتی ہیں اور بچوں کی اچھی تربیت بھی۔ آئی سمجھ میں بات۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"آپ بہت اچھا بولتی ہیں۔"

"پتا ہے مجھے......"

"آپ کو کس طرح پتا ہے۔"

"انسان کو اپنے متعلق ہر بات پتا ہوتی ہے۔" اس نے چڑ کر کہا۔ وہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی اور دیکھنا بھی نہیں۔ یہ دونوں چیزیں پھر رات کو پریشان کرتی ہیں اور اب تاباں سے چھپانا اسے اچھا نہیں لگتا تھا اور بتانے کو کوئی بات نہیں تھی۔

"مریم آپ کے لیے سوپ بنا رہی ہے۔ اس کے بعد میں اور مریم آپ کو گھر چھوڑ آتے ہیں۔"

"نو تھینکس۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کوئی نہ کوئی آجائے گا مجھے لینے۔ مریم نے فون کر دیا ہو گا۔"

"ہاں وہ لوگ تو اسی وقت آرہے تھے۔ مگر ہم نے منع کر دیا۔ حالات صحیح نہیں تھے۔"

"اور حالات ابھی بھی صحیح نہیں ہیں۔" اس نے دل میں سوچا۔ تھوڑی دیر بعد مریم بھی آگئی۔

"آج سورج کہاں سے نکلا ہے۔" پھر وہ عالی شان کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پتا ہے بھائی نے آج تک اتنی باتیں کسی سے نہیں کی ہوں گی۔ تم بڑی خوش نصیب ہو۔" مریم نے مذاق کیا۔

اور اسے کہاں پتا تھا کہ یہ خوش نصیبی صرف یہیں تک نہیں رہے گی۔ بہت آگے تک جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"شہریار کی گاڑی میں بڑی عجیب سی بو تھی' اس کا سر چکرانے لگا۔

"شہریار! کیا حال بنایا ہوا ہے گاڑی کا۔ مجھے لگ رہا ہے بدبو سے دوبارہ بے ہوش ہو جاؤں گی۔"

اسے عالی شان کی گاڑی یاد آگئی۔ خوب صورت چمکتی ہوئی عالی شان سی۔ اسے شہریار پر غصہ آنے لگا۔

"اب بھی تمہاری طبیعت صحیح نہیں لگ رہی۔" اس نے فکر مندی سے اسے دیکھا۔

"بے وقوف لڑکی! کم از کم فون تو ریسیو کرتے ہیں تاباں کا تو برا حال تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی ہیں۔"

"اور کون رویا؟" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اپنی اہمیت کا احساس ہمیشہ ہی خوش کن ہوتا ہے۔

"ایک خوب صورت بندہ تمہیں سامنے بیٹھا نظر نہیں آرہا ہے۔" شکر تھا کہ اس کا لہجہ مذاق والا تھا۔ ورنہ وہ ضرور کوئی چیز اٹھا کر اس پر دے مارتی۔ وہ گھر میں گھسی تو تاباں نے اسے گلے سے لگا لیا۔

"بہت خراب ہو تم..... اتنے برے برے خیالات دل میں آرہے تھے۔ بہت ڈر لگ رہا تھا۔"

"ڈر کی کیا بات ہے۔" چچی جان نے اسے پیار کیا۔ "میں نے صبح جاتے ہوئے آیت الکرسی پڑھ کر پھونک دی تھی۔ جب اتنی ساری دعائیں ساتھ ہوں اور پھر اللہ کی حفاظت..... تو کچھ نہیں ہوتا۔"

اس رات پھر اس نے سوچا۔

محبتیں' چاہتیں' زندگی کی خوب صورت کہانیاں ہیں اور جو کچھ آج دوپہر میں ہوا یہ بھی زندگی کا ایک رخ تھا۔ شاید زندگی اسی طرح چلتی رہے۔

چاروں طرف پھیلا سناٹا اور اندھیرا..... صرف افنان کے کمرے سے ہلکی سی روشنی باہر آرہی تھی۔ وہ باہر آکر لان میں بیٹھ گئی۔ اور بیٹھنے کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ وہاں کوئی اور بھی موجود ہے شاید افنان..... شیریار تو آج سارا دن ہی گھر میں نہیں تھا اسے گھر واپس لا کر پھر پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔

شہریار کا بدلا اس کے پاس نہیں تھا مگر افنان سے معافی مانگ سکتی تھی۔

"آج کیسے خیال آگیا اچانک۔" افنان نے مسکرا کر کہا۔

"اچانک نہیں تو۔" اس نے اندھیرے ہی میں گھاس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"آج جب کالج میں بم بلاسٹ ہوا تھا۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی اتر آئی۔ "تو جو بھی اس دنیا سے چلا گیا۔ ان میں میں بھی ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا' شاید یہ مہلت ہے۔ اپنی جن غلطیوں کی معافی مانگ سکتی ہوں۔ کم از کم وہ تو کر لوں۔ اس لیے ابتدا آپ سے کرلی۔"

"ارے نہیں..... ایسی کیا بات ہے۔ وہ تو شرارت تھی۔ شرارت کی معافی کیا مانگنا۔"

"آپ کو غصہ تو آیا ہو گا۔"

"اس سوال کا جواب رہنے دو۔ رات زیادہ ہو گئی ہے جا کر سو جاؤ۔"

"مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔"

"کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتا دو یا شیری کو' تاباں کو۔ تمہارے پاس تو بہت سارے لوگ ہیں۔"

"وہ سارے لوگ ہی تو میرا مسئلہ ہیں۔ جن کے دل میرے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ اس دل نے کسی اور کے لیے دھڑکنا شروع کر دیا ہے۔" وہ خاموشی سے سوچے گئی۔

دوسرے دن چچی جان نے اسے طلب کر لیا۔ وہاں بہت ساری باتیں ہوئیں۔ جن کا لب لباب یہ تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور یہ کہ زندگی اسے گزارنی ہے اس لیے فیصلہ بھی اسے ہی کرنا ہے۔ سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا اور سارے فیصلوں کا بوجھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس وقت بھی وہ بیٹھے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ مریم نے اسے ٹھوکا دیا۔

"میں دیکھ رہی ہوں۔ تم آج کل بہت سوچنے لگی ہو۔"

"عقل مند لوگ سوچتے ہی ہیں۔" اس نے بات مذاق میں ٹالی۔

"واہ واہ۔ کیا خوب صورت بات کہی ہے۔ میں جانتی تھی تمہارے منہ سے اسی قسم کے پھول جھڑیں گے۔" مریم نے ناک چڑھائی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"عالی شان بھائی کہتے ہیں یہ ملک رہنے کے قابل ہی نہیں۔ وہ واپس چلے جائیں گے۔ اسی لیے امی چاہ رہی ہیں کہ جانے سے پہلے ان کی شادی کر دیں یا منگنی۔ ایسا ضرور کچھ کر دیں۔ جس کی وجہ سے وہ پاکستان آسکیں۔"

"کیا ضرورت ہے آنٹی کو اتنے جتن کرنے کی۔ اگر انہیں آنا ہو گا تو وہ تم لوگوں کی خاطر بھی آسکتے ہیں۔" اس نے چڑ کر کہا۔

"افوہ! تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم انہیں جانتی نہیں ہو۔ وہ بہت پریکٹیکل قسم کے آدمی ہیں' نفع نقصان ہر چیز پر ان کی نظر ہوتی ہے۔ محبت' جذبات' رشتے' یہ ساری چیزیں ان سے پرے ہی رہتی ہیں۔"

"شرم تو نہیں آئی نا بھائی کے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے۔"

"اس قسم کی باتیں۔ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں تو حقیقت ہی بیان کر رہی تھی۔ تمہیں پتا نہیں کیوں برا لگ گیا اور خدا کے واسطے۔" مریم نے ایک دم ہاتھ جوڑے۔

"عالی شان بھائی کو پسند کرنے کی حماقت نہیں کرنا۔"

"کیا بدتمیزی ہے۔ دماغ صحیح ہے تمہارا۔" وہ ایک دم سے بوکھلائی۔

"بدتمیزی تو میں نے کوئی نہیں کی ہے۔ تمہیں ایک عقل مندانہ مشورہ دے رہی تھی۔ اس میں اتنا براری ایکٹ نہیں کرو۔ عالی شان بھائی بہت اچھے ہیں ہمارے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو انہیں جانتے نہیں ہیں اور ایک بات اور بتاؤں! امی ان کے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی تھیں تو انہوں نے تمہارا نام لیا ہے۔"

"کیا؟" غنیمت تھا کہ وہ گھاس پر بیٹھی ہوئی تھی اور گھاس زمین پر اُگی ہوئی تھی۔ یعنی وہ زمین پر تھی۔ حالانکہ اسے تو آسمانوں پر پرواز کرنا چاہیے تھا۔ بادلوں کے ساتھ اُڑنا چاہیے تھا۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی۔

دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہو جاتی ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم رہی۔

"اے محترمہ!" مریم نے اس کا کندھا ہلایا۔ "کون سے یوٹوپیا میں چلی گئی ہو۔ میں نے جو کچھ سمجھایا ہے کچھ اس کا اثر بھی ہوا یا نہیں۔"

"کیا سمجھایا؟" اس کا ذہن اس کے الفاظ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ "تم نے کچھ کہا تھا مریم! مجھے بالکل یاد نہیں۔ میرا ذہن بالکل خالی ہو گیا ہے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"اچھا چلو۔" مریم نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ "میں دعا کروں گی تمہارا دل وہ نہ کرے جو دماغ نے کیا ہے۔ دل کبھی خالی نہ ہو۔ اس میں خوشیاں رہیں اجالے، روشنی سب کچھ۔ سب کچھ اس دل میں سما جائے۔"

مریم نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔ تب ہی اس کے سیل پر رنگ ہوئی۔

"عالی شان بھائی آ گئے ہیں۔ کہو تو گھر ڈراپ کر دوں۔"

"نہیں چلی جاؤں گی۔" اس نے انکار میں سر ہلایا۔ کچھ عجیب سی دل کی حالت تھی۔ وہ اس کا سامنا نہیں کر سکتی تھی اور جو بات ابھی ابھی اس نے سنی تھی، اس کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔

"اب تم اس طرح کرو گی، پرانے زمانے کی فلمی ہیروئنز کی طرح۔" مریم نے اس کا بازو پکڑا۔

وہ چپ رہی۔ ابھی تو یہ طے ہی نہیں ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تم کیا کرتی رہتی ہو۔" شہریار نے کرتے کی آستین فولڈ کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" وہ ہنوز مصروف رہی۔

"تم واقعی مصروف ہو یا نظر آنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے۔" اس نے ڈسٹر نیچے رکھ دیا۔

"مجھے اب کچھ نہیں لگتا۔ لیکن پہلے لگتا تھا کہ تم پاگل ہو گئی ہو۔"

"اور بھی کچھ کہنا ہے۔" اس نے تحمل سے کہا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ لڑائی کیوں نہیں کرتی ہو۔"

"بری بات ہے اچھے بچے دوسروں کو لڑائی کرنے پر اکساتے نہیں ہیں۔" ایک دم اس کا پرانا لہجہ لوٹ آیا۔ نرم لہجے میں ایسی بات کہنا کہ اگلے کو آگ ہی لگ جائے۔ تاباں ہمیشہ اس سے یہی کہتی۔

"قسم سے دائم! تم بڑی فسادی ہو۔

اور وہ کہتی "قسم سے بڑا مزا آتا ہے۔"

اور اب پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ زندگی کے سارے مزے ختم ہو گئے تھے۔ یا خود زندگی ختم ہو گئی تھی۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔

ایک شخص تھا اور اس کی یادیں تھیں۔ جو وقت کے ہر لمحے میں اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔

اور دوسرا شخص سامنے تھا اور دل میں کہیں کچھ ہوتا نہیں تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔

"کچھ دنوں تک یہی حال رہا تو لوگ پتھر مارنے لگیں گے۔" دائم نے خود ہی دل میں سوچا۔

"اتنی پیاری شکل تھی اب اس پیاری شکل پر خزاؤں کا پہرا ہے۔" تاباں نے افسردگی سے کہا۔

"اچھا اب اتنا برا نقشہ نہ کھینچو۔"

"کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔ آئینے میں اپنی شکل دیکھو۔" تاباں نے اسے کھینچ کر آئینے کے سامنے کھڑا کیا۔

"ممی بھی پرسوں آمنہ پھپھو بھی کہہ رہی تھیں کہ اس لڑکی کو ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ دو مہینے میں اس کے چار رنگ دیکھ چکی ہوں۔"

"میری طرف سے وہ آٹھ رنگ دیکھ لیں۔ مجھے

کوئی فرق پڑتا ہے؟" اس نے بے زاری سے کہا۔

"اطمینان رکھو۔ صرف پھپھو ہی نہیں۔ ہم لوگ بھی یہ سارے رنگ دیکھیں گے اور ہم لوگ تو شاید پھر درگزر کر دیں کہ ہم سب ہی تم سے محبت کرتے ہیں مگر دنیا نہیں۔ لوگوں کی آنکھوں اور لہجے میں بھی بہت کچھ ہوتا ہے مگر تمہیں کچھ ہوش بھی تو ہو۔"

"اچھا۔ اب ڈراؤنی باتیں بند کر دو۔" اس نے تکیہ منہ پر رکھا۔

"اب بڑی ہو گئی ہو۔ بچوں والی حرکتیں چھوڑ دو۔"

"پتا نہیں مسئلے حل ہوں گے یا نہیں۔ مگر میں خود حل ہو رہی ہوں آہستہ آہستہ غم کے سمندر میں۔"

"ہائے اللہ نہ کرے۔" تاباں زور سے چیخی۔ "کچھ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔ تمہیں کیا غم ہے اور ہماری دعا ہے کہ غم کبھی تمہارے پاس بھی نہ آئیں۔"

"یہ کس کو دعائیں دی جا رہی ہیں۔" شہریار نے دستک دے کر کمرے میں قدم رکھا۔

"بس یوں ہی۔ دعا دینے کا دل چاہ رہا تھا۔" تاباں نے بے نیازی سے کہا۔

"حالانکہ اس نے ابھی تک ایسا کوئی کام کیا نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں شرارت تھی۔ وہ ایسا ہی تھا ہنس مکھ، شرارتی سا۔ ہر چیز چٹکیوں میں اڑانے والا۔ بہت ساری خوبیاں تھیں اس میں۔ دائم نے ایمان داری سے سوچا۔ کاش! ایک صفائی کی بھی عادت ہوتی اس دن کا تصور کر کے ہی اسے الٹی آنے لگی تھی۔ جب بم دھماکے والے روز شہریار اسے مریم کے گھر سے لے کر آیا تھا۔

گاڑی میں کتنی عجیب سی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اور ایک عالی شان کی گاڑی تھی۔ خوشبو میں بسی ہوئی اس کی شخصیت کی طرح۔

"تمہارے چہرے پر اتنے برے اور اچھے تاثرات بیک وقت کیوں آ اور جا رہے ہیں۔"

تاباں کہتے ہوئے پانی پینے چلی گئی۔

"سچ تمہارے چہرے پر کبھی روشنی سی آ جاتی ہے اور کبھی عجیب سی شکل ہو جاتی ہے۔ یہ چکر کیا ہے۔"

"کوئی چکر نہیں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

اسے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ابھی اس کی گاڑی کے متعلق کچھ کہہ دیا تو اس کی شکل دیکھنے والی ہو گی۔ اس کو اپنی چھوٹی سی آلٹو دل و جان سے پسند تھی۔ ہر وقت اس کو چمکانے میں لگا رہتا تھا۔

لیکن کاش شیری کو پتا ہوتا کہ صفائی ظاہری نہیں ہوتی۔ باہر سے بے شک وہ جتنی بھی چمکتی ہوئی ہو لیکن چیزوں کو اندر سے صاف ہونا چاہیے۔

اس نے سر جھٹکتے ہوئے ایک سیدھی اور صحیح بات سوچی۔

تاباں کسی کام سے باہر آئی تو وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہوئی تھی۔

"کیا ہو گیا خیریت؟" اس نے دائم کا کندھا ہلایا۔

"ہوں۔" اس نے کاہلی سے جواب دیا۔

"ابھی یہاں پر شیری تھا۔"
"تمہیں کیسے پتا چلا۔"
"اس کے پرفیوم کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ تم بھول گئیں۔ ہم دونوں کو کتنی پسند ہے اس کی خوشبو۔"
"میں بہت ساری باتیں بھولنے لگی ہوں۔"
"بس یاد رکھنے والی باتیں نہ بھول جانا اور یہ کون بتائے گا کہ کسے یاد رکھنا ہے اور کسے بھول جانا ہے۔"
"مائی ڈیر! یہ تو کوئی نہیں بتا سکتا ہے۔ اس کی خبر صرف دل کو ہوتی ہے مگر بعض اوقات تو دل کو بھی نہیں ہو پاتی۔"
"نہیں! دل کو ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے۔" تاباں کے لہجے میں یقین تھا۔
"تمہیں یاد ہے۔ جس دن کالج میں بم بلاسٹ ہوا تھا۔ ہم سب ہی اس دن بلاوجہ اداس اور پریشان تھے اور سب سے زیادہ شیری پھر جب ہم نے یہ خبر سنی تو فوراً" بھاگے۔ مجھے اس دن لگا کہ ہم جس سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے لیے دل کس طرح پریشان ہو جاتا ہے۔ دل کو کیسے خبر ہو جاتی ہے۔ میں سچ مچ محبت پر ایمان لے آئی۔ لیکن پتا ہے بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی۔ شیری نے اس دن اتنی ریش ڈرائیونگ کی کہ کئی دفعہ تو ہم دونوں خود مرتے مرتے بچے۔ میں نے تو کلمہ پڑھ لیا تھا۔ اس سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہ نہ کچھ سن رہا تھا۔ نہ سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس دن تم پر بڑا رشک آیا سچ! اور میں نے کہا۔ محبت بڑی چیز ہے۔
لیکن ٹھیک اس دن مجھے ایک اور بات پتا چلی کہ انسانیت اس سے بھی بڑی چیز ہے۔
جس وقت ہم دونوں پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کر رہے تھے اور تم نہیں مل رہی تھیں۔ اسی وقت ایک لڑکے نے آکر کہا۔
"کچھ لڑکیاں زخمی ہیں۔ انہیں فوراً" اسپتال لے جانا بہت ضروری ہے۔ شیری نے ایک لحہ سوچا اور دوسرے ہی لمحے اس نے زخمی لڑکیوں کو گاڑی میں ڈالنا شروع کر دیا۔ اس کی پوری گاڑی خون سے بھر گئی تھی اور ابھی اس نے گاڑی اسٹارٹ بھی نہیں کی تھی کہ مریم کا فون آگیا۔ وہ تمہاری خیریت کی اطلاع دے رہی تھی۔
دائم اس دن زندگی سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ سب کچھ جنہیں ہم روشنی سے اجالوں سے تعبیر کرتے ہیں۔"
تاباں کے کہے ہوئے کچھ جملے تھے۔ اور سامنے زندگی کا طویل راستہ۔ حادثے تو ہوتے ہیں گزر جاتے ہیں۔ پتا نہیں چلتا کہ تقدیر ہمیں سزا دے رہی تھی یا ہماری آزمائش کر رہی تھی۔
ابھی اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی تو سوچا تھا کہ چیزوں کو اندر سے صاف ہونا چاہیے۔
سب کچھ محض اتفاق نہیں ہوتا۔ ان کے پیچھے بہت کچھ ہوتا ہے۔ شاید دعائیں۔۔۔ شاید محبت۔۔۔
کون جانتا ہے آرزو کا حاصل کیا چیز ہوتی ہے۔
خواہشوں کا اختتام کہاں پر ہوتا ہے اور اس اختتام پر جو شخص ملتا ہے۔ وہ ہیرو جیسی خوب صورتی تو رکھتا تھا۔ مگر کیا وہ وہی تھا جس کے ساتھ زندگی بسر کی جا سکتی تھی۔
سب کچھ محض اتفاق نہیں ہوتا۔ ان کے پیچھے بہت کچھ ہوتا ہے۔
شاید دعائیں!
شاید محبت!

شہریار

اس کے خواب' اس کی منزلوں میں کہیں بھی اس نام کے شخص کا پڑاؤ نہیں تھا۔
محبت کے نام پر سب سے معتبر وہی ٹھہرا تھا کہ وہ محبت کے مفہوم سے واقف تھا۔

آسیہ رزاقی

"یہ مرغا..... کسی دن میرے ہاتھ لگ جائے، پھر دیکھنا میں اس کا کیا حشر کرتی ہوں۔" خالہ دادی نے دانت کچکچا کر اعلان کیا۔

"خالہ دادی! آپ اس کا روسٹ بنائیں گی یا بریانی؟" عاشر کے لہجے میں شوق کی ایک دنیا آباد تھی۔

"نہیں خالہ دادی! آدھے گوشت کا قورمہ۔ باقی کی چکن جلفریزی، آہا۔" عامر بھلا کیوں چپ رہے۔ تصور میں مرغے کے حصے کرنے لگا۔

"ہائے ہئے..... توبہ..... میں کیوں روسٹ یا بریانی بناؤں گی، میرا اس پر بھلا کیا اختیار۔ میں تو پکڑ کر اس کی پٹائی لگاؤں گی۔ موا دن دیکھے نہ رات۔ اذانیں دے دے کر کان کھا جاتا ہے۔ رات تین بجے سے جو بگل بجاتا ہے تو سورج نکلنے تک..... بس بجاتا رہتا ہے۔ سونے والوں کی نیندیں حرام۔ عبادت میں خلل الگ۔"

"آپ بھلا کس طرح اس کی پٹائی لگائیں گی۔ پکڑے گا کون اسے۔ وہ تو چھلاوا ہے چھلاوا۔ اس کا کام ہے اذان دینا۔ آپ نمازیں پڑھتی رہیں۔"

عاشر نے بزرگانہ انداز میں نصیحت کی۔ اسے علم تھا، خالہ دادی مرغے کی بے وقت کی ککڑوں کوں سے

مکمل ناول

چڑتی ہیں۔ ایک دن وہ اسکاچ ٹیپ مانگتی رہیں۔ پوچھنے پر بتایا۔
"موئے کی چونچ بند کرکے اس پر ٹیپ لگاؤں گی۔ کچھ دیر سکون رہے گا۔"
مگر اسکاچ ٹیپ تو مل گیا' مرغا کیسے دستیاب ہو۔ شامت اعمال' آپا رضیہ بھی اس دن آگئیں۔ مرغے کی مالکہ۔ خالہ دادی نے ان سے شکایتیں کرکے دل کی بھڑاس نکالی مگر پڑوسن تو اس مرغے کے کارنامے بیان کرنے لگیں۔
"بس خالہ! اسے نیکی کا فرشتہ سمجھیے ارے تہجد کے لیے لوگوں کو جگاتا ہے۔ پھر بھی لوگ سوتے رہتے ہیں پھر فجر کی نماز کے لیے بانگ دیتا ہے۔ جب تک ساری خدائی جاگ نہ جائے۔ اسے چین نہیں آتا۔ اسے مؤذن سمجھیں۔ بے تنخواہ کام کرتا ہے۔"
انہوں نے اس کے ایسے قصے سنائے جیسے وہ ماورائی مخلوق ہو۔ کسی بھی حادثے کی پیشگی اطلاع وہ دیتا ہے۔ خطرے سے بچاتا ہے۔ لگتا تھا انہوں نے اسے اپنا پیر مان لیا ہے اور خود مرید ہوگئی ہیں۔
"آنٹی! خواب کی تعبیر بتاتا ہے؟"
عاشر کو سوال کرنے کی عادت تھی۔ آپا رضیہ صرف ٹیڑھی نظروں سے دیکھ کر رہ گئیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ سے اس درجہ عقیدت سے اس کے اوصاف بیان کررہی تھیں جیسے وہ روحانی قوتوں کا مالک ہو۔
"انسان کی زبان بول تو نہیں سکتا مگر اپنی ککڑوں کوں سے مدعا بیان کردیتا ہے۔ نصیحت بھی کرتا ہے۔ خطرے کی نشان دہی کے علاوہ غصہ بھی ظاہر کرتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ گلی سے کسی بچے نے ہمارے گھر میں پتھر پھینکا۔ بس جی! ہمارے۔ پہلوان نے اس قدر شور مچایا کہ سب کو باہر نکل کر دیکھنا پڑا کہ قصہ کیا ہے۔ پتا چلا کہ ہمارا مرغا ہی اس پتھر کا ہدف تھا' جولان میں چہل قدمی کررہا تھا اور گیٹ پر دستک دینے والے بچوں کو ڈانٹ رہا تھا کہ کمبخت! کیوں بے وقت گیٹ بجا کر سب کو بے آرام کررہے ہو' شام کو آنا' یہ کوئی آنے کا وقت ہے۔ مگر اس کے لہجے سے گلی کے واقف نہ تھے۔"
"اور جو خود محلے بھر کی نیند حرام کرتا ہے بدذات" خالہ دادی بڑبڑائیں۔
"بس اس لیے گیٹ بجاتا بچہ مرغے کو پتھر! بھاگ گیا۔" آپا رضیہ کا تسلسل قائم رہا۔ "اصل میں وہ بچہ اپنی بال لینے آیا تھا۔ جو گلی سے ہمارے گھر میں گری تھی۔"
"تو اس عقل کل مرغے نے وہ بال اٹھا کر اس بچے کو دے کیوں نہ دی؟" خالہ دادی نے اعتراض کیا۔ اس پر آپا رضیہ ناراض ہوگئیں۔
"آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔" وہ منہ پھلا کر خفگی سے بولیں۔
"اور تمہاری باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں" خالہ دادی ترکی بہ ترکی بولیں۔
حقیقت تو یہ تھی کہ ان کے مرغ نامے سے سب بور ہوجاتے تھے مگر عاشر مرغ کی روحانی قوت کے اعتراف میں وجد میں آکر جھومنے لگتا پڑوسن کو خوش کرنے کے لیے اور وہ فخریہ انداز میں مزید کارنامے بیان کرنے لگتیں۔

☆ ☆ ☆

طاہر میاں اپنی خالہ اماں کو اپنے گھر لے کر آئے ان کی بیوی سمیعہ کو اس درجہ مہنگائی کے زمانے میں ان کا ورود کچھ پسند نہ آیا کہ ابھی پچھلے سال وہ اپنی ایک بعد رشتے کی بھانجی کو بھی لے آئے تھے۔ یتیم ہونے کے سبب یہ سوچے بغیر کہ جوان لڑکی کی ذمے داری' پھر اس کی تعلیم اور دیگر اخراجات پر خاصی رقم خرچ ہوگی۔ میاں طاہر اقربا پروری کے زبردست حامی تھے۔
خالہ اماں اگر تنہائی کے سبب مجبور اور قابل ہمدردی تھیں تو ثوبیہ ماں کی وفات کے بعد باپ کی اعتنائی کا دکھ جھیل رہی تھی اور جس گھر میں اس کی ماں کی نشانیاں اس کے سلیقے اور ہنرمندی کی گواہی دیتی نظر آتی تھیں دوسری ماں کا تسلط اس کے لیے سوہان روح ہوگیا۔ جب باپ بے مہر تھا تو دوسری ماں کو بھی اس پر پیار لٹانے یا توجہ دینے کی ضرورت نہ تھی۔ باپ کی بے زاری اور دوسرے رشتے داروں کی بے نیازی نے اس کے مزاج میں ایک قسم کی مایوسی پیدا کردی تھی۔ اس کی فطرت میں عجب طرح کی تلخی آگئی۔ اس کی بے زاری بڑھتی گئی۔ ماں کی نفرت کے بعد جب باپ بھی داغ مفارقت دے گیا تو وہ زندگی سے مزید لاتعلق ہوگئی۔ ماں کو بھی وہ بوجھ لگنے لگی۔
طاہر میاں تعزیت کے لیے وہاں گئے۔ ثوبیہ کی ماں سائرہ' طاہر میاں کی چچا زاد تھی۔ انہوں نے ثوبیہ کو سب سے لاتعلق اور ماحول سے بے زار دیکھا۔ ماں نے اس کی شکایتوں کے انبار لگادیے۔ گھر کا آدھا حصہ کرائے پر دیا ہوا تھا۔ معمولی آمدنی میں اخراجات کی تفصیل سنا کر مدد کی درخواست کی۔ چچا' پھوپھی سب نے ثوبیہ کی ذمے داری لینے سے انکار کردیا تھا۔ طاہر میاں بہت مہربان اور خدا ترس انسان تھے۔ انہیں ثوبیہ پر ترس بھی آیا' پیار بھی۔ آنا"فانا" دل میں فیصلہ کرکے انہوں نے کہا۔
"میں اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ میری بیٹی بھی اسی عمر کی ہے۔ آپ ثوبیہ کے چچا' پھوپھی سے بھی اجازت لے لیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔"
اندھا کیا چاہے۔ دو آنکھیں۔ کیسے چچا' کون سی پھوپھی اور کیسی اجازت' انہوں نے جھٹ پٹ ایک پرانے بیگ میں اس کے چند جوڑے رکھ کر کمر پر ہاتھ رکھ کر تھکن کی اداکاری بھی کی۔ دل کی کلی تو کھل گئی تھی۔ ہاتھ جھاڑ کر فاتحانہ نظروں سے طاہر میاں کو دیکھا۔ گویا کہہ رہی تھیں۔ "جاؤ اب۔ جاتے کیوں نہیں۔"
بوجھ اتار کر وہ ہلکی پھلکی ہوگئیں۔ انہوں نے بھانجی کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔
"چلو بیٹی! اب تم کو میرے گھر پر رہنا ہوگا۔ میری بیٹی تمہاری بہن ہے۔ اس سے دوستی کرلینا۔ تمہاری مامی بھی خوش ہوں گی۔ چلو۔"
اور وہ مرجھائی کلی جیسی لڑکی ان کے ساتھ ہی باہر آگئی۔ نہ ماں نے پیار کیا' نہ بیٹی نے خدا حافظ کہا۔ دونوں ہی جیسے ایک دوسرے سے جان چھوٹنے پر شکر ادا کررہی تھیں۔ جس بیگ میں ثوبیہ کے کپڑے تھے' وہ اس قدر بوسیدہ اور پرانا تھا کہ چند قدم بعد ہی ساتھ چھوڑ گیا۔ زپ تو تھی نہیں۔ نہ جانے کس چیز سے اٹکایا گیا تھا کہ کھل کر گرا۔ اس میں کپڑے بھی بیگ جیسے بے رنگ اور بوسیدہ تھے۔ اسے سڑک پر چھوڑ کر دونوں آگے بڑھ گئے۔
"میں اس کے کپڑوں کا بیگ اسٹیشن پر بھول آیا۔" گھر جا کر بہانہ کیا۔
بہانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ اکثر اپنا کمبل' تکیہ' ٹفن یا تھرماس اسٹیشن پر یا ٹرین یا بس میں بھول آتے تھے۔
"یہ تمہاری مامی ہیں اور یہ ثوبیہ ہے۔ سائرہ کی بیٹی" ...

مامی نے پیار تو کیا مگر انہیں میاں سے اکثر گلہ رہتا ہی تھا کہ وہ بغیر نتائج کی پروا کیے' کچھ بھی کر ڈالتے۔ اکثر وہ زبان سے کہہ دیتیں ورنہ دانت کچکچا کر ہونٹ چبا کر رہ جاتیں۔ اب بھی یہی کرتی رہیں۔ ثوبیہ کو ایک کمرا دے دیا گیا۔ وہ بے حد صابر اور قانع تھی مگر مامی کو فوری طور پر اس کے لباس کی بھی فکر ہو گئی اور آئندہ کے اخراجات' اسکول کی فیس' کتابوں کا خرچ' جوتے' سینڈل' کپڑے' تیل کنگھا' شیمپو' ٹوتھ پیسٹ' ہزاروں کا خرچا ضروریات زندگی کے لیے لازمی۔

کچھ دن ثوبیہ نے بہت صبر اور خاموشی سے وقت گزارا' پھر پتا چلا کہ وہ ضدی ہے۔ ہٹ دھرم بھی ہے اور خاصی بدتمیز بھی۔ شاید اس کے اپنے گھر کے ماحول' ماں کی موت' باپ کی بے نیازی' رشتے داروں کی لاتعلقی اور سوتیلی ماں کی نفرت کا شکار۔ اس کے مزاج میں تضاد تھا۔ کبھی سب کے ساتھ بے تکلفی۔ کبھی بے زاری' کبھی خوش' کبھی ناخوش۔

طاہر میاں نے بھی نوٹ کیا۔ وہ سب کے ساتھ کھانا نہیں کھاتی۔ بعد میں کھاتی تو کھانا ٹھنڈا ہونے کی شکایت' کبھی کم ہونے پر واویلا۔ کبھی بغیر کچھ کھائے کمرا بند کیے پڑی رہتی۔ عجب دھوپ چھاؤں جیسا مزاج تھا۔ پھر ایک دن خالہ اماں آ گئیں۔ طاہر میاں ان کو لے کر آئے تھے۔ سب سے تعارف ہوا' پھر ثوبیہ کی طرف اشارہ کیا۔

"دیکھیے خالہ اماں! یہ ثوبیہ ہے۔ سائرہ کی بیٹی' ہے نا بالکل سائرہ جیسی؟"

خالہ اماں نے بغور دیکھا۔ "ہاں ہے تو ویسی ہی مگر ہماری سائرہ تو بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج تھی۔ ہر وقت ہنستی ہنساتی رہتی تھی یہ تو....."

"اسے بھی ویسا ہی ہونا چاہیے۔ کیوں خالہ اماں؟"

"بالکل ہونا چاہیے۔ چلو بھتی! اتنا کافی ہے کہ یہ ہمارے پاس رہے گی۔"

خالہ اماں نے اسے پیار کیا' پھر وہ اس کا سایہ بن گئیں۔ ثوبیہ کے کمرے میں ہی خالہ اماں کا سامان رکھ دیا گیا۔ وہ بھی وہیں فٹ ہو گئیں۔ سمیعہ کو ان کی بھی فکر ہو گئی مگر وہ اپنے میاں کو ہمدردی کے افسر اعلا کا خطاب دینے کے سوا اور کچھ نہ کر سکیں۔ خالہ اماں عمر کے مطابق سب کو نصیحت کیا کرتیں۔ طاہر میاں کی بیٹی شانزے کو وہ بہت اچھی لگتیں۔ نہ وہ خالہ دادی کی کسی نصیحت کا برا مانتی نہ ان کی دخل اندازی پر خفا ہوتی جبکہ ثوبیہ کو ان کا ہر بات میں دخل دینا پسند تھا نہ ان کی نصیحتیں۔

شانزے بہت لاابالی اور لاپروا قسم کی لڑکی تھی۔ اسے گھر کے افراد میں ان دونوں کا اضافہ بہت اچھا لگا۔ عاشر' عامر بھی کھلنڈرے اور خوش مزاج تھے۔ گھر میں فراغت تھی۔ سمیعہ کو بچت کی عادت تھی' جو خالہ اماں کو بہت پسند آئی۔ اس لیے ان دونوں میں کبھی اختلاف نہ ہوا۔

طاہر میاں نے خالہ اماں کو بچوں کی تربیت کا اختیار سونپ دیا۔ ان کے خیال میں تو بچے بگڑ چکے تھے۔ عاشر' عامر لڑتے جھگڑتے تھے اور شانزے لاپروا اور بھلکڑ تھی۔

خالہ اماں نے غور کیا تو بچے عام بچوں کی نسبت خاصے سدھرے ہوئے لگے۔ بس انہیں ذرا توجہ کی ضرورت تھی' جو ماں باپ اپنی مصروف زندگی کے باعث انہیں نہ دے سکے۔ لڑکے تو لڑتے جھگڑتے ہی ہیں اور شانزے اگر کچھ بھولتی تھی تو یہ کوئی خاص برائی نہ تھی۔ ذمے داری سے آزاد تھی۔ اس لیے کچھ لاپرواہ اور بے نیاز تھی۔ ہنس مکھ اور فرماں بردار تو تھی۔

ہاں ثوبیہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ اس کو سیدھا کرنا کچھ مشکل تھا۔ اس کے مزاج اور خیالات میں یکسانیت نہ تھی۔ اسے سمجھنے اور سدھارنے میں مدت درکار تھی مگر وہ پرامید تھیں۔

دراصل طاہر میاں انہیں ثوبیہ کی تربیت کے لیے ہی لائے تھے جبکہ سمیعہ پریشان ہو گئی تھیں۔ انہیں لگتا کہ ساس تو بس ساس ہوتی ہے اور یہ جو ناگہانی ساس ان پر مسلط کر دی گئی ہیں۔ نہ جانے کب اپنی اصلیت دکھا دیں گی۔ جو ساس کی خاصیت ہوتی ہے۔ اعتراض' نکتہ چینی اور گھر پر اپنا تسلط۔ وہ خاصی متفکر ہو گئیں مگر چند ماہ میں انہیں اندازہ ہو گیا۔ وہ نہ اعتراض کرتی ہیں۔ نہ دخل دیتی ہیں بلکہ خود ہی کئی کام کر ڈالتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

رات کو کھانے پر سب اکٹھا ہوتے مگر ساتھ بیٹھ کر کھانے کا رواج نہ تھا۔ عاشر پلیٹ میں کھانا بھر لیتا اور کمپیوٹر کے سامنے جم جاتا۔ عامر بھی پلیٹ میں کھانا لے کر لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے جا بیٹھتا۔ اسے فٹ بال یا ٹینس کے میچ دیکھنے ہوتے تھے۔ شانزے کا قسط وار ڈراما ٹی وی پر آ رہا ہوتا' وہ امی کے کمرے میں پائی جاتی۔

سب سے پہلے شانزے پر ان کی نظر کرم ہوئی۔ اسے کمرے میں کھانا لے جاتے ہوئے دیکھا تو اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"چلیں کہاں؟ بیٹھو کھانا کھاؤ۔" اس نے منمنا کر ڈرامے کا ذکر کیا۔

"ڈراما کہیں بھاگ نہ جائے گا۔ کل دن بھر دکھایا جائے گا۔ دیکھ لینا۔"

"میں کالج....."

"کالج سے آ کر دیکھ لینا۔ کئی دفعہ دکھاتے ہیں۔" وہ منہ بناتی آ کر بیٹھ گئی۔

عامر کو بھی لاؤنج سے اٹھا کر لائیں کان پکڑ کر۔

"یہ وہی میچ ہے۔ جو کل ہو چکا ہے۔ تمہارے یہاں سے ہٹنے پر اس کے نتیجے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" بے چارا کان سہلاتا میز کے پاس آ گیا۔

عاشر نے کرسی نہ ہونے کا عذر کیا تو انہوں نے اسٹول پیش کر دیا۔

"بیٹا! مجھے پتا ہے۔ آج کل کمپیوٹر کے ذریعے پڑھائی کر لی جاتی ہے۔ تمہارا ابھی کوئی اہم سوال ہو گا اس میں مگر وہ موجود رہے گا۔ نہ تم کہیں جا رہے ہو نہ یہ کمپیوٹر۔ کھانے کے بعد آ کر کھول لینا۔ سب کے ساتھ مل جل کر کھانا کھانے کا لطف لو۔ ساتھ کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ گھر میں بھی اتحاد ہوتا ہے۔ آپس میں محبت بڑھتی ہے۔ سلوک سے رہنے کا سبق ملتا ہے۔ اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔"

"بھلا یہ کیسے..... ایک ساتھ کھانا کھانے سے بھی اتنے فائدے؟" عاشر کو حیرانی ہوئی۔

"سب گھر والوں کے ساتھ مل جل کر ہنس بول کر۔ ایک یہی موقع تو ہوتا ہے جب سب گھر میں ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مسائل سے آگہی ہوتی ہے۔ ایثار کا سبق ملتا ہے۔ کبھی شانزے نے ایثار کیا۔ کبھی اپنے حصے کی بوٹی تم نے شانزے کو دے دی۔ کبھی عامر نے تمہاری پلیٹ میں اپنا کوفتہ ڈال دیا۔ بہن بھائی اسی طرح ایک دوسرے کا خیال کرتے ہیں۔ اب تم اپنی پلیٹ بھر کر اندر جا بیٹھے۔ چاہے میز پر کسی کو بوٹی نہ ملی۔ تم نے آلو سمیٹ لیے۔ بے چاری شانی کے حصے میں ایک ٹکڑا ہی آیا۔ اب تم میز پر ہو گے۔ دیکھنے کے بعد کم از کم کھانے کی مقدار کا اندازہ تو کرو گے۔ پھر بھی اپنے حصے کا سالن یا کوئی بوٹی یا آلو بہن بھائی کے لیے چھوڑو گے کہ نہیں۔ یا دیکھ کر بھی اپنی پلیٹ بھرنا پسند کرو گے۔ خواہ کسی کو کم ملے یا نہ ملے۔"

عاشر نے گردن ہلائی۔ "خیر اب میں اتنا خود غرض تو نہیں۔ اپنے حصے کا بھی دے دوں گا۔"

"بس بیٹا! یہی کھانے کا اصول ہے۔ اس کو سلوک کہتے ہیں۔ تم ایک مرتبہ ہی پلیٹ بھر کر اندر چلے جاتے ہو۔ اکثر تم سے وہ سب کھایا بھی نہیں جاتا۔ جو بچ جاتا ہے' اسے پھینک دیا جاتا ہے۔ رزق کی بے حرمتی ہوئی ہے۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانے سے اپنے حساب سے کھانا نالیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ کھانا اگلے وقت بھی کھایا جا سکتا ہے۔ اسے برکت کہتے ہیں۔ طاہر میاں! تمہیں یاد ہو گا۔ ہمارے ابا کے گھر بھی سب لوگ صرف رات کے کھانے پر جمع ہوتے تھے۔ کھانے کے بعد دسترخوان کے گرد ہی محفل جم جاتی۔ بچے اسکول کے قصے سناتے۔ بڑے لوگ کالج یا آفس کے دلچسپ واقعات لے بیٹھتے۔ سب اپنے اپنے مسائل بھی دوران گفتگو پیش کر دیتے۔ ہنسی مذاق بھی ہوتا۔ اکثر تو سب کی رائے سے کتنا ہی اہم

مسئلہ چٹکیوں میں حل ہو جاتا۔ بلکہ شادی بیاہ کے رشتے تک طے کرلیے جاتے۔"

"اور اس طرح یگانگت کو فروغ ملتا ہے۔" طاہر میاں نے اتفاق کیا۔ "خالہ اماں! اب تو سب کی زندگی افراتفری کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ نہ پہلے جیسی اپنائیت رہی نہ اتفاق۔ احساس بھی نہیں کہ ہم کتنی اہم حقیقت سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ نفسانفسی بڑھتی جارہی ہے۔"

"ہاں اور کون ذمے دار ہے اس نفسانفسی کا۔ ظاہر ہے ہم خود۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ سیکھا' وہ اپنے تک محدود رکھا۔ اسے اگلی نسل تک نہیں پہنچایا۔ تعلیم پر زور دیا۔ تربیت سے غافل رہے۔ اپنائیت کی اہمیت کا احساس ہی نہیں رہا۔ بزرگوں کا دخل آزادی میں خلل کہا جاتا ہے۔"

خالہ اماں افسردگی سے کہہ رہی تھیں۔ طاہر میاں بھی شرمندہ تھے۔ سمیعہ متفق تھیں۔

"صحیح کہا آپ نے۔ واقعی ہم اپنی کوتاہی کو دوسروں کے ذمے لگا کر خود بری ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف ہی وبا پھیلی ہوتی ہے برتری کی دوڑ۔" طاہر میاں نے بھی اتفاق کیا۔

"احساس ختم نہیں ہوا۔ آگے بڑھنے کی تگ ودو نے اس پر نقاب ڈال دی ہے۔ زندگی کا مقصد صرف دولت کمانا ہو گیا ہے۔"

"ہاں بیٹا! یہی وجہ ہے کہ رشتوں کی اہمیت کم ہو گئی' پیسے کی بڑھ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ برائیاں پیر پھیلا رہی ہیں۔ خوبیاں سمٹ رہی ہیں۔ پتا نہیں ابھی اور کیا کچھ دیکھنا باقی ہے۔"

خالہ اماں کے لہجے کی اداسی' آنکھوں کی نمی' آواز کا بھاری پن ماحول کو متاثر کر رہا تھا۔ طاہر میاں نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے تھام لیے۔ محبت بھرے انداز میں انہیں تسلی دینے لگے۔

"خالہ اماں! اللہ سے ہمیشہ بہتری کی امید رکھنی چاہیے۔ احساس زندہ ہو تو رشتوں کی اہمیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ خون پتلا ہوا ہے۔ ابھی اتنا سفید نہیں ہوا کہ مایوس ہو کر امید کا دامن ہی چھوڑ دیں۔ بس آپ دعا کرتی رہیں۔ اللہ ہے سننے کے لیے۔"

خالہ اماں نے سر اٹھا کر بھانجے کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں بھی چمک پیدا ہوئی۔ مسکرانے لگیں۔ ہاتھ اٹھا کر بھانجے کے چہرے کو چھوا جہاں امید کی خوشی کی روشنی تھی۔ خالہ اماں کو اس روشنی سے قوت ملی۔ دونوں خالہ بھانجے آنکھوں سے گفتگو کر رہے تھے شاید۔ پھر سب مسکرانے لگے ہنسنے لگے۔ موسم اور ماحول بدل گیا۔ مایوسی کے بادل چھٹ گئے تو اجالا پھیل گیا۔ امیدوں کی قوس قزح نے فضا میں رنگینی بھر دی۔

☆ ☆ ☆

کمپیوٹر کے سامنے جم کر بیٹھتے ہوئے عاشر نے خیال ظاہر کیا۔ "شاید خالہ دادی نے کوئی بہت بڑا صدمہ جھیلا ہے۔ کبھی وہ بہت اداس ہو جاتی ہیں۔"

شانزے کو اس سے اختلاف تھا۔ "اگر ایسا ہوتا تو وہ ہمیں اچھی اچھی نصیحتیں نہ کرتیں۔ ہماری خوشی میں خوش نہ ہوتیں۔ ہمیشہ اپنے دکھ میں گم رہتیں۔ کبھی تو ذکر کرتیں۔"

ثوبیہ کو خالہ دادی سے شکوہ تھا کہ وہ ان کی نصیحتوں کا شکار تھی۔ منہ بنا کر کہنے لگی۔

"انہیں تو شوق ہے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے کا۔ انہیں یہاں کوئی تکلیف ہے نہ غم۔ بھلا پچھلے کسی صدمے کا کیا ذکر کریں۔"

"ثوبیہ! وہ کتنے فائدے کی باتیں بتاتی ہیں۔ کتنی اچھی نصیحت کرتی ہیں۔"

"مجھے ان کی نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔"

"ارے ثوبیہ! وہ ہم سب سے محبت کرتی ہیں۔ اس لیے ہماری بہتری کی بات بتاتی ہیں۔ ورنہ کسی کو کیا کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ کس طرف جارہے ہیں۔ سیدھے راستے پر یا برائی کے راستے پر۔ برے بھلے کی تمیز اسی کو سکھائی جاتی ہے' جس سے محبت ہو۔" شانزے میں بزرگ روح تھی۔

"مجھے یقین نہیں۔" ثوبیہ اڑی رہی۔ "سب اپنی غرض کے بندے ہیں دنیا میں۔ جہاں اپنا فائدہ دیکھا۔ وہیں پیر جما لیے۔"

"تمہارا خیال ہے۔ خالہ دادی کو یہاں فائدہ نظر آتا ہے' بھلا کیسا فائدہ؟" شانزے برا مان گئی۔ "وہ دوسروں کے فائدے کی بات بتاتی ہیں۔ سمجھاتی ہیں۔ اپنی محبت میں' اپنائیت میں۔"

ثوبیہ بھی مجبور تھی۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی۔ وہاں محبت کا فقدان تھا۔ سب کو اپنی ضروریات کی فکر تھی۔

جب تک سائرہ زندہ رہی۔ شوہر کے عتاب کا شکار' ساس کی سختیوں اور نند کے علاوہ دیور کے ظلم تلے پستی رہی۔ سب کو اچھا کھانا' اچھا کپڑا چاہیے تھا۔ آمدنی کم طلب زیادہ۔ ذمہ داری سائرہ کی۔ کس طرح گھر کے اخراجات پر بند باندھا۔ اپنی ذات پر کم سے کم دوسروں کے مطالبات پورے کرتی۔

پھر سائرہ کے بعد باپ کی بے نیازی و سرد مہری۔ نند اور دیور الگ رہنے لگے۔ بڑے صاحب پہلے ہی علیحدہ رہتے تھے۔ دادی بیچاری کی ذمہ داری ثوبیہ پر آپڑی۔ کوئی بیٹا' بیٹی ماں کو نہ پوچھتے۔ تھپڑ' گھونسے کھا کھا کر ثوبیہ بڑی ہوئی تو دادی کی ذمے داری سے نجات ملی۔ پھر سوتیلی ماں کا نزول۔ جب اپنے سگے رشتے دار بے نیاز تھے تو وہ کیوں اس کا خیال کرتی۔ چند سال اور باپ کے قہر کا شکار رہی' پھر وہ بھی ثوبیہ کی بددعاؤں کے سبب (یہ اس کو یقین تھا) ماں سے جا ملے۔

اب سوتیلی ماں تھی اور ثوبیہ۔ مار پیٹ' گالیاں' کوسنے' اور گھر کا سارا کام۔ پڑھائی ادھوری رہ گئی۔ طاہر ماموں نہ آتے تو وہ کسی گھر میں برتن دھو رہی ہوتی یا کہیں جھاڑو پوچا' جو کہ اس کی ماں کا پروگرام تھا۔ اسے ثوبیہ سے فائدہ اٹھانے کا یہی ذریعہ نظر آیا۔ پھر جب طاہر میاں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو اس سے نجات کا راستہ بھی بھلا لگا۔

☆ ☆ ☆
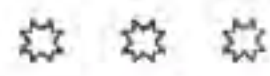
سمیعہ کی ایک خالہ کبھی بھار آجاتی تھیں۔ خالہ اماں پر ان کی خاص نظر تھی کہ وہ کیا کر رہی ہیں۔ کہاں کہاں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ ان کی بھانجی سے کوئی زیادتی تو نہیں کرتیں۔ آتے ہی بہوؤں کی بدتمیزیوں' پھوہڑپن اور بدزبانی کے قصے سناتیں۔ سمیعہ انہیں سمجھاتیں۔

"خالہ! بہوؤں کا کیا قصور ہے۔ آپ کے بیٹوں کو چاہیے کہ وہ آپ کی عزت کرنے کا حکم دیں۔ کم از کم وہ بدتمیزی تو نہ کریں۔"

وہ سرد آہ بھر کر کہتیں۔ "ہائے! یہی تو چالاکی ہے۔ بیٹوں کے سامنے میسنی بنی رہتی ہیں۔ ان کے جاتے کے بعد ننگی تلوار بن کر حملہ کرتی ہیں۔ میری عزت تو کیا کریں گی۔ ایک وقت کی روٹی دینی دوبھر ہے۔ منہ بنا کر کھانا میرے آگے پٹخ دیتی ہیں۔"

شانزے کو ان کی داستان میں بہت دلچسپی تھی۔ وہ منہ دبا دبا کر ہنستی۔ اس بار آئیں تو رو رو کر بیان کیا۔

"سمیعہ! تمہارے کہنے پر میں نے بیٹوں کو سمجھایا کہ اپنی بیویوں کو کچھ عقل سکھائیں۔ میرے ساتھ منہ ماری نہ کریں۔ لو جی! میرا اتنا کہنا ستم ہو گیا۔ وہ تو خود ڈٹ گئے۔ مجھے الٹی ایسی کہانی سنائی جیسے میں بہوؤں کی دشمن ہوں' ان کا کھانا پینا' پہننا اوڑھنا مجھے گوارا نہیں۔ میں گھر میں بدامنی پھیلاتی ہوں۔ ارے بھئی! ان کی ساری رشتے داری تو اب بیوی اور بچوں سے ہے یا پھر ساس سسر' سالے سالیاں قریبی عزیز ہیں۔ ماں تو دور کی رشتے دار ہے۔ بھلا ماں کا خیال کیوں کریں۔ بھاڑ میں جائے ماں۔ انہیں کیا۔ میں تو کہتی ہوں ماؤں کو بیٹوں کی شادی کے بعد قبر میں جا کر لیٹ جانا چاہیے۔ فرض ادا کرنے کے بعد اب جو ذلت کی زندگی شروع ہو گی' اس سے بچو بی بی! گھر بھرا ہے لوگوں سے اور میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔ بیٹوں نے آنکھیں ماتھوں پر سجالی ہیں۔ انہیں ہر بات میں میری زیادتی نظر آتی ہے اپنی بیویاں مظلوم۔ ہندوؤں میں کیسی اچھی رسم ہے کہ شوہر کے مرنے پر بیوی بھی اس کی چتا پر ستی ہو جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہے نا کہ بیوگی میں کیا عذاب جھیلنا پڑے گا۔ اولاد ہی

زندہ در گور کردے گی۔ میں تو کہتی ہوں سمیعہ! بیٹوں کے پیدا ہونے سے بہتر تو بے اولاد ہونا ہے۔ ارے بھئی! آپ کو ایک ہی غم ہو گا کہ اولاد نہیں...... مگر بیٹے جو غموں کی مار دیتے ہیں۔ وہ ناقابل برداشت ہے۔"

ان کی تقریر کے دوران سمیعہ برابر انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ مگر نہ ان کے آنسو رکے نہ زبان۔ خالہ اماں ہمدردی کے اظہار میں ان کے قریب آکر انہیں بہلانے لگیں۔

"ایسا نہیں سوچیے بہن! اولاد اللہ کی نعمت ہے۔ تحفہ ہے قدرت کی طرف سے مگر قرآن میں اولاد کو فتنہ بھی کہا گیا ہے۔ اللہ سے خیر کی امید رکھیں اور صبر برداشت کا دامن پکڑے رہیں۔ آپ کی خاموشی اور صبر کا آپ کے بیٹوں پر ضرور اثر ہو گا۔ اللہ انہیں ہدایت دے۔ آخر آپ ان کی ماں ہیں۔ اور ماں کے درجات بہت بلند ہیں۔ انہیں ضرور احساس ہو جائے گا۔"

خالہ کے تو جیسے بدن میں آگ لگ گئی۔ تلملا گئیں، بولیں۔

"اے بس رہنے دیں اپنا وعظ۔ آپ کو کیا خبر یہ بیٹے اور بہوئیں کلیجے پر کیسے تیر چلاتے ہیں۔ آپ کی اولاد ہوتی تو پوچھتی بہن! کتنے پانی میں ہو۔ میرے بیٹے میرے لیے آزمائش بن گئے۔ آپ کہتی ہیں میں صبر کروں۔ واہ! کیا کیا صبر کروں؟"

خالہ کے پہلے فقرے نے ہی جیسے خالہ اماں کے پیر اکھاڑ دیے۔ ان کے غضب ناک تیور اور سخت لہجہ۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹیں اور دھم سے پلنگ پر جا گریں۔ رنگ سفید ہو گیا۔ آنکھیں معمول سے کچھ زیادہ کھل گئیں۔ سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ گئیں۔ خالہ کی داستان جاری تھی۔

"روزانہ شام کو آفس سے آتے ہی بیوی بچوں کو لے کر جانے کہاں کی خاک چھاننے چل دیتے ہیں۔ ماں سے کیا پوچھنا۔ بتانے کی زحمت گوارا نہیں۔ آدھی رات تک میں اکیلی ہولتی رہتی ہوں۔ پھر شور مچاتے آتے ہیں۔ کوئی بچہ روتا ہوا۔ کوئی ٹھنکتا نیند میں بدحال تو کوئی ماں باپ کے کندھے سے لٹکا ہوا۔ آئے اور کمروں میں غڑاپ ماں کی خیر خبر کون لے کہ کس درجے ہول کر رات گزاری۔ میں نے تو سوچ لیا ہے۔ انہیں دعاؤں سے خارج کر دوں۔ ایسے بیٹوں سے میں بے اولاد بھلی۔ مری تو محلے والے کفن دے دیں گے۔ بے زار ہو گئی ہوں اس زندگی سے۔"

خالہ اماں جو ابھی تک حق دق سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ ان کی دعاؤں سے خارج کرنے کے الفاظ پر تڑپ کر اٹھیں۔ سمیعہ اور شانزے جو خالہ اماں کے چہرے کی کیفیت اور سہمے ہوئے انداز سے ڈری گئی تھیں۔ ان کے اگلے اقدام پر حیران ہو گئیں۔ جو ہاتھ اٹھا کر نہایت لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں نہیں بہن! ایسا نہ کریں۔ اللہ نہ کرے کہ ایسی نوبت آئے۔ آپ بس دعا کرتی رہیں۔ ماں کی دعا میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ اللہ سے امید رکھیں۔ وہ سب کی سنتا ہے۔"

"رہنے دیں بہن!" خالہ نے بگڑ کر کہا۔ "جس کے دل پر زخم لگتا ہے۔ درد اسی کو ہوتا ہے۔ آپ کیا جانیں۔ مزے سے بھانجے کے گھر میں رہ رہی ہیں۔ سب پر حکومت کر رہی ہیں۔ میں جو اولاد والی کہلاتی ہوں۔ کس کو اپنے زخم دکھاؤں۔ جن سے خون بہتا رہتا ہے۔"

انداز ان کا ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ آپ تو میری بھانجی کے گھر میں عیش کر رہی ہیں... مگر مروتاً "بھانجے" کا کہا۔

خالہ اماں پھر دبک کر بیٹھ گئیں۔ شانزے کو احساس ہوا کہ خالہ نانی نے کچھ زیادہ ہی سنا دی ہے۔ وہ بہانے سے خالہ دادی کو اپنے کمرے میں لے آئی اور انہیں ایک سوٹ کا کپڑا دکھا کر بتانے لگی۔

"دیکھیں خالہ دادی! امی مجھے اور ثوبیہ کو ساتھ لے کر مارکیٹ گئی تھیں۔ تاکہ ہم اپنی پسند کے کپڑے لے لیں۔ پہلے ثوبیہ نے اپنے لیے ایک سوٹ پسند کیا، پھر میں نے کیا۔ گھر آکر ثوبیہ نے کہا۔ اسے میرا والا پسند آرہا ہے۔ ہمیشہ وہ یہی کرتی ہے۔ اسے میری چیز

زیادہ اچھی لگتی ہے۔ اپنے والے سے دل ہٹ جاتا ہے۔ میں اسے یہ دے بھی دوں مگر اس کے سوٹ کا رنگ مجھے پسند نہیں۔ تبدیل بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ دکان دار نے تھان سے کاٹ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ امی اب دوسرا سوٹ دلانے پر تیار نہیں۔ اب ثوبیہ ناراض ہے۔ اپنا والا سوٹ امی کو دے دیا ہے واپس کرنے کے لیے اور کہہ دیا کہ مجھے ضرورت نہیں۔"

شانزے خاصی پریشان تھی۔ خالہ دادی سوچ میں پڑ گئیں۔ ثوبیہ کی یہ عادت اب پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ اسے شانزے کی ہر چیز پسند آجاتی تھی۔ کپڑے چپل یا کوئی بھی چیز۔ سمیعہ دونوں کے لیے ایک رنگ کے سوٹ لائیں وہ بھی اس نے رد کر دیا۔

سمیعہ اسے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھیں۔ خالہ اماں کو ہی بتایا۔ وہ ثوبیہ کو سمجھاتی رہیں مگر اس کو ان کی یہ دخل اندازی کچھ پسند نہ آئی۔ پھر طاہر میاں کو بھی یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ ان کی شاپنگ کریں۔ یہ منصوبہ بھی ناکام ہوا۔ اب سمیعہ دونوں کو اسی لیے ساتھ لے کر گئی تھیں کہ دونوں کی پسند مختلف تھی لیکن ثوبیہ..... خالہ دادی نے شانزے سے کہا۔

"خیر تم فکر نہ کرو۔ کچھ سوچتے ہیں۔" کہہ کر وہیں شانزے کے بستر پر لیٹ گئیں۔

شانزے جانتی تھی۔ خالہ دادی ثوبیہ کو سمجھا نہ سکیں گی اور وہ اس وقت جو یہاں لیٹ گئی ہیں۔ ثوبیہ یا شانزے کے سوٹ کے بارے میں سوچنے کے لیے نہیں بلکہ..... ان پر ابھی تک خالہ نانی کی باتوں کا اثر تھا۔ جو ابھی بھی سمیعہ کو بہو اور پوتے پوتیوں کی بدتمیزیوں اور اپنی معصومیت کے قصے سنا رہی تھیں۔ سمیعہ انہیں تسلی دے رہی تھیں۔ شانزے نے مذاق کے طور پر خالہ دادی سے کہا۔

"خالہ! نانی کی فطرت بھی ثوبیہ جیسی ہے۔ نہ کسی کے سمجھانے کا اثر ہوتا ہے۔ نہ اپنے عمل کو غلط سمجھتی ہیں۔ اب شام کو دیکھیے گا۔ سرمد ماموں انہیں لینے آئیں گے تو کیسے بلائیں لیتی ہوئی ان سے آگے آگے برقعہ سمیٹتے جا کر گاڑی میں بیٹھ جائیں گی۔ خالہ دادی! ایسے لوگوں کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان کی باتوں کا اثر بھی نہیں لینا چاہیے۔ غبار نکال کر خود تو ہلکی پھلکی ہو کر چلی جاتی ہیں۔ امی پر کئی دن فکر سوار رہتی ہے۔ بلکہ جونہی خالہ نانی آتی ہیں۔ امی پریشان کہ نہ جانے اب کون سی نئی واردات سنانے آئی ہیں۔"

خالہ دادی نے پیار سے اس کے چہرے کو چھوا۔ کیسی بزرگوں جیسی فکر مند لگ رہی تھی۔ وہ دراصل خالہ دادی کو بہلا رہی تھی۔ شانزے کی یہ فکر مندی اور ہمدردی انہیں بہت اچھی لگی۔ وہ بے حس، لاپروا یا بے فکر نہ تھی ذہین بھی تھی اور ہمدرد بھی۔ اس نے بہت سی عادتیں ماں کی لی تھیں۔ پتا نہیں ثوبیہ پر اپنی ماں کا اثر کیوں نہ ہوا تھا۔ اس نے بس اپنے گھر سے ہی سب کچھ سیکھا تھا۔ خود غرضی، بے نیازی، بے اعتنائی اور خود سری۔

خالہ اماں کو اس عرصے کے ساتھ نے سمیعہ کی بہت سی خوبیوں کو سراہنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی طاہر میاں جیسے نیک سرشت اور دردمند انسان کے لیے ایسی ہی بیوی کی ضرورت تھی۔ سمیعہ میں صبر بھی تھا، قوت برداشت بھی۔ بنا کر رکھنے اور خاندان کی بہبود، شوہر کی اطاعت کے علاوہ بے عذر اور بے غرض۔ سمیعہ قدرت کی طرف سے طاہر میاں کے لیے انعام سے کم نہ تھی۔ ماں باپ کی خوبیاں اولاد میں بھی منتقل ہوئی تھیں۔ بچے پرامن اور فرماں بردار تھے۔ جبکہ وہ خالہ اماں کو بہانے سے گھر لے آئے تھے۔ ان کی تنہائی کا خیال کر کے مگر کہا تو یہ.....

"میرے بچے بگڑ رہے ہیں خالہ اماں! انہیں کسی بزرگ کی اشد ضرورت ہے جو ان کی اصلاح کر سکے۔ آپ کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا مجھے۔"

یہ ان کی محبت انسان دوستی اور دردمندی کی کوئی مثال تھی۔ ورنہ نہ تو بچے بگڑے تھے نہ ان کو کوئی لت لگی تھی۔ تربیت تو ماں باپ کی طرف سے از خود ہو رہی تھی۔ ان کی نیکی، صلح جوئی اور یگانگت کی بدولت۔ بچوں کو ماں باپ کی مصروف زندگی کی وجہ سے توجہ نہ ملی تھی۔ جو خالہ اماں نے آ کر پوری کر دی۔ سمیعہ نے بھی اعتراف کیا کہ گھر میں اب پہلے جیسی افراتفری اور بکھراوا نہیں رہا۔ بچے جو بہت چھوٹے نہ تھے، خالہ اماں کی ہدایت پر عمل کرنے لگے۔

اسکول کالج جاتے وقت جو شور شرابا ہوتا۔ کسی کو موزہ نہیں مل رہا، کسی کے جوتے وغیرہ نظر نہیں آ رہے۔ عامر کے بیگ میں سے کاپی غائب..... وہ شور اب نہیں ہوتا، نہ ہی چیزیں، کپڑے بکھرے ہوئے ہوتے۔ اسکول کالج سے واپس آ کر اپنے بیگ یونہی کسی کرسی یا صوفے پر پٹخنے کے بجائے خود کمرے میں لے جا کر رکھنے کی عادت بھی ہو گئی۔ بغیر کہے یونیفارم بدل کر منہ ہاتھ دھو کر باہر آتے۔ ورنہ انہیں بار بار پکارنا پڑتا تھا۔ شروع میں خالہ اماں ان کے بھاری بیگ فائلیں وغیرہ اٹھا کر ان کے کمرے میں رکھ آتی تھیں۔ لڑکوں کا ہاتھ پکڑ کر باتھ روم تک لے جاتیں۔ اب وہ خود سب کر لیتے۔ رات کو سب ساتھ کھانا کھاتے مل جل کر۔ غرض گھر میں نظم و ضبط نظر آنے لگا اور سمیعہ جو ساس کی آمد پر فکر مند بلکہ پریشان تھیں۔ بے فکر اور مطمئن ہو گئیں۔

وہ سمیعہ کے ہر عمل کو صدق دل سے سراہتی تھیں۔ خود بھی بچت اسکیمیں بتاتی رہتیں مگر اب بھی ایک ثوبیہ کی وجہ سے کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ خالہ اماں کی بھرپور توجہ بھی اکثر ناکام ہو جاتی۔ ثوبیہ ضدی تھی۔ اپنے گھر کے ماحول کے ستائی ہوئی۔ یہاں محبت اور یگانگت کا ماحول ملا۔ اس میں مزید چڑ پیدا ہوئی۔ شانزے کو زچ کرنے کا کوئی موقع وہ چھوڑتی نہ تھی۔ شانزے ماں کی ہدایت پر طرح دے جاتی۔ لڑنے جھگڑنے کی اس کی عادت نہ تھی۔ وہ سب ثوبیہ پر مہربان تھے۔ وہ اس پر اور بھی بگڑتی۔ خالہ اماں نے طاہر میاں سے کہا بھی۔

"اگر ثوبیہ کی ہر خواہش پر عمل کیا جائے گا تو وہ عادی ہو جائے گی۔ نہ جانے اس کی خواہشات کتنی ترقی کریں۔ شانزے کے ساتھ زیادتی ہوئی تو وہ بھی مایوس ہو گی۔ مقابلہ نہیں ہونا چاہیے۔ ثوبیہ کا حوصلہ بڑھا تو آگے جا کر نہ جانے کہاں ختم ہو گا۔ اسے روکنا ضروری ہے۔"

"آپ درست کہہ رہی ہیں خالہ اماں! بس میں اس کی ضد کے سامنے مجبور ہو جاتا ہوں۔ سائرہ کا خیال آجاتا ہے۔ سمیعہ بھی درگزر کرتی ہے۔ یتیم بچی ہے۔ اس کا دل نہ ٹوٹے۔"

"لیکن اس طرح اس کی عادت پختہ ہو گی۔ خیر دیکھتے ہیں۔ بچے کے ساتھ بچہ تو نہیں بنا جا سکتا۔ مگر غلط بات کو صحیح کہنا بھی اچھا نہیں۔ نہ جانے آگے جا کر نصیب میں کیا لکھا ہے۔ تمہاری تربیت پر حرف نہ آئے۔"

"وقت کے ساتھ حالات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ عادات بھی بدل جاتی ہیں۔ ابھی بچپنا ہے۔ عمر کے ساتھ برے بھلے کی پہچان ہو ہی جائے گی۔ کچھ نہ کچھ اثر سائرہ کا ہو گا۔ وہ کتنی ہنس مکھ، ہمدرد اور مل جل کر رہنے والی تھی۔ ہر اچھی نصیحت پر عمل کرنے والی۔ خدمت گزار۔"

"سائرہ جیسی لڑکیاں کم ہوتی ہیں۔ ثوبیہ کو ماں کی صحبت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ بہت کم عمری میں ماں سے محروم ہو گئی۔ باپ کی بے رخی نے اور بھی ستم کیا۔"

"خالہ اماں! اس کے زخمی دل پر محبت کے پھاہے، ہمدردی کا مرہم ہی اس کا علاج ہے۔ دراصل ابھی وہ بدگمانی کے خول سے نکلی ہی نہیں۔ جب وہ اس خول سے نکلے گی۔ دوست، دشمن کی پہچان بھی تب ہی ہو گی۔"

شانزے کو اپنے سوٹ کی فکر تھی۔ ثوبیہ سے بگاڑ بھی اسے منظور نہ تھا۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے، ایک ساتھ پڑھتے ہوئے، دوستی میں ذرا سی غلط فہمی کی وجہ سے رخنہ اسے گوارا نہ تھا۔ اس نے باپ کو جج بنا کر اپنا مقدمہ پیش کیا۔ وہ ہنس دیے اور خالہ اماں کی طرف اشارہ کیا۔

"سپریم کورٹ کے جج کو فیصلے کا اختیار ہے۔ جو یہ کہیں، تمہیں کرنا پڑے گا۔"

خالہ دادی شانزے کے پاس آئیں۔ جو منہ

پھلائے بیٹھی تھی۔ ”ارے بھئی! میں انصاف کروں گی۔ کیوں پریشان ہوتی ہے میری بلبل!“ شانزے نے سر اٹھایا۔

”خالہ دادی! مجھے بلبل کیوں کہا آپ نے۔ کیا میں بہت بولتی ہوں؟“ پریشانی سے پوچھا۔

”بہت نہیں، بہت میٹھا بولتی ہے۔“ وہ پیار سے اس کا سر سہلانے لگیں۔

”اچھا، چلو اٹھو یہ والا اپنا سوٹ ثوبیہ کو دے دو۔ میرے پاس ایک سادہ سوٹ کا کپڑا رکھا ہے۔ اس کی قمیص پر ریشم کے پھول بنا لینا۔ مطلب کڑھائی کر لینا۔“

”کڑھائی کیا۔۔۔؟“

”ارے بابا! سوئی دھاگے سے پھول بنانے کو کڑھائی کہتے ہیں۔“

”مجھے کب آتا ہے سوئی دھاگے کا کام۔“

”میں سکھاؤں گی۔ پہلے تم کپڑا دیکھ لو۔ پسند آجائے تو پھر میں اس پر پھول بنا دوں گی۔“

”خالہ دادی! آپ؟ یعنی کہ۔۔۔ اور اگر وہ بھی ثوبیہ کو پسند آگیا؟“

”نہیں آئے گا۔ ہلکے کلر اسے کب پسند آتے ہیں اور اگر اس نے ضد کی تو اسی شرط پر ملے گا۔ یعنی جو کڑھائی کرے، سوٹ اسی کا۔ شوق کا امتحان ہے۔“

”امتحان سے میں نہیں ڈرتی۔ چلیں دکھائیں۔“

کپڑا بہت اچھا تھا۔ رنگ بھی شانزے کی پسند کا تھا۔ پھر بھی وہ دونوں سوٹ ثوبیہ کو دکھانے لے گئی۔ حسب توقع اس نے خالہ دادی کے سوٹ کو نظر انداز کر کے پہلا والا پسندیدہ سوٹ اٹھا لیا۔ ”سادہ اور اتنا پھیکا رنگ؟“

ثوبیہ نے شانزے کو طنز سے دیکھا۔ شانزے نے فراخ دلی سے کہا۔ ”تم اپنا والا بھی امی سے لے لو۔“

خالہ دادی نے قمیص کا پیس الگ کر کے اس پر بہت خوب صورت بیلیں بنا دیں۔

”اتنی زیادہ؟“ وہ چیخی۔ ”آتا جاتا کچھ ہے نہیں مجھے۔“

”گھبراؤ نہیں۔ کچھ میں مدد کروں گی۔ کچھ تمہاری ماں، مگر پورا کرنا تمہارا کام ہے۔ بھئی! شرط کا یہی اصول ہے۔“

”امی کو ایمبرائڈری آتی ہے؟“ حیرت سے منہ کھلا رہ گیا اور جب سمیعہ نے ہی اس بیل پر سوئی سے افتتاح کیا تو مزید آنکھیں پھیل گئیں۔ ”امی! آپ نے مجھے کیوں نہیں سکھایا؟“

”بیٹا! فرصت ہی نہیں ملی اور اب تو دکانوں پر ہر کام ہو ہی جاتا ہے۔ سہولت ملتی ہے تو فائدہ اٹھا لیا جاتا ہے۔ چلو! اب تم سوئی پکڑو اور ہو جاؤ شروع۔“

شانزے نے بڑے ذوق و شوق سے پھول بنانے شروع کیے۔ اسے یہ کام بہت پسند آیا۔ ہنر سیکھنے کی خوشی اور اپنی قمیص پر خوب صورت رنگوں کے بکھرے ہوئے پھول۔ اپنی محنت سے بنائے گئے ان پھولوں کو اس نے چوم لیا۔ اسے لگا، ان میں خوشبو بھی آرہی ہے۔

ثوبیہ نے شانزے کی پراسرار مصروفیت کا پیچھا کیا اور حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”بھئی! پھول بنا رہی ہوں۔ ہلکا رنگ ہے۔ اسے ذرا رنگین بنانا تھا۔ کیسا ہے؟“

”ہاں اچھا ہے۔ تمہیں ایمبرائڈری آتی ہے۔۔۔؟ کس نے سکھائی؟“

”خالہ دادی اور امی دونوں نے۔ آسان ہے۔ تم بھی کوشش کر لو۔“ شانزے نے فریم اس کے حوالے کیا۔ چند غلط ٹانکوں کے بعد آخر اس نے بھی صحیح ٹانکا سیکھ لیا۔

☼ ☼ ☼

شانزے کی خالہ رفیعہ امریکہ کی رہائشی تھیں۔ سسرال ان کی پشاور میں تھی۔ دو چار سال بعد جب بھی آتیں۔ سب سے مل کر واپس جاتیں۔ اس بار بغیر اطلاع کے پہنچ کر سب کو حیران کر دیا۔

سمیعہ کی خوشی کی حد نہ تھی۔ اس بار ان کا بیٹا بھی ساتھ آیا تھا۔ بہت خوب صورت اور اسمارٹ۔ دو تین

دن ملنے ملانے میں گزر گئے۔ یہاں بھی ان کے کئی رشتے دار تھے۔ پھر گھر بیٹھ کر بات کرنے کا موقع ملا تو بتانے لگیں۔

”میں اس بار ایک خاص غرض لے کر آئی تھی۔“

اس وقت سمیعہ، طاہر میاں اور خالہ اماں بھی موجود تھیں۔ نوجوان پارٹی لان میں کرکٹ کھیل رہی تھی۔ رفیعہ کی بات سن کر سمیعہ اور خالہ اماں کے ذہن میں ایک ہی غرض کلبلائی۔

بیٹے کے لیے۔ لڑکی کی تلاش۔۔۔ اور گھر میں دو دو لڑکیاں موجود تھیں۔

”امریکا میں چودہ سال گزار کر ایک سبق میں نے حاصل کیا ہے۔ لاکھ سہولتوں اور نعمتوں کے انبار، دولت کی فراوانی، عیش و آرام کے باوجود محبتوں کا فقدان، رشتوں سے لاتعلقی، اپنی معاشرت سے ناواقفیت، مذہب سے دوری، خود غرضی اور بے حسی کا جال بچھا ہوا ہے، جس میں الجھ کر انسان منہ کے بل گر سکتا ہے۔ سنبھل نہیں پاتا۔ میں وہاں رہنے پر مجبور نہیں ہوں۔ چودہ سال کا بن باس کاٹا ہے میں نے شوہر کی خواہش، بچوں کی اعلا تعلیم اور شان دار مستقبل کی خاطر۔ اب ایسی کوئی مجبوری ہے نہ کوئی خواہش ناتمام۔ گو کہ وہاں بھی میں نے گھر کو اپنی تہذیب کے اصولوں پر چلایا ہے۔ وہی قوانین اور اصول جو ہمیں یہاں بچپن سے سکھائے گئے۔ اور جس کی تعلیم مذہب کے مطابق دی گئی۔ وہی پابندیاں جو ہمارے معاشرے میں رائج ہیں مگر گھر کے باہر سارے اصول و قوانین مذہبی اقدار پامال اور ہم بے بس۔“

وہ طاہر میاں کی طرف مڑیں۔

”طاہر بھائی! میں سخت عاجز اور پشیمان بھی ہوں۔ جو تربیت میں نے اپنی معاشرت کے مطابق دی ہے۔ امریکا میں اس کی قدر ہے نہ ضرورت۔ ابھی اولاد میرے قابو میں ہے مگر وہاں رہ کر شاید زیادہ عرصہ میرے اصولوں پر قائم نہ رہ سکیں۔ چاہتی ہوں کہ ان کو اپنے اصل سے آگاہی رہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ بھی خود غرضی اور مذہبی اقدار سے دوری کو راہ نجات سمجھ کر اسی رنگ میں رنگ جائیں۔ اپنے وطن، عزیزوں اور اس معاشرت میں رچ بس کر اس فرق کو پہچان لیں۔ خالہ اماں!“

اب وہ خالہ اماں سے مخاطب ہوئیں۔

”میرے بیٹے بہت نیک، سعادت مند اور فرماں بردار ہیں۔ انہیں میری خواہش کا احترام ہے۔ جب سے ہم آئے ہیں۔ فہد جاب کی تلاش میں ہے۔ اسے یہاں رہنے میں کوئی تامل نہیں۔ اب اسے بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔ اس کی کوشش کامیاب ہو گئی۔ آپ بزرگ ہیں۔ بتائیے! میرا پاکستان واپس آنے کا فیصلہ کتنا درست ہے۔“

”بہت ہی مبارک قدم اٹھایا ہے تم نے۔ اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں اور ترقی دیکھنا نصیب ہو۔ رفیعہ! بہت ہی بروقت اور صحیح فیصلہ کیا ہے۔ ان شاء اللہ تم کبھی نہیں پچھتاؤ گی۔“

خالہ اماں واقعی بہت خوش ہوئیں۔

”مگر میری سسرال والوں کو یہ فیصلہ پسند نہیں آیا۔ وہ سمجھتے ہیں، میں ترقی دولت اور خوش نصیبی کو لات مار کر بیٹوں کو تاریک مستقبل کا تحفہ دے رہی ہوں۔“

”نیک مقصد اور پختہ ارادہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔“ طاہر میاں نے بھی اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”یوں بھی تجربہ انسان کی سرشت میں ہے۔ ہمت بلند کرتا ہے۔“

خالہ اماں نے رفیعہ کے کندھے تھپتھپائے۔ ”مجھے بہت خوشی ہے کہ تم نے بیٹے کے لیے اپنے ملک کو امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک پر ترجیح دی اور شاباش ہے بچوں کو۔ جنہوں نے ماں کی خواہش کا احترام کیا۔ نیک نیتی سے کیا یہ فیصلہ ان شاء اللہ سب کے لیے مبارک ہو گا۔“

”خالہ اماں! اپنوں سے الگ رہ کر اتنا عرصہ کس طرح میں نے گزار لیا۔ اب تو سفر کے لیے مہینوں سے ہمت باندھتی ہوں۔ تب جا کر ارادہ پورا ہوتا ہے۔ لمبے سفر کی طاقت نہیں رہی۔ میری نند کا خیال ہے کہ میں بہت دقیانوسی عورت ہوں۔ فرسودہ روایات کو عزیز رکھنے اور اپنی جڑوں سے جڑے رہنے کی خواہش

مند۔ میں نہیں چاہتی میری اولاد وہ غلط امریکیوں کی فطرت اختیار کرلے۔ جن کا دین ایمان عیش و عشرت۔ نہ ان کو خاندان سے واسطہ نہ رشتوں کا پاس ہے۔ ماں باپ بھی جن کی نظر میں فالتو اور فضول ہوتے ہیں۔"

"رفیعہ آپا! یہاں بھی اب کچھ اسی طرح کا ماحول بنتا جارہا ہے۔" طاہر میاں کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگے۔ "شکر ہے ابھی خاندان بندھے ہوئے ہیں۔ مگر خیالات بدل رہے ہیں۔"

"ہاں ایسا ہو رہا ہے۔ مگر ہم جیسے چند لوگ بھی مضبوطی سے اپنے ارادوں پر قائم رہیں۔ مل جل کر ساتھ چلنے کی روایت قائم رکھیں تو سب کو تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرنے سے بچاسکتے ہیں۔" رفیعہ بہت پرامید تھیں۔ "اور خیالات تو ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی پرانے خیالات کا حامی ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسروں کو قائل کر بھی لیتا ہے۔ نئے اور پرانے خیالات مل کر ایک نئی مگر بہتر تہذیب کے بانی ہوسکتے ہیں۔"

"اصل چیز ہے، دوسرے کو قائل کرنا۔ یہ ہنر ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا۔" خالہ اماں نے کہا۔

"ایک وقت ایسا آتا ہے جب لوگ قائل ہوجاتے ہیں۔ اب عمل کریں نہ کریں۔ یہ الگ بات ہے۔" کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رفیعہ نے طاہر میاں کی طرف دیکھا۔

"ایک بات آپ سے کرنا چاہتی تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا۔ کس طرح وضاحت کروں۔"

سب ان کی اگلی بات کے منتظر تھے۔ کچھ کچھ سمجھ بھی رہے تھے۔

"ایسا ہے کہ... فہد کی یہاں جاب ہوگئی ہے۔ میں تو چلی جاؤں گی۔ چھوٹے کی بھی اگلے سال تعلیم مکمل ہوجائے گی یہاں۔ تب تک مکان وغیرہ کا انتظام فہد کے ذمے ہے۔ اس دوران... آپ کے گھر فہد کا قیام... مناسب نہیں لگتا۔ میں لڑکے لڑکیوں کے بے محابا میل ملاپ کو پسند نہیں کرتی۔ اس لیے سوچا یہ تھا... کہ آپ لوگوں کی مرضی لے کر شانزے کو مانگ لوں گی۔ منگنی کی میں قائل نہیں۔ سیدھا نکاح ہوگا تاکہ فہد کے یہاں قیام پر کوئی اعتراض نہ کرسکے۔ شرعی رشتہ قائم ہونے کے بعد میں بھی مطمئن رہوں گی اپنی واپسی تک۔ آپ کے جواب کے بعد... پھر دوسرا مسئلہ بیان کروں گی۔ فہد سے آپ مل لیے۔ اس کی طبیعت، مزاج، تعلیم، سب سے واقف ہیں۔ زبردستی کی میں قائل نہیں۔ اگر مناسب لگے تو رشتہ اور مضبوط ہوگا۔"

سمیعہ، رفیعہ سے لپٹ گئیں۔ "آپا! کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ ہمیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟"

"لوگ تو امریکا میں بیٹی بیاہنے کے لیے بے چین ہیں۔ میں نے یہاں یہی دیکھا ہے۔ اس لیے کہہ رہی ہوں۔ مشورہ کرکے جواب دو۔ فہد پاکستان میں رہائش اختیار کرے گا۔ امریکن پاسپورٹ ضرور ہے مگر وہاں مستقل آباد ہونے کا اس کا ارادہ نہیں ہے۔ یہی میرا اس سے عہد ہے۔ میری زندگی تک تو یہ عہد قائم رہے گا۔ بعد میں کیا ہوگا اللہ ہی جانے۔"

طاہر میاں نے خالہ اماں سے رجوع کیا۔ "آپ کا کیا خیال ہے خالہ اماں!"

خالہ اماں تو رفیعہ کے خیالات سے پہلے ہی ان کی گرویدہ ہوچکی تھیں۔ پھر بھی محتاط لہجے میں بولیں۔

"بات یہ ہے بیٹا... تم باپ ہو، سمیعہ ماں۔ تم جس نظریے سے پرکھو گے، میں... ظاہر ہے اس تک نہیں پہنچ سکوں گی۔ باقی یہ کہ... رفیعہ کی تربیت پر مجھے پورا یقین ہے۔ تم اگر بچی سے بھی رائے لے لو تو بہتر ہے۔ مذہبی نقطے سے بھی اس کا حکم ہے اور شانزے ماشاءاللہ بہت سمجھ دار ہے۔"

طاہر میاں نے بیوی کو دیکھا۔ پھر بولے۔ "آپا! ظاہر ہے ہمیں اس سے بہتر رشتہ نہیں مل سکتا لیکن... آپ نے دوسرے مسئلے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ بتائیں۔"

رفیعہ نے سوچ کر کہا۔ "آئی تو اسی ارادے سے تھی۔ فہد یہاں رہے یا کہیں اور، لیکن میں ایسا کوئی موقع نہیں آنے دینا چاہتی تھی، جو بعد میں کسی خرابی کا باعث ہو۔ ظاہر ہے لڑکے، لڑکیاں، چچا، ماموں، خالہ، پھوپھی کے گھر رہ لیتے ہیں تعلیم یا جاب کے سلسلے میں۔ میں دراصل امریکا کے ماحول سے ڈری ہوئی ہوں۔ بہتر یہی سمجھتی ہوں کہ کسی ممکنہ برائی یا اعتراض سے بچنے کے لیے نکاح کا بندھن بہتر ہے اور میری واپسی یعنی یہاں سے جانے کے بعد دوسرے رشتے داروں کو فہد سے امید لگائے رکھنے کا خدشہ بھی نہیں رہے گا۔ وہ ابھی نیا نیا امریکا سے آیا ہے۔ ہر کسی سے جلدی فری ہوجاتا ہے۔ اسے برا نہیں سمجھتا۔ یہاں صرف شانزے ہی نہیں ہے۔ جو بہرحال شرعی رشتے کے بعد اعتراض کی زد میں نہیں آئے گی لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا۔ یہاں ایک لڑکی اور بھی ہے۔ ممکن ہے دوسروں کو اس پر اعتراض ہو۔"

تینوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ خالہ اماں نے ہی پہل کی۔

"رفیعہ! یہ سچ ہے کہ برائی ہر جگہ ہی پھلتی پھولتی ہے۔ امریکا پر ہی منحصر نہیں اور لڑکے لڑکیوں کا میل ملاپ اکثر برے نتیجے دکھاتا ہے مگر شکر ہے کہ ابھی ہمارے گھرانوں میں شرم و حیا اور رشتوں کے تقدس اور نزاکتوں کا احساس موجود ہے۔ ابھی لڑکیاں اتنی بے باک نہیں ہوئیں کہ رشتوں کے بھرم نہ رکھ سکیں اور اگر کبھی کہیں بے اعتدالی ہو بھی تو بڑوں کے فیصلوں کا احترام کرتی ہیں۔"

"دراصل خاندان کے لوگ جن کی بیٹیاں بہنیں ہیں، مجھ سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ کل جو میں عابدہ آپا سے ملنے گئی۔ وہاں عائشہ بھی آگئی۔ دونوں نے الگ الگ مجھ سے صاف طور پر کہا کہ وہ مجھ سے رشتہ جوڑ کر مزید پختہ کرنا چاہتی ہیں۔ وودو بھائی کی بیگم نے بھی مدعا ظاہر کیا ہے۔ اس لیے بھی منگنی کے بجائے نکاح پر زور دے رہی ہوں۔ میرے جانے کے بعد فہد سے ملنے کے لیے لوگ آئیں گے ہی۔ نکاح کے بعد... امید نہیں رہے گی۔" غرض باتوں باتوں میں رشتہ نکاح کی تاریخ طے ہوگئی۔

رات کو سمیعہ نے شانزے کو بتایا۔ وہ دم بخود ماں کو تکتی رہ گئی۔

"تمہیں کیا پریشانی ہے؟ انکار کرنا چاہو تو کردو۔ ابھی وقت ہے۔ وہ کسی اور کے گھر...!"

"امی! اتنی جلدی کیا ہے؟ میری پڑھائی... خالہ امی کی واپسی پر بھی سب کچھ ہوسکتا ہے۔"

سمیعہ نے سکھ کا سانس لیا۔ "بھئی! ان کی خواہش ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرے ان سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کو خبر ہوجائے۔ وہ کوشش ترک کردیں۔ آپا تو رخصتی کا بھی کہہ رہی تھیں مگر ہمیں تو تیاری کے لیے وقت چاہیے اور پیسہ بھی۔"

"امی... مگر میں ابھی شادی شدہ ہونا نہیں چاہتی۔" وہ ٹھنک کر بولی۔ "کیا کہیں گے سب۔ ہائے اللہ!"

"دیکھو! اگر فہد پسند نہیں تو بتادو۔ پھر ہم ثوبیہ کے لیے...؟"

"توبہ امی! کیا ہیں آپ بھی بس۔ میں تو اتنی فوری...!"

سمیعہ ہنستی ہوئی آگئیں۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن شام کو سمیعہ نے بتایا۔ "آپا! تمہارے ساتھ جاکر نکاح کا جوڑا لینا چاہتی ہیں تاکہ اس میں کچھ رد و بدل کرانا ہو تو کرالیں۔ آج ہی پسند کرلو۔"

"آپ ہی پسند کرلیں اور خود ہی ردوبدل بھی کرالیں۔" وہ منہ پھلائے میز پر چڑھی بیٹھی تھی۔

کل سے اب تک عاشر، عامر اور ثوبیہ نے اس کا کس قدر مذاق اڑایا تھا۔ مگر جب رفیعہ نے آکر اسے دیکھا تو کہا۔

"اگر آج تم تیار نہیں ہو۔ تو ہم کل کا پروگرام رکھ لیتے ہیں۔"

وہ کود کر میز سے اتری۔ "میں تیار ہوں خالہ امی!"

خالہ امی نے اس کی تیاری پر غور کیا۔ صبح سے وہی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جلدی سے بالوں کو سمیٹا۔ پلنگ سے دوپٹا لے کر جسم پر لپیٹ لیا۔

رفیعہ نے اس کی تیاری کی داد دی اور بازو سے پکڑ کر باہر لائیں۔ جیسے سپاہی چور کو پکڑتا ہے۔ سمیعہ سے بولیں۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ لو دیکھو یہ تو فٹ فاٹ ہے۔"

دونوں بہنیں ہنس رہی تھیں۔ اسے لگا اس کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ جھینپ مٹانے کو بولی۔

"خالہ امی! ثوبیہ کو ساتھ لے لیں؟"

"ہاں ہاں ضرور۔" انہوں نے کہا۔

اشارے کی دیر تھی۔ ثوبیہ فورا" آگئی۔ باہر نکل کر دیکھا۔ فہد گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ شانزے بوکھلا گئی۔ ثوبیہ کا بازو دبوچ کر منمنانے لگی۔ رفیعہ نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور انہیں اشارہ کیا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھ گئیں۔

رفیعہ اگلی سیٹ پر جا بیٹھیں۔ یہ گاڑی ایک دن پہلے ہی رفیعہ نے فہد کے آفس آنے جانے کی سہولت کے لیے منگوائی تھی۔ آتے ہی بک کرائی تھی۔ ایک بہت بڑے شاپنگ پلازا کے سامنے پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی۔ اتنے عالی شان جگمگاتے شاپنگ مال میں لڑکیاں کبھی نہیں آئی تھیں۔ ثوبیہ مارے شوق کے آگے نکل گئی۔ فہد نے شانزے کے ساتھ چلتے ہوئے چپکے سے کہا۔

"یہ اپنا دربان ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ امی تو تھیں۔"

شانزے کو ہنسی آگئی۔ وہ فہد کے ساتھ بے تکلف ہو چکی تھی مگر نکاح کے شوشے نے اسے محتاط کر دیا۔ بات طے ہونے کے بعد وہ فہد کے سامنے گئی ہی نہیں۔

اندر آکر رفیعہ نے فہد اور شانزے سے کہا کہ وہ خود اگلی دکان پر جا کر جوڑا پسند کرلیں۔ وہ ثوبیہ کی پسند سے ثوبیہ کا سوٹ اور سینڈل لیں گی۔ ثوبیہ جھجک کر بولی۔

"نہیں نہیں میرے پاس تو کپڑے ہیں آ... آپ کیوں؟"

"بھئی! سمیعہ نے تمہارے سوٹ کے لیے مجھے پیسے دیے ہیں۔ آخر تم شانی کی بہن ہو۔"

فہد نے خود ہی سوٹ پسند کیا۔ شانزے سے رائے ضرور لی۔ اسے بھی بہت اچھا لگا۔

واپسی میں ثوبیہ نے فہد کو گاڑی کی مبارک باد دی اور مٹھائی مانگی۔ مٹھائی کے بجائے آئس کریم پر سمجھوتا ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ رشتے داروں پر فہد کے نکاح کی خبر بجلی بن کر گری۔ جو آس لگا کر بیٹھے تھے مایوس ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

دس دن افراتفری کے بعد نکاح کا دن آگیا۔ سمیعہ نے اپنے سب رشتے داروں کو بلایا تھا۔ کچھ لوگ رفیعہ کی طرف سے شریک ہوئے۔ سمیعہ کی خالہ صبح سے ہی آوارد ہوئیں۔ پہلے تو رفیعہ سے شکووں کے انبار لگائے۔ پھر بہوؤں کی داستان خصوصی طور پر رفیعہ کے آگے گوش گزار کی۔

رفیعہ حیران پریشان ہو گئیں۔ مارے تاسف کے چہرہ اتر گیا۔ بے چاری خالہ پر بڑا ترس آیا۔ کس قدر مظلوم ہیں خالہ۔ ان کو متاثر دیکھ کر وہ اور پھیل گئیں۔

"دیکھ لو! نصیبوں والے ایسے ہوتے ہیں۔ جیسے یہ طاہر کی خالہ۔ کیا مزے سے بھانجے کے گھر پر راج کر رہی ہیں۔ عیش ہیں ان کے پورا گھر مٹھی میں ہے۔ ایک میں ہوں کوئی پرسان حال نہیں۔ اولاد والی ہو کر بے آسرا' بے ٹھکانہ' کب بیٹے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال باہر کریں۔ کہاں جاؤں گی میں۔ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتی ہوں۔ ارے ایسی بدبخت ہوں میں۔ کوئی چاہنے والا ہے نہ پوچھنے والا۔"

بھل بھل آنسو بہانے کی ماہر تھیں۔ رفیعہ ان کی دل جوئی کرنے لگیں۔ خالہ اماں سے بھی مدد چاہی۔ وہ ان کو سمجھانے لگیں۔

"بہن! مایوس نہ ہوں۔ اللہ سب کے ساتھ ہے۔ شکر کریں۔ اپنا گھر ہے۔ اپنی چھت تلے رہتی ہیں۔ دوسروں کے نصیبوں سے اپنا مقابلہ نہ کریں۔ آپ نہیں جانتیں کس کے لیے جزا مقرر کی ہوئی ہے اور صبر کا بہت انعام ہے۔ دعا کریں۔ آپ کے سب بچے سعادت مند اور..."

انہوں نے بات پوری ہونے سے پہلے ان کا ہاتھ جھٹکا۔ تلخی سے بولیں۔ "بس رہنے دیں آپ اپنی نصیحت۔ ایسے وعظ بہت سنے ہیں میں نے جس پر مصیبت آتی ہے' وہی جانتا ہے۔ صبر کرنا کوئی آسان نہیں۔ سب زبانی کلامی باتیں۔ ارے اپنا حق مانگتی ہوں۔ کیوں صبر کروں۔ بیٹوں سے بھی حق نہ مانگوں؟ صبر تو آپ جیسے لوگوں کو کرنا ہوتا ہے۔ جن کا کوئی آگے نہ پیچھے ...... بھئی کریں آپ صبر۔ میں کب روکتی ہوں؟ اور کیسا صبر؟ بھانجی میری' حکومت آپ کی۔ عیش تو آپ کے ہیں۔ ہوتا آپ کا کوئی نالائق' نافرمان بیٹا۔ پھر پوچھتی۔ بہن! کتنے پانی میں ہو۔"

خالہ اماں کا رنگ اڑ گیا۔ پیچھے ہو کر بڑبڑائیں۔

"آپ کو سمجھانا بیکار ہے۔" اور باہر نکل گئیں۔

ثوبیہ خالہ نانی کے لیے پانی کا گلاس لائی تھی۔ وہ بھی نانی خالہ کے فرمودات پر بدمزگی سے سمیعہ کو دیکھنے لگی۔

"میں کہے دیتی ہوں سمیعہ!" وہ آنسو پونچھ کر سمیعہ سے مخاطب ہوئیں۔ "میرا اور تو کوئی آسرا ہے نہیں۔ بیٹوں نے گھر سے نکالا تو سیدھی تمہارے گھر آدھمکوں گی۔ آخر تم نے اپنی خالہ ساس کو بھی تو جگہ دے رکھی ہے۔ میں تو تمہاری سگی خالہ ہوں۔"

"خدا نہ کرے خالہ! کہ آپ اپنے گھر سے نکلیں۔" سمیعہ نے ان کے کندھے دبائے۔ "سل اپنی جگہ بھاری ہوتی ہے۔ آپ کہیں نہیں جائیں گی۔ نہ بیٹے اتنے بے مروت ہیں۔ آپ بہوؤں سے دوستی کرلیں۔ کچھ ان کی مانیں۔ کچھ اپنی منوائیں۔ پوتے پوتیوں کو خود سے قریب کرلیں۔"

"ہائے رے!" ان کی سوئی ایک جگہ اٹک گئی۔ "بہوؤں سے دوستی؟ توبہ کرو! وہ کب خاطر میں لاتی ہیں مجھ کو۔ سب کی سب غیر خاندان کی۔ میرا کون سا خون کا رشتہ ہے ان سے۔ جو میں دوستی کروں؟ واہ جی! اچھی کہی' خوب کہی۔"

"پوتے پوتی سے تو آپ کا رشتہ ہے۔ آپ کا خون ہے۔ انہیں اپنا بنائیں۔ پاس بٹھا کر باتیں کریں۔ کہانیاں سنائیں۔ ان کے دل میں جگہ بنائیں۔ پھر دیکھیں۔ محبت تو پتھر کو موم کر دیتی ہے۔" سمیعہ سمجھا رہی تھیں۔

"ایک دل کی بات کی تھی تم سے۔ تم نے بھی تقریر شروع کر دی۔ تم نے یہ اپنی خالہ ساس سے سیکھا ہو گا۔ بخشو بی بی چوہا لنڈورا بھلا۔"

ناراض ہو کر جانے لگیں۔ سمیعہ نے انہیں پکڑ لیا۔

"خالہ! پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ ایک گھر میں رہ کر بہوؤں سے مل کر رہنا پڑتا ہے۔ آپ کے گھر کی عزت ہیں۔ بیٹوں کے گھر آباد ہیں ان سے۔ پوتے پوتی رونق ہیں آپ کے گھر کی۔ آپ پہل کر کے تو دیکھیں۔"

"ایک بار تمہارے گھر آکر رہنے کا ذکر کر کے گناہ گار ہو گئی میں۔ تم نے سیدھا باہر کا رستہ دکھا دیا۔"

"نہیں! میں نے آپ کو گھر کا راستہ دکھایا ہے۔ وہ گھر جو آپ کا ہے۔ آپ نے خود اسے سجایا سنوارا۔ پھر بیٹوں کی شادیاں کر کے بہوؤں کے سپرد کر دیا۔ دیکھیں! یہ طاہر کی خالہ اماں ہیں۔ جب سے آئی ہیں میرے بچے ان کے گرویدہ ہیں۔ انہوں نے خود سب کے دل میں جگہ بنائی ہے۔ مجھے بھی اب ساس کی قربت نصیب ہوئی ہے تو بہت لطف آرہا ہے۔ وہ میرا' میرے گھر اور بچوں کا خیال کرتی ہیں۔ میں بھی ان کی عزت اور خدمت کرتی ہوں۔ یقین کریں! انہوں نے پہل کی اور مجھے عزت کے اونچے مقام پر پہنچا دیا۔ بہت قدر کرتی ہیں میری اور میں تو ان کے بھانجے کی بیوی ہوں۔ آپ کے تو وہ بیٹے ہیں۔ ان سے بڑھ کر آپ کا اور کون ہو سکتا ہے۔"

سمیعہ بہت نرمی سے بات کر رہی تھیں مگر خالہ کو گوارا نہ ہوا کہ وہ خالہ اماں کی تعریف کریں۔ برقعہ سمیٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ رفیعہ نے بھی بہت روکا۔ نہیں رکیں سمیعہ نے بتایا۔

"آپا! فکر نہ کریں۔ میں سرمد کو فون کر دوں گی۔ وہ

شام کو انہیں لے آئیں گے۔ خالہ کی زبان بھی کڑوی ہے۔ مزاج میں سختی ہے۔ اصول ان کے بے لچک ہیں۔ برملا بہوؤں کو سخت سست کہتی ہیں۔ بہوئیں بھی کب تک برداشت کریں۔ اب دیکھیں! ہربار آکر خالہ اماں کی بے عزتی کرتی ہیں۔ وہ کچھ کہتی نہیں مگر سچی بات ہے۔ مجھے بھی ہتک محسوس ہوتی ہے۔ سوچ لیں کہ اپنی بہوؤں سے کیا سلوک کرتی ہوں گی۔"

"بہوؤں کو بھی سمجھاؤ' ان کا بڑھاپا ہے۔ اس عمر میں برداشت کم ہوجاتی ہے۔ وہ درگزر سے کام لیں گی تو شاید ...... بلکہ سرمد اور امجد سے بھی بات کرنی چاہیے۔ انہیں ماں کی خدمت اور اطاعت کرنے سے ہی جنت ملے گی۔"

"آپا! بہت خیال کرتے ہیں وہ مگر خالہ کا مزاج بہوؤں کے لیے ہی نہیں، بیٹوں کے لیے بھی کڑوا ہے۔ وہ ان کی خدمت کو ڈھکوسلا سمجھتی ہیں۔"

"اچھا! میں سرمد سے بات کروں گی۔ جاؤں گی ان کے گھر۔" رفیعہ نے کہا۔

خالہ کے ساتھ مغزماری میں خاصا وقت ضائع ہو چکا تھا۔ سمیعہ کھانے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ رفیعہ بھی اٹھ گئیں۔ خالہ کے ناراض ہوکر جانے سے متفکر تھیں۔

☼ ☼ ☼

ثوبیہ اپنے کمرے میں آئی۔ خالہ دادی پلنگ پر سر جھکائے بیٹھیں نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ آہٹ سنتے ہی اٹھ کر واش روم میں چلی گئیں۔ وضو کرکے آئیں اور نماز کی نیت باندھ لی۔ نہ جانے کون سی نماز تھی۔ ثوبیہ کو ان پر بہت ترس آیا۔ "خالہ نانی نے بھی حد کردی۔ ہربار آکر ان کی بے عزتی کرتی تھیں۔ خود تو بیٹوں سے بھی ناراض اور خالہ دادی کو بھانجے کے گھر رہنے کا طعنہ۔ بھئی کوئی کہیں بھی رہے۔ آپ سے مطلب؟ آئندہ مجھے بھی نہ یہ سب سننا پڑے۔ ہائے اللہ! اگر میں ...... خالہ دادی کی طرح چپ نہیں رہوں گی۔ صاف جواب دوں گی۔

آپ کو کیا حق ہے باتیں بنانے کا۔ ہوتی کون ہیں آپ اعتراض کرنے والی ......

بلکہ یہ بھی کہوں گی۔ آپ کو میرا یہاں رہنا پسند نہیں تو اپنے گھر جائیے ...... یہ ٹھیک ہے! تلملا جائیں گی بڑی بی۔ خالہ دادی نے خاموش رہ کر ہی ان کی ہمت بڑھائی ہے ورنہ ...... اور بھئی! نصیحت اس کو کرنی چاہیے جو مان لے۔ وہ تو کسی کی نصیحت قبول نہیں کرتیں۔ خیر ویسے مجھے بھی خالہ دادی کی نصیحتیں بری لگتی ہیں۔ کہیں میں بھی بڑھاپے میں خالہ نانی جیسی بدمزاج، سڑیل دماغ نہ ہوجاؤں۔ اف توبہ! انہیں تو یہاں کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ بلکہ شاید ان کے اپنے گھر والے بھی۔"

خالہ دادی نماز سے فارغ ہوکر پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ اب ان کا چہرہ پرسکون تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"خالہ دادی! آپ خالہ نانی کی باتوں کا برا نہ منائیں۔ بغیر سوچے بولتی ہیں۔ بھلا انہیں کیا؟ کہ کون کہاں رہتا ہے۔ اپنا غصہ اتارنے آتی ہیں۔ آپ سے جلتی ہیں۔ امی آپ کی تعریفیں کرتی ہیں نا۔ اس لیے۔"

انہوں نے ثوبیہ کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر بڑی ملائمت تھی اور شاید ان سے ہمدردی کا رنگ۔ وہ مسکرائیں۔ پتھر میں بھی جونک لگ سکتی ہے۔ ثوبیہ اور ہمدردی ...... چلو' کسی وجہ سے سہی اُس کو احساس تو ہوا۔ وہ غلط اور صحیح کا فیصلہ کرسکتی ہے۔ انہیں خوشی ہوئی اُسے لپٹا لیا۔

"نہیں بیٹا! میں کسی کی بات کا برا نہیں مانتی اور مجھ سے بھلا انہیں کیسی جلن۔ بس بولنے کی عادت ہے۔ اپنے دکھ کا اظہار اور کس طرح کریں۔ سمیعہ کو اپنا سمجھ کر بھڑاس نکالتی ہیں۔"

"مگر دوسروں کی بے عزتی کرنے کا انہیں حق نہیں ہے۔ یہ تو ناانصافی ہے۔ آپ خوامخواہ انہیں سمجھاتی ہیں۔ وہ برا مان کر چلی گئیں۔"

"بیٹا! انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کوئی سمجھائے یا کسی غلط بات کی نشان دہی کرے' جو خود کو درست سمجھتا ہے' وہ برا مانتا ہے۔ تم کو بھی میرا سمجھانا اچھا نہیں لگتا۔ ہے نا؟"

"وہ تو بس میں ...... اچھا اب برا نہیں مانوں گی۔"

"بیٹا! ہر کسی کو اپنا عمل درست لگتا ہے۔ مگر ضروری نہیں وہ فائدہ مند ہو۔ اگر کوئی سمجھائے سیدھا راستہ دکھائے تو یقیناً" وہ اپنا ہی ہوگا۔ بری نیت سے نہیں۔ ہمدردی اور محبت میں سمجھائے گا۔ اب تم یہیں بیٹھی رہو گی؟ شانزے کے پاس جاؤ اور اپنی تیاری بھی کرلو۔ عین وقت پر کوئی کمی نہ رہ جائے۔" بات ختم کرنا چاہتی تھیں۔

"شانزے بیوٹی پارلر گئی ہے عاشر کے ساتھ۔ میری تیاری تو پوری ہے۔ آپ کپڑے نکالیں۔ میں استری کردوں۔"

خالہ دادی نہال ہوگئیں۔ پہلی بار ثوبیہ اتنی لگاوٹ سے ان سے مخاطب تھی۔

☼ ☼ ☼

شام تک کافی مہمان جمع ہوگئے۔ طاہر میاں نے رفیعہ کے سسرال عزیزوں کے لیے پڑوسیوں سے دو کمرے لے لیے تھے۔ وہ پشاور اور اسلام آباد سے آنے والے تھے اور دو دن رہنا تھا۔

ثوبیہ امی کی مدد کے لیے ان کے ساتھ ساتھ تھی۔ رفیعہ اور فہد پڑوس میں اپنے عزیزوں کے پاس تھے۔ بارات جمع ہوکر آئی تھی۔

سمیعہ بھی کچھ دیر کے لیے پڑوس میں سہرا بندی کے وقت چلی گئیں۔ آخر بھانجا دولہا بن رہا تھا۔ واپس آکر خالہ اماں کو رپورٹ دی۔

"سب نے مجھے سمدھن سمجھ کر پرتپاک استقبال کیا۔ میں نے شور مچایا کہ بھئی! میں خالہ ہوں فہد کی مگر سب نے اس قدر رہلا گلا کیا گانے گائے۔

"سمدھن آئی ہیں بن ٹھن کے کرکے سنگھار ......
ان کے حسن پہ عاشق ہوئے ہیں کہار۔"

اور پتا ہے۔ آپا کی نند نے کہا سمدھن کو گالی دو۔ میں تو ڈر گئی کہ یہ کیا طریقہ ہے۔ پھر سب نے ڈھول بجا بجا کر گایا کہ۔

"سمدھن شام کو آنا
صبح کو گائے کٹے گی
گائے کا خون نکلے گا
سمدھن کے لب اسٹک لگے گی
گائے کی دم نکلے گی
سمدھن کی چوٹی بنے گی
گائے کی آنکھیں نکلیں گی۔
سمدھن کے بٹن لگیں گے۔"

آخ ابکائی آگئی مجھے۔ میں تو صدقے کے پیسے آپا کو دے کر بھاگ آئی۔"

خالہ اماں ہنس رہی تھیں۔ "ہاں بیٹا! اسی طرح گالی دی جاتی ہے سمدھنوں کو۔ مذاق کیا جاتا ہے۔ یہ سب خوشی کا اظہار ہے۔ سچ مچ گالی نہیں دی جاتی۔"

"توبہ خالہ اماں! میں تو ڈر ہی گئی۔ وہ ثوبیہ وہیں ہے۔ مزے لے رہی ہے۔"

لان میں شامیانے لگ چکے تھے۔ فرش پر قالین، کرسیاں، کھانے کی میزیں لگائی جارہی تھیں۔ رات کو بارات آئی۔ گانے گاتی خواتین۔ ڈھول بجاتے ہوئے لڑکے۔ خاصا جوش و خروش تھا۔

شانزے بیوٹی پارلر سے آگئی تھی۔ اس نے بہت ہلکا میک اپ کرایا تھا لیکن بہت پیاری لگ رہی تھی۔ سب تعریف کررہے تھے۔ نکاح ہوگیا۔ تصویریں بنیں پھر شانزے اندر آگئی۔ باہر کھانا ہو رہا تھا۔ مہمان واپس پڑوس میں معہ دولہا کے جانے لگے۔

"ممانی جان! اس طرح جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا۔ بغیر دلہن کے یوں جیسے خیر سے بدھو گھر کو آئے۔" رفیعہ کی نند کی بیٹی نے کہا۔ نندیں بھی یک زبان ہوگئیں۔ "ارے نکاح ہوچکا ہے۔ رخصتی بھی ہو جائے۔"

رفیعہ نے ہنس کر ٹالا ...... اگلے دن سب مہمان باری باری رخصت ہوئے۔ رفیعہ اور فہد بھی واپس آ گئے۔ شانزے کو دونوں سے جھجک ہوگئی۔ وہ ان کا سامنا کم سے کم کرتی۔

پھر چند دن بعد وہ امریکا سدھاریں' اگلے سال واپس آنے کے لیے۔ فہد کا آفس شروع ہو گیا۔ شانزے اور ثوبیہ کی یونیورسٹی۔ پھر فہد نے دونوں کو یونیورسٹی پہنچانے کی ذمے داری لے لی۔ یونیورسٹی اس کے آفس کے راستے میں ہی تھی۔ واپسی کبھی عاشر کے ساتھ اور کبھی بس میں۔

فہد بہت خوش مزاج مگر خاصا محتاط تھا۔ خصوصاً" شانزے سے کم ہی مخاطب ہوتا۔ بات عموماً" ثوبیہ کی معرفت کرتا۔ ثوبیہ' شانزے کا مذاق اڑاتی۔ اب ان دونوں میں دوستی پکی ہو گئی تھی۔ دراصل ثوبیہ خوش رہنے لگی تھی۔ کچھ تو شانزے اور فہد کے درمیان پیغامبر کا عہدہ ملنے پر کچھ خالہ دادی نے بھی نصیحتیں ختم کردی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ایک روز یہ دونوں یونیورسٹی سے آئیں تو ڈرائنگ روم میں مردانہ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ مہمان آئے ہیں۔ دونوں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر کھانا کھانے آئیں تو عامر نے ثوبیہ سے کہا۔

"آپ کو ابا بلا رہے ہیں اندر۔"

"ہیں؟ مجھے کیوں؟"

"آپ کے کوئی رشتہ دار آئے ہیں۔" عامر نے مطلع کیا۔ ثوبیہ کو ہنسی آگئی۔

"میرے رشتے دار تم لوگ ہو تو سہی۔"

"جاؤ..... دیکھو شاید تمہارے رشتے کے لیے کوئی آیا ہو۔" شانزے نے خیال ظاہر کیا۔ ثوبیہ اندر آئی۔ ڈرائنگ روم میں سب جمع تھے۔ طاہر ماموں' مامی' خالہ دادی اور..... وہ پہچان گئی۔ ایک اس کے تایا تھے دوسرا ان کا بیٹا ضیا۔ جسے سب ضیا کالیا کہتے تھے۔ بے چارہ بہت ہی سیاہ تھا۔ نہ جانے کس پر پڑا تھا۔ دادی جان اسے تایا کی کھرچن کہتی تھیں۔ دروازے کے پاس ہی سلام کرکے بیٹھ گئی۔

چچا نے شفقت بھرے انداز میں کہا۔ "ادھر آؤ بیٹی! میرے پاس بیٹھو۔ کیسی ہو؟"

ثوبیہ کے چہرے پر سختی چھا گئی۔ رکھائی سے بولی۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"کتنے عرصے بعد دیکھا ہے۔ بس مصروفیت' دنیا کے کام دھندے۔" وہ طاہر میاں سے مخاطب ہوئے۔ "کئی دفعہ ارادہ کیا۔ بچی کو دیکھ آؤں۔ مل آؤں۔ کبھی کوئی اچانک کام۔ کبھی صحت کی خرابی۔"

ثوبیہ کھڑی ہو گئی "مامی! میں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔ شانی میرا انتظار کررہی ہے۔"

کہہ کر جھپاک سے دروازے سے باہر نکل آئی۔ بڑبڑاتے ہوئے کھانا کھایا۔

"ہونہہ! مصروفیت جن کو مصروفیت ہوتی ہے وہ کسی سے ملتے نہیں۔ واہ! صحت کی خرابی' اچھے خاصے مسٹنڈے ہیں موصوف اور..... میں آنے لگی تو خالہ دادی نے کہا بیٹی! اچھا سے مل تو لو' ارے مل لی بھئی! کیا ان کے قدم چھودوں؟ یہ خالہ دادی بھی شوشا چھوڑنے سے باز نہیں آئیں گی۔"

اس کی بڑبڑاہٹ نے شانزے کو ساری کہانی سمجھا دی۔ "مگر یار! یہ ان کا بیٹا کیوں آیا ہے۔ تمہیں دیکھنے؟"

"اپنے باپ کا چمچہ ہے۔ خود تو کرتا ہے نہیں کچھ۔ باپ خرچا اٹھاتے ہیں۔"

"ہیں؟ تمہیں کیسے خبر ہوئی۔ کیا تم.....؟"

"ارے بابا! کالج میں وہ بوا تھی نا۔ صبح ڈسٹنگ کرتی تھی۔ ان کی بہن تایا کے گھر کھانا پکاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ بھی آئی تھی بوا کے ساتھ۔ میں نے جھٹ پہچان لیا۔ وہ بھی پہچان گئی۔ آکر ملی۔ اس نے خبریں دی ہیں۔"

"اچھا! اتنے دن بعد بھی..... پہچان گئی۔"

"بہت اچھی عورت ہے۔ تایا کا گھر ابا کے گھر کے ساتھ ہی تھا۔" ثوبیہ پہلی بار اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سنا رہی تھی۔ "جب ابا کا انتقال ہوا۔ یہ بوا آکر مجھے زبردستی کھانا کھلاتی تھی۔ ناشتا لا کردیتی۔ بعد میں بھی میرے ذمے کے کئی کام کردیتی تھی۔ ابا کی بیگم کہتی تھیں۔ لگتا ہے ثوبیہ کی ماں یہی ہے۔ بوا نے کہا بی بی!

بے ماں باپ کے بچوں کا خیال رکھنا ثواب کا کام ہے اور ثوبیہ کی ماں بہت نیک' شریف اور ہمدرد تھی۔ پتا ہے شانی! مجھے اس عورت میں اپنی ماں کی روح لگتی تھی۔"

ثوبیہ کے آنسو اس کی پلیٹ میں گر رہے تھے۔ مامی نے آکر بتایا۔ "چلے گئے ہیں وہ کل پھر آئیں گے۔"

"کیوں؟ مجھ سے کیا کام ہے اب۔" ثوبیہ الجھ گئی تھی۔

"بھئی چچا ہیں۔ مل کر جائیں گے۔ تم ان کے پاس بھی نہیں گئیں۔"

"جب امی کا انتقال ہوا۔ پھر ابا نے شادی کی۔ اس کے بعد ابا ختم ہوئے۔ تب یہ چچا کہاں تھے۔ کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ بڑے چچا' چھوٹے چچا' پھپھو کسی نے ایک وقت کے کھانے کا نہیں پوچھا۔ پیار کرنا یا تسلی کے دو حرف بھی۔ اپنے کسی مطلب سے آئے ہوں گے۔ میرا ان سے واسطہ کیا ہے؟" غصے میں دانت کچکچا رہی تھی۔

"بیٹا! پھر بھی ان کا تم سے خون کا رشتہ ہے۔ ملنا چاہیں تو حرج کیا ہے' مل لینا۔"

"خالہ دادی! یہ وہ لوگ ہیں جو..... میری امی کے خلاف ابا کو بھڑکاتے تھے اور پھر ابا....."

اس کا گلا رندھ گیا۔ کچھ بولا نہیں گیا۔ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔ کھانا یونہی رکھا رہا۔ شانزے بھی تاسف سے ہاتھ روکے بیٹھی رہی۔

"خالہ اماں! یہ تو کچھ زیادہ ہی بدظن ہے۔ کچھ تو ہے۔ دور سے ہی سلام کرکے آگئی۔ خالہ اماں! میرا اور آپ کا دخل دینا مناسب نہیں ہے۔"

خالہ اماں بھی سمجھ رہی تھیں۔ کچھ الجھاؤ ضرور ہے۔

رات کو شانی تو کھانا کھاتے ہی کمرے میں جا گھسی۔ فہد' عاشر' عامر لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہے تھے جہاں ٹینس کا فائنل دکھایا جارہا تھا۔ ثوبیہ وہیں جا بیٹھی۔ فہد اور عاشر میچ دیکھنے کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتے رہے۔ دونوں کے مزاج ایک جیسے تھے۔ اس لیے خوب دوستی بھی ہو گئی۔

طاہر ماموں نے ثوبیہ کو آواز دی۔ وہ کھانے کے کمرے میں میز پر اپنا لیپ ٹاپ کھولے بیٹھے تھے۔ ثوبیہ کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھو بیٹا! تمہارے چچا تم سے ملنے آئے تھے۔ میں تو حیران تھا۔ اتنے عرصے بعد..... کوئی یعنی کسی نے اتنی زحمت کی یعنی کہ....."

طاہر ماموں کی زبان بھی لڑکھڑا رہی تھی۔

"بہرحال ان کا بیٹا بھی ساتھ آیا تھا۔ اس کی بیوی ایک بچہ چھوڑ کر مرگئی ہے۔ تم نے پوچھا ہی نہیں۔ افسوس کرلیتیں۔"

"میں نے ضرورت نہیں سمجھی۔" وہ چڑ گئی۔

"خیر کل آئیں گے تو افسوس کرلینا۔ میں نے بتادیا کہ تم کو اس سانحے کی خبر نہیں۔" وہ اس کے سخت لہجے کو ٹال گئے۔

"کل کیوں آئیں گے؟" وہ چڑچڑے پن سے بولی۔

"کیونکہ ایسا ہے کہ..... اس کا چھوٹا سا بچہ ہے۔ اس کے لیے..... تمہارا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ اس کا جواب لینے۔"

ثوبیہ غصے سے کانپنے لگی۔ "آپ نے خود ہی جواب دے دیا ہوتا۔" وہ لڑکھڑاتی آواز میں بول رہی تھی۔ "میرا ان لوگوں سے واسطہ ہی کیا ہے۔"

"ہاں جواب دے دیا ہے مگر ان کا اصرار کہ تم سے بھی پوچھ لیا جائے۔ انہوں نے بیٹے کی بے چارگی' بچے کی ممتا سے محرومی کے ایسے راگ الاپے کہ میں چپ ہو گیا۔ کل آئیں گے۔ تم کو اختیار ہے۔ جو چاہو جواب دے دینا۔"

"ماموں! میری طرف سے آپ ہی جواب دے دیں۔ آپ ہی میرے ماں باپ ہیں۔ مجھے ان لوگوں سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اور ہاں! ان کی بیوی زندہ سلامت ہے۔ ان لوگوں کی زیادتیوں سے تنگ آکر چلی گئی۔ بچہ انہوں نے چھین لیا کہ ہم خود پال لیں گے۔ میری ماں نے بھی..... وہ بھی وہاں سے چلی گئی

ہوتیں۔ زندہ تو رہتیں۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔ آپ کے پاس آتی ہی۔۔۔۔"

کہہ کر اٹھ کر چلی گئی۔ طاہر میاں گم صم اس کے الفاظ میں کھوئے رہے۔ یہ کیا کہہ گئی۔۔۔۔ ان کا دل دکھ کی انتہائی گہرائی میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔ لہجے کا ملال، الفاظ کی سچائی۔ وہ کس کرب سے گزری ہے؟ اس کی ماں۔۔۔۔ وہ حسین خوش مزاج لڑکی جس کا حسن شادی کے بعد ماند پڑ گیا۔ اس کی ہنسی کھو گئی۔ خوش مزاجی انتہائی سنجیدگی میں بدل گئی۔ انہیں وہ بہت پسند تھی۔ مگر ادھر وہ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے، یہاں اس کی شادی کر دی گئی۔

بعد میں سننے میں آیا۔ سسرال والے انتہائی جاہل، فرسودہ خیالات کے ہیں۔ شوہر بھی شکی مزاج ہے۔ وہ جب بھی آئی، ہر بار پہلے سے زیادہ نحیف و ناتواں مگر خاموش نہ شکوہ نہ شکایت اور پھر۔۔۔۔ وہ چپ چاپ دوسری دنیا سدھار گئی۔ جو لوگ جنازے میں شرکت کے لیے گئے۔ سب نے شکوہ کیا۔ اس کے شوہر نے کسی سسرال والے سے بات کی نہ ڈھنگ سے ملا۔ بچی کملائی کملائی ایک کونے میں پڑی رہتی۔ کسی نے کھانا سامنے رکھ دیا تو کھا لیا۔ ورنہ بڑی بڑی آنکھوں سے ہر کسی کو دیکھتی رہتی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح۔ باپ نے تو بچی کا نام تک نہ لیا۔

اب اگر ثوبیہ چچا سے بے زاری کا اظہار کر رہی ہے تو وجہ صاف ظاہر ہے۔ یوں بھی کسی رشتے دار نے اس کی خبر ہی نہیں لی۔ برسوں کے بعد چچا آئے بھی تو اپنا مطلب تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن وہ آئے۔ ثوبیہ کو بلایا گیا۔ وہ اندر گئی تو طاہر ماموں صوفے پر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ خالہ دادی گود میں ہاتھ دھرے انگلیاں مسل رہی تھیں۔ گویا کوئی بات ہو چکی ہے۔

"جی۔" اس نے اندر آ کر خشک لہجے میں سوال کیا۔ سلام کی ضرورت نہ سمجھی۔ چچا اٹھ کر اس کے پاس آئے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ (کاش یہ ہاتھ حسن کے انتقال پر رکھا ہوتا۔)

"بیٹی ثوبیہ! میں تمہارا تایا تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔ کل میں نے طاہر میاں کو بھی کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ وہ تم کو بتا دیں گے۔ اب چلیں؟"

ثوبیہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے جھٹکے سے ہٹایا۔

"میں کیوں کہیں جاؤں۔ اب یہ گھر ہی میرا گھر ہے۔ اتنے سالوں تک میں کسی کو یاد نہ آئی۔ تو اب کیوں؟"

"ہاں بے شک یہ ہماری کوتاہی تھی مگر۔۔۔۔ اب ہم سب چاہتے ہیں کہ تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ تم چھوٹی تھیں تو طاہر میاں تمہیں لے آئے تھے۔ ہم نے بھی سوچا۔ چلو ٹھیک ہے۔ کچھ دن ماموں کے پاس سہی۔ مگر اب تم بڑی ہو گئی ہو۔ تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ مجھے حق ہے کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔" بہت نرمی سے بول رہے تھے۔

"حق؟" وہ زور سے چلائی۔ "کون سا حق؟ جب میری ماں مری تو آپ کا حق کہاں تھا۔ میں یتیم ہوئی تو کسی نے سر پر ہاتھ رکھنا گوارا نہ کیا۔ اس وقت کسی کا حق نہ تھا۔ میں ابا کی بیگم کی مار پیٹ سے زخمی ہو کر سب سے چھپ کر آپ کو فون کرتی تو آپ فون بند کر دیتے۔۔۔۔ مجھے کہیں نہیں جانا سن لیں!"

"میں تمہیں زبردستی لے جا سکتا ہوں۔ قانون کا سہارا لوں گا۔ کچہریوں میں گھسیٹوں گا تمہیں۔" اب تحمل برداشت جواب دے چکی تھی۔

"قانون نے اجازت دی ہے کہ یتیم بچوں کو بے سہارا چھوڑ دیا جائے اور بعد میں اپنا حق جتا کر اس کو گھر کی لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ کس قانون نے چچا تایا کو حق دیا ہے اور کیا یہ بھی قانون کا کوئی حکم ہے کہ ایک نیک، شریف، پاک دامن اور صابر عورت پر تہمتیں لگا کر اسے شوہر سے پٹوایا جائے۔ شوہر کی نظر سے گرا دیا جائے۔ اتنی بھی چھوٹی نہیں تھی میں چچا صاحب سب دیکھا ہے۔ سنا ہے۔ میرے باپ کو ورغلانے میں آپ پیش پیش تھے۔ آپ نے میری ماں کو وقت

[illegible]

بھونچکے کھڑے اسے گھور رہے تھے۔ طاہر چچا میاں گھبرا کر کھڑے ہوئے۔

"بیٹی ثوبیہ!" ان کی آواز واضح طور پر بھرائی ہوئی تھی۔ "یہ۔۔۔۔ تمہارے چچا اپنے بیٹے ضیا کے لیے تمہارا رشتہ لے کر آئے ہیں۔ اس کی بیوی فوت ہو گئی ہے۔ بچہ بہت چھوٹا ہے اور۔۔۔۔"

"بیوی فوت نہیں ہوئی۔ ان کی سختیوں سے تنگ آ کر بھاگ گئی ہے۔ اس نکھٹو، شرابی، جواری، نشئی سے میرا رشتہ لاتے ہوئے سوچا ہو گا۔ میں بھی اپنی ماں کی طرح کمزور، اطاعت گزار، دبنے والی صابر ہوں گی۔ میں اسی ماں کی بیٹی ہوں مگر۔۔۔۔ نہ کمزور ہوں نہ ماں باپ کی عزت کی خاطر آپ لوگوں کے ظلم سہنے والی۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں۔ مجھے اتنا بے خبر نہ سمجھیں۔ جائیے! مجھے قانون سے نہ ڈرائیں۔ میں بھی لاء پڑھ رہی ہوں۔ چند سال بعد وکیل بن کر آپ کو کچہریوں کے چکر لگواؤں گی اپنے حقوق کے لیے۔ میرے باپ کا گھر جس کی میں اکلوتی وارث ہوں اور جس گھر پر آپ نے قبضہ کر لیا ہے۔ میرے باپ کی بیوہ کو گھر سے نکالتے ہوئے ذرا بھی خوف خدا نہ تھا آپ کو اور ماموں، افسوس۔۔۔۔ آپ تو میرے ماں باپ کی جگہ ہیں۔ کل ہی اپنا حق استعمال کر کے انہیں کیوں نہ گھر سے نکل جانے کا کہا۔۔۔۔" کہہ کر روتی ہوئی تیزی سے باہر نکلی اور کمرے میں غڑاپ۔

طاہر میاں کی طاقت سلب ہو رہی تھی۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ ان لوگوں کو گیٹ تک پہنچاتے۔ سب کچھ تو کہہ ڈالا تھا۔ کوئی لگی لپٹی نہ چھوڑی۔ وہ رو رہی تھی اور شانزے اس کے پاس بیٹھی اس پر ترس کھا رہی تھی۔ خالہ دادی بھی تسلی دے رہی تھیں مگر نہ جانے کہاں زخم لگا تھا کہ اسے صبر نہیں تھا۔ ایک ہی فقرہ۔

"ماموں نے کیوں مجھے جواب دینے کے لیے بلایا۔ کل ہی کیوں نہ انکار کر دیا۔"

"انکار کیا تھا مگر وہ اپنا خون، اپنا خاندان، اپنا حق ہی جتاتے رہے۔ اسی لیے طاہر میاں نے تمہیں بلایا کہ تم

"بس مجھے پتا چل گیا ہے۔ میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ پوری دنیا میں۔ ہائے! میں کس کو اپنا کہوں۔"

اب اس کا لہجہ بدل گیا۔ بے بسی اور لاچاری آواز میں سمو کر فریاد کر رہی تھی۔ خالہ دادی نے اسے لپٹا لیا۔

"ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ تمہاری ماں ہماری تھی اور تم اس کی ایک ہی نشانی ہو۔ جو کچھ تمہاری بہتری کے لیے ہو سکے گا۔ وہ کریں گے۔ تم نے یہ سوچا بھی کیوں کہ طاہر نے انہیں جواب نہیں دیا ہو گا۔"

"تو پھر کل ہی کیوں نہ انکار کیا۔ آج کیوں مجھے سامنے بلا کر۔۔۔۔ مجبور کیا۔ میرا کوئی اپنا ہوتا۔ فوراً" انکار کر کے بات ختم کر دیتا۔ وہ شادی شدہ بچے کا باپ، ٹٹ پونجیا میرے لیے رہ گیا تھا۔ اگر۔۔۔۔ شانی کے لیے ایسا رشتہ آتا۔ ماموں خود جواب دیتے یا شانی سے پوچھتے کہ بیٹا یہ کالیا نکھٹو تمہیں قبول ہے؟"

آنسو اب خشک تھے مگر واویلا جاری تھا اور کسی کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

خالہ دادی کا یہ کہنا کہ لڑکیوں کے تو نہ جانے کیسے کیسے رشتے آتے ہیں۔ اللہ نے جہاں نصیب میں لکھا۔ شادی وہیں ہوتی ہے۔ یہاں رشتہ ہونا ناممکن تھا۔ کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔ اور بھی دل جلا گیا اور وہ ان سے ناراض ہو گئی۔

"واہ جی! شانی کے لیے فہد جیسا خوب صورت، تعلیم یافتہ، خوش مزاج۔۔۔۔ میرے لیے وہ کالیا، ایک بچے کا باپ ظالم منحوس۔"

کئی دن جھنجلاتی بڑبڑاتی رہی۔

"میں یتیم ہوں۔ غریب ہوں۔ اس لیے کسی کو اس رشتے سے انکار نہ تھا۔ شانی ماں باپ بھائیوں کی لاڈلی۔ بس یہی فرق ہے مجھ میں اور اس میں۔"

سب سے ناراض تھی۔ شانزے سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ دادی سے کلام کرنا۔ ماں کی کام میں مدد کرنا۔ سب ماضی کی کہانی تھی۔ سعیہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ شکر ہے کہ چچا نے پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔

ثوبیہ کی دھمکیوں سے ڈر گئے یا اس کی وسیع معلومات پر خوف زدہ تھے۔

☼ ☼ ☼

فہد اور عاشر لان میں بیٹھے تھے۔ ثوبیہ لان میں آ گئی۔ عاشر نے کہا۔

"ایک جگ پانی دو گلاس دو کپ چائے کا سوال ہے بابا! ذرا فٹافٹ... اپنے لیے بھی بنالینا جی چاہے تو۔"

ثوبیہ اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد پانی کا جگ دو گلاس دو پیالی چائے ٹرے میں لے کر آگئی۔

"واہ واہ! شاباش لڑکی واہ واہ! بھئی بہن ہو تو ایسی۔ ویسے ثوبی! تم کئی دن سے بہت کھوئی کھوئی چپ چپ ہو۔"

عاشر نے راکھ کریدی تھی۔ جانتا نہ تھا اس میں کتنی چنگاریاں ہوں گی جو ہاتھ جلا سکتی ہیں۔ ثوبیہ کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ وہ شروع ہو گئی۔ اول سے آخر تک باپ کی بدسلوکی۔ چچاؤں کا ابا کو بھڑکانا۔ ابا کے بعد سب کی بے نیازی۔ پھر... اب اپنے بیٹے کا رشتہ دینا ایک بیوی والا۔

"اچھا خیر... اب تو وہ بات ختم ہو گئی۔" عاشر نے لاپروائی ظاہر کی۔

"پہلے دن ہی کیوں ختم نہیں ہوئی۔ ماموں کو وہ میرے لیے مناسب لگا ہو گا۔ میرے پاس ہے بھی کیا۔ ماں باپ بہن بھائی - کوئی نہیں اور شانزے ... خاندان کی اکلوتی لاڈلی۔ فرق ہے مجھ میں اس میں۔ ماموں نے سوچا۔ اس یتیم بے سہارا کے لیے ... یہ رشتہ مناسب ہے۔"

"ارے ارے فضول لڑکی! ابا فرق کر سکتے ہیں بھلا؟ بھئی وہ تمہارے چچا کو فوراً" ہی انکار نہیں کر سکتے تھے۔ ٹال گئے تھے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ فرق تو ہے۔ میں ادنیٰ شانی اعلا۔ شانزے کی شادی اچھی جگہ ہو سکتی ہے۔ میری کیوں نہیں؟ بدشکل ہوں بدہیت ہوں۔ اصل میں بات تو یہی ہے۔ میں یتیم غریب بے سہارا ہوں۔"

"ارے بھئی! تمہیں شادی کی بہت جلدی ہے۔ ورنہ میں حاضر ہوں۔ مگر مجھے انجینئرنگ کرنے میں کئی سال باقی ہیں۔ انتظار کر لو گی؟"

ثوبیہ غصے میں پیر پٹختی اندر کو لپکی۔ فہد اور عاشر کے قہقہوں نے اس کا پیچھا کیا۔ آنسو بہاتی کمرے میں گھسی۔ خالہ دادی شانزے کے دوپٹے پر لیس لگا رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا اب؟" خالہ دادی اچنبھے سے اسے دیکھنے لگیں۔

"سب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ ہنستے ہیں مجھ پر۔" وہ چیخی۔ کئی دن بعد اس نے ان کے سامنے کوئی بات کی تھی۔ شانزے نے پوچھ لیا۔ اس نے بتا دیا۔ عاشر اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ میں مفلس نادار ہوں۔ اس لیے کسی کو مجھ سے ہمدردی ہے نہ محبت۔ ایسے ایسے رشتے آئیں گے میرے لیے۔

"تم نے اس واقعے کو ذہن پر سوار کر لیا ہے۔ ورنہ زندگی میں کتنے ہی واقعات حادثات پیش آتے ہیں۔ تم نے خود کو مذاق بنا لیا ہے تو ظاہر ہے دوسرے مذاق تو اڑائیں گے۔" شانزے نے بزرگانہ انداز میں سمجھایا۔

"تمہارے ساتھ ایسا ہوا نہیں۔ اس لیے کہہ رہی ہو۔ جس پر گزرتی ہے وہ..."

"ہاں جس پر گزرتی ہے وہ جانتا ہے۔ یہ فقرہ خالہ نانی کا ہے۔" وہ منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ خالہ دادی چپ چاپ بیٹھی لیس لگاتی رہیں۔ اتنا شوق ہے انہیں نصیحتوں کا۔ آج کچھ بولیں نہیں۔ تسلی ہی دے دیتیں۔

☼ ☼ ☼

اس دن عجب واقعہ ہوا۔ پڑوسن آپا رضیہ ایک پیالہ لیے آئیں۔ جھینپی جھینپی ... مسکراہٹ لیے خالہ اماں کی طرف بڑھیں۔

"خالہ اماں! میں نے بریانی بنائی تھی تو آپ کے لیے بھی لے آئی۔ میرے میاں دو سال بعد کویت سے آئے ہیں۔ ان کی فرمائش پر۔"

خالہ اماں نے انہیں ان کے شوہر کے آنے پر مبارک باد دی۔

"میں نے سوچا بریانی پر سب سے زیادہ حق آپ کا ہے۔ آپ اس مرغے کی آواز سے چڑتی تھیں۔ پھر بھی اتنا عرصہ برداشت کر لیا۔ میرے میاں تو چار دن میں عاجز آ گئے۔ پکڑ کر ذبح کر دیا۔"

خالہ اماں کے ہاتھ سے پیالا گرتے گرتے بچا۔ انہوں نے فق چہرے کے ساتھ پڑوسن کو دیکھا۔ پیالا سنبھال کر میز پر رکھا۔

"ہیں کیا مرغا ذبح کر دیا؟ غضب ہے پالتو مرغا۔ اتنا چوزہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے اتنا بڑا ہو گیا۔ اور تم نے ہئے ہئے! دل نہ دکھا تمہارا..." خالہ اماں کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

آپا رضیہ بھی اداس ہو گئیں۔ "کیا کرتی... دو سال بعد میاں آتے ہیں۔ ان کی خاطر..." پھر ٹالنے کو بولیں۔ "آپ کھا کر تو دیکھیں۔ بہت لذیذ ہے۔"

ان کے گھر بھی کھانا لگ رہا تھا۔ جلدی سے چلی گئیں۔ وہ جو گھنٹوں مرغے کی روحانیت، جذباتی کیفیت کے قصے سناتی تھیں۔ پانچ منٹ نہ ٹھہر سکیں۔

ثوبیہ اور شانزے میز پر برتن لگا رہی تھیں۔ تعجب سے خالہ اماں کو دیکھنے لگیں، جو باقاعدہ آنسو بہا رہی تھیں۔ مرغے کی ناگہانی موت پر۔ سب نے بریانی کھائی۔ انہوں نے چکھی تک نہیں۔

"نہیں بوا! میں پالتو جانور کا گوشت نہیں کھا سکتی۔"

"جانور نہیں، پرندہ ہے خالہ دادی! پروالا۔"

"اتنا عرصہ پالا پوسا۔ اس کے لاڈ اٹھائے۔ موا چیختا ہنکارتا سب کے کانوں میں سوراخ کرتا رہا۔ اس کے کمالات کے قصے سناتی رہیں اور اب لے کے ایندھن کے سپرد کر دیا۔ اس کے سارے گن آگ میں ڈال لیے۔"

خالہ اماں سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ سمیعہ نے کہا۔

"ارے چھوڑیں خالہ اماں! ان کی چیز تھی۔ انہوں نے میاں کی خاطر پکا لیا۔ آپ یہ کڑھی کھائیں۔"

"کسی کو دے دیتیں۔ اپنی نوکرانی کو دے ڈالتیں۔ وہ دعا دیتی۔ کمبخت زندہ تو رہتا۔" خالہ اماں افسردگی سے اٹھ کر چلی گئیں۔

سب حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ جس کی آواز سے وہ بے زار تھیں۔ اس کی زندگی درکار تھی واہ! خالہ دادی بھی کیا چیز ہیں۔ بہت غم تھا انہیں۔ فجر کے وقت وضو کے لیے جا رہی تھیں اور بول رہی تھیں۔

"اچھا بھلا۔ پلا پلایا تندرست۔ لو جی! پکا کر کھا لیا۔" نماز کے بعد پھر ان کا مرثیہ شروع ہوا۔

"وہ بھلا کس دل سے کھایا ہو گا۔ ہاہ! کلیجہ منہ کو آ رہا ہو گا۔ تو بہ موا تھا بھی تو اتنا خوب صورت۔ ہئے ہئے! کیا آواز تھی۔ جیسے مردوں کو جگانے کا کام کرتا ہے۔ جوان جہان۔ ہاہا۔" ثوبیہ سنتی رہی حیران ہوتی رہی۔

☼ ☼ ☼
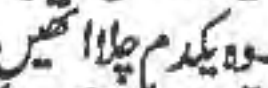
ایک دن ثوبیہ کی پھپھو کا فون آگیا۔ پہچانی بھی نہیں پھر سمیعہ نے بتایا۔ "تمہاری پھپھو ہیں" وہ ریسیور ثوبیہ کو دے کر وہیں کھڑی رہیں۔ پھپھو اسے سخت سست سناتی رہیں پھر بولیں۔

"ضیا تو شادی شدہ تھا بچے والا۔ میری دعا ہے تجھے ایسا ہی بر نصیب ہو۔ ارے! ہم تو تجھ پر احسان کرنا چاہتے تھے۔"

وہ تو نہ جانے کیا کچھ کہتی رہیں۔ ثوبیہ نے ریسیور سمیعہ کو دے دیا۔ وہ یکدم چلا اٹھیں۔

"شرم نہیں آئی آپ کو ایک بچی سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔ اپنی عمر کا لحاظ ہی کر لیتیں۔ دعا نہ پیار۔ اتنے سالوں میں تو خبر لی نہیں۔ اب حق جتانے لگے۔ یہ کیا رشتہ تعلق ہے۔ عمر کا خیال نہ تعلیم کا۔ اس جاہل عیاش، نکمے کے لیے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کا رشتہ مانگتے ہوئے آپ کو شرم نہ آئی؟ ہمت کیسے

ہوئی میرے گھر پر آنے کی ؟ بلے آئیں پولیس۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے۔ اپنی مرضی کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ قانونا" ہم اس کے وارث ہیں۔ ہم خود اس کی شادی کا فیصلہ کریں گے۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ سائرہ نہیں ہے ' جسے آپ لوگوں نے قبر میں پہنچا دیا۔ اچھا! سالہا سال کے بعد آپ کو بھتیجی یاد آئی۔ ہم آپ سے کوئی مدد نہیں لیں گے۔ فکر نہ کریں شادی کا خرچا بھی اٹھالیں گے۔ آپ کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

فون بند کر کے ثوبیہ سے کہا۔

"ڈرو نہیں! کچھ نہیں کر سکتے وہ۔"

"کہا اور آگے بڑھ گئیں۔ واہ کیا بے نیازی ہے۔ مگر کس دلیری سے پھپھو کی بدزبانی کا مقابلہ کیا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ کاش ماموں نے بھی اسی طرح ٹکا سا جواب پچا کو دے دیا ہوتا۔ واہ رے میرے رشتے دار۔ ایک اپنے بدکردار بیٹے کو لے آئے مجھ پر احسان کرنے دوسری نے بددعاؤں سے نوازا۔ اب حقوق کی دھونس بھی خوب ہے۔

سمیعہ نے خالہ دادی کو پھپھو کے فون کا بتایا۔ وہ کانپ گئیں۔ گھبرا کر بولیں۔

"ائے ہے! یہ کیا طریقہ ہے۔ ثوبی بیٹا! کوئی اثر نہ لینا۔ یہ بس کھسیانی بلی کھمبا نوچے والی مثال ہے۔ الٰہی برا چاہنے والوں کا منہ کالا۔" انہوں نے اسے لپٹا لیا۔

ثوبیہ پر واقعی پھپھو کی بددعاؤں کا اثر تھا۔ وہ خالہ دادی سے لپٹ گئی۔ آج ان کے قرب میں ماتا کی حرارت ' شفقت کی نرمی کا سوتا پھوٹتا محسوس ہوا۔ یوں تو وہ ہمیشہ اسے تسلی دیا کرتی تھیں۔ لپٹاتی تھیں ' ان میں ماتا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ تب ہی تو سب ان سے متاثر تھے۔ ہر بار جب بھی وہ اسے چھوتیں۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتی تھیں۔ شفقت اور محبت کا اظہار ہوتا تھا مگر آج کچھ وہ بھی ہراساں تھی اور پھپھو کی آواز اور الفاظ نے اسے حد درجہ حساس بنا دیا تھا۔ اسی لیے وہ خالہ دادی کے قرب میں پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ جو ابھی تک دعاؤں سے اس کا خالی دامن بھر رہی تھیں۔

اور وہ سوچ رہی تھی۔ بے چاری خالہ دادی۔ بے اولاد ' بے سہارا اور لاچار۔ سب کے لیے دعا گو اور خو خالی ہاتھ۔ ہمیشہ اللہ سے فریاد انسان سے کوئی شکوہ نہیں۔ نہ جانے وہ اتنی مطمئن اور پر امید کیوں رہتی ہیں۔ کیا اسے صبر کہتے ہیں ؟ یا ان میں برداشت زیادہ ہے یا پھر ہر حال میں راضی برضا۔ ان کی نرم دلی گرمئی احساس کا اندازہ ایک مرغے کے معاملے میں ہو چکا تھا انسانوں کے لیے تو ان کے دل میں نہ جانے کتنی محبت ہوگی۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک دن عامر نے چپکے سے آکر بتایا۔

"ثوبیہ باجی! پتا ہے ابا نے آپ کے لیے رشتہ تلاش کر لیا ہے۔ ان کے آفس میں ایک لڑکا ہے۔ اس کی تعریف کر رہے تھے۔"

"کیا؟ کیا کہہ رہے تھے؟"

"امی کو بتا رہے تھے کہ بہت قابل ' خاندانی لڑکا ہے۔ بس ایک اس کی بہن۔ ایک باپ ہے۔ ماں فوت ہو چکی ہے بے چارے کی۔ ثوبیہ کی تعلیم ختم ہو جائے تو سلسلہ چلائیں گے۔"

عامر آنکھیں مٹکاتا چلا گیا۔ ثوبیہ چڑ گئی۔ "ہوگا کوئی کلرک ہونہہ! خاندانی لڑکا ' بے ماں کا ' لو جی! یہ رشتہ تلاش کیا ہے میرے لیے۔ باپ کا کیا ہے ؟ بہو کے سارے شوق تو ساس پورے کرتی ہے۔ رسمیں کرتی ہے۔ تعریفیں کرتی ہے۔ زیور کپڑا پہنا کر خوش ہوتی ہے۔ خالہ امی نے شانزے کے کتنے چاؤ چونچلے کیے تھے۔ حالانکہ ابھی صرف نکاح ہوا ہے۔ مگر روز کچھ نہ کچھ اس کے لیے لے آتی تھیں۔ کبھی زیور پہنا رہی ہیں ' کبھی کپڑے پہنا کر تصویریں کھنچوا رہی ہیں۔ نئی نئی چیزیں لا کر اسے پہناتی تھیں۔ ہونہہ! بغیر ساس کے شادی کا فائدہ ہی کیا ہے ؟ نہ کوئی ناز اٹھانے والا نہ خاطر مدارات کرنے والا اور نہ ہی دعائیں دینے اور خوش ہونے والا۔ ماموں تو اپنے دفتر میں ہی دیکھیں گے۔ یہ تو عورتوں کا کام ہوتا ہے۔ اگر مامی چاہیں اپنے ملنے والوں سے ..... اُفوہ بھئی! میں خود ہی کیوں نہ تلاش کر لوں ہائے توبہ میں کہاں۔"

صبح بہت سویرے اٹھی۔ نماز پڑھ کر باہر لان میں آ گئی۔ لان میں چار پانچ چکر لگائے۔ ملگجا اجالا رفتہ رفتہ تیز روشنی میں بدل گیا۔ سورج نے افق سے سر ابھارا۔ پورا آسمان کرنوں میں نہا گیا۔ گیٹ کھول کر فہد اندر آ رہا تھا۔ جوگنگ کے لیے جاتا تھا۔ سفید ٹی شرٹ سفید نیکر پہنے ' ریکٹ گھماتا۔ مستانہ چال چلتا ' ناک کی سیدھ میں اندر چلا گیا۔

وہ سامنے کھڑی تھی مگر نظر ڈالنے کی زحمت نہ کی۔ دم سادھے کھڑی رہ گئی۔ کتنا خوب صورت صحت مند ..... سورج کی کرنوں سے اس کے بازوؤں کا رواں سونے کے بنے تاروں کی طرح چمکتا لگ رہا تھا۔ وہ ست قدم اٹھاتی اندر آئی ..... ساتھ ہی فہد کی شبیہہ بھی اس کا پیچھا کرتی اندر آ گئی۔

"کیا میرے لیے ..... ماموں ایسا داماد ڈھونڈ سکیں گے ' جو فہد کی برابری کرے ' مشکل ہے میرے پاس کیا ہے۔ نہ بہن بھائی۔ ماں باپ ' خاندان جہیز کچھ بھی تو نہیں۔ شانزے کی شکل صورت کی طرح اس کا نصیب بھی اللہ میاں نے ایسا ہی چمکتا دمکتا بنایا ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ برابری کیا کروں گی۔"

مایوسی نے ایسا حملہ بولا کہ یونیورسٹی کی چھٹی کر لی۔ شانزے ' عاشر کے ساتھ گئی۔

شانزے فہد کے ساتھ کبھی تنہا نہیں جاتی تھی۔ فہد بھی اس احتیاط کو پسند کرتا تھا۔ گو کہ نکاح ہو چکا تھا مگر امی نے اسے اکیلے جانے کی اجازت نہ دی تھی۔

اگلے دن شانزے کو فلو نے جکڑ لیا۔ اس نے چھٹی کی۔ فہد گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا کہ ثوبیہ اگلا گیٹ کھول کر اندر آ بیٹھی۔ فہد نے قدرے معترض نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مگر کچھ کہا نہیں۔ کچھ آگے جا کر اس نے گلا صاف کر کے کہا۔

"فہد بھائی! ایک بات کہوں۔"

"کہو۔" مختصر بات کرنا اس کی عادت تھی۔

"آ ..... پ ..... مجھ سے شادی کر سکتے ہیں ؟" بے اختیاری الفاظ میں تھی۔ گاڑی نے جھٹکا کھایا۔ فہد نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ جیسے کسی پاگل کو دیکھتے ہیں۔

"پاگل ہو؟" زبان نے آنکھوں کی ترجمانی کی۔

"آپ ' آپ مجھے پسند ہیں اور حرج کیا ہے۔ ایک آدمی چار شادیاں کر سکتا ہے۔"

"اپنی دوست سے پوچھ لیا ہے ؟ اس نے کیا کہا؟"

"میں اس کے ساتھ گزارا کر لوں گی۔ بہت اچھی ہے وہ۔" مطلع کیا۔

"اچھی تو ہے مگر وہ گزارا کر لے گی۔ اس میں مجھے شک ہے۔" فہد مسکرا رہا تھا۔

"پہلے آپ تو راضی ہوں۔ میں اسے راضی کر لوں گی۔" ہمت بڑھ گئی تھی۔

"پہلے تم اسے راضی کر لو۔" کہہ کر ہنس دیا۔ مضحکہ اڑانے والی ہنسی۔ مگر وہ سمجھ نہ سکی۔

"آپ اقرار تو کریں۔ سچ! میں آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔ گھر کا سارا کام بھی کر لوں گی۔ کچھ مانگوں گی بھی نہیں۔ بس اپنے نام کے ساتھ میرا نام لگا دیں۔ مجھے اپنا نصیب بنا لیں ..... مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ ہم دونوں یعنی میں اور شانی ایک جیسا نصیب ہو بس۔"

"میری وہی شرط ہے۔ تم شانی کو راضی کر لو۔" وہ اب سنجیدہ تھا۔

ثوبیہ کا دل پھول کی طرح کھل گیا۔ اس نے غور نہیں کیا۔ وہ کس مشکل سے مسکراہٹ روک رہا ہے۔ گاڑی رک گئی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اتری۔ اس کے جاتے ہی فہد نے قہقہہ لگایا اور موبائل نکال کر شانزے کو فون کرنے لگا گھر پر۔

☼ ☼ ☼

ثوبیہ گھر آئی اور منہ ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر آئی۔ شانزے وہاں بیٹھی تھی۔ دونوں کھانا کھانے لگیں۔ اچانک شانزے نے کہا۔

"تم نے فہد سے کیا کہا ہے ؟"

لقمہ ہاتھ میں لیے وہ شانزے کو دیکھنے لگی۔ "مرد کتنے پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ وہ راضی ہے۔"

"کھانا کھاؤ۔" شانزے نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ کھانے لگی اور کیوں نہ کھاتی خوش جو تھی۔

"اب بتاؤ! اس بات سے تمہارا مقصد کیا تھا؟"

"جو ہونا چاہیے۔" وہ بے خوفی سے بولی۔

"تمہاری برابری۔ میں تم سے کس معاملے میں کم ہوں؟" لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"تمہارا مطلب یہ ہے کہ اسی طرح برابری ثابت ہو سکتی ہے۔ محترمہ! ہر انسان اپنا نصیب آسمان سے لکھوا کر لاتا ہے۔ دو سگی جڑواں بہنوں کے نصیب بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ مشیت ایزدی ہے۔ اگر کسی کی قسمت میں خوشیاں لکھی ہیں تو وہ اسے ضرور ملیں گی۔ تم نے اپنی قسمت میرے ساتھ جوڑنے کے لیے برابری کا بہانہ کیا ہے۔ یاد رکھو! اگر ایک مرد کی تین یا چار بیویاں ہوں۔ تب بھی ان کی قسمت جدا جدا ہو گی۔ کوئی خوش ہو گی۔ کوئی ناخوش۔ آیا سمجھ میں؟"

"تقریر بند کرو۔ بس مجھے بتا دو۔ کیا ایسا ہوا نہیں کبھی یا ہو نہیں سکتا؟"

"ہوا ہو گا۔ میرے ساتھ نہیں ہو گا۔" شانزے نے صاف جواب دیا۔

"فہد بھائی کو تو اعتراض نہیں ہے۔ انہوں نے کہا' میں تمہیں منا لوں۔"

"تو اور کیا کہتے؟ تم نے کہا۔ تم سب گھر کا کام کرو گی۔ ہم دونوں کی خدمت کرو گی۔ صلہ نہیں مانگو گی تو۔۔۔ یہ برابری ہے؟ ایک جیسے نصیب تو نہیں ہوئے۔"

"مجھے۔۔۔ تمہارا گھر چاہیے' تمہارے ساتھ۔"

"ٹھیک! میں تمہیں اپنے گھر میں میڈ رکھ لوں گی۔" کہہ کر شانی کھڑی ہو گئی۔

"مجھے تمہارا شوہر بھی چاہیے۔" ثوبیہ ہارنا نہیں چاہتی تھی مگر شکست کی آواز سن رہی تھی۔ آخری کوشش۔۔۔ کر لینی چاہیے۔

"میرے مرنے کے بعد مل سکتا ہے۔" وہ چڑ گئی تھی۔" مگر پھر بھی نہیں۔ وہ امریکا سے ایسی لڑکیوں سے خود کو بچا کر لائے ہیں۔ جو زبردستی مسلط ہونا چاہتی ہیں۔"

شانزے جا چکی تھی۔ ثوبیہ دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ ہتک کا احساس شدید تھا' وہ بمشکل اٹھی۔" شانی مجھے ایسی لڑکی سمجھتی ہے۔ زبردستی مسلط ہونے والی۔ میں اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتی ہوں۔ فہد ایسا ہے جو ہم دونوں کو محفوظ مستقبل دے سکتا ہے۔"

کمرے میں خالہ دادی موجود نہ تھیں۔ "وہ بستر پر گر گئی۔" خالہ دادی لگی ہوں گی ماموں مامی کی خوشامد میں۔ ان کا اور کام کیا ہے۔ اپنی سیٹ پکی کرنے کی ترکیبیں سب کو آتی ہیں۔" نیند آ گئی۔ سو کر اٹھی تو شام ہو رہی تھی۔ شام کی چائے بنانے کی ذمے داری اس کی تھی۔ گیلری میں عامر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ ہا میں یہ وقت تو اس کا لان میں کرکٹ کا تھا۔ آگے شانزے حیران پریشان نظر آئی۔ سراسیمہ سی ڈرائنگ روم کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ ثوبیہ کو دیکھا تو آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام کر قریب گھسیٹ لائی۔ دوپہر کی جنگ شاید بھول گئی تھی۔

"کیا ہو گیا؟"

"ثوبیہ! وہ خالہ دادی۔۔۔" شانزے کی آواز لڑکھڑائی۔

"کیا ہو گیا خالہ دادی کو۔" تصدیق لازمی تھی۔

"ان۔۔۔ ان کے بیٹے۔" بولا نہیں جا رہا تھا۔

"کس کے بیٹے۔۔۔؟" ثوبیہ بھی حیران ہوئی شانزے نے اس کو ڈرائنگ روم کی طرف متوجہ کیا۔ ثوبیہ نے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ عجیب الجھا ہوا سین تھا۔

خالہ دادی زندہ سلامت صوفے پر بیٹھی تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ اس لیے کہ ان کے قدموں میں بیٹھا نوجوان پرشوق اور ملتجی نگاہوں سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ سامنے کے صوفے پر دو مرد بیٹھے خالہ دادی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دو خواتین بھی تھیں۔ ماموں مامی ان لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔

"یہ تینوں خالہ دادی کے بیٹے ہیں۔ اور یہ دونوں بہوئیں۔" بے یقینی اور حیرانی۔

"ابا نے خود بتایا ہے۔ کئی سال سے امریکا میں

تھے۔"

ثوبیہ کو چکر آگیا۔ بیٹے' بہوئیں بے اولادی کے طعنے۔ بے چارگی' بے سہارا' اکیلی۔۔۔ یہ کیا عجوبہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے خود کو یقین دلا رہی تھیں۔ سچ کو جھٹلایا نہیں جاتا۔ خالہ دادی نے آج تک کبھی اشارہ تک نہیں کیا کہ وہ اکیلی ہیں۔ نہ بے اولاد۔ کیوں لوگوں کی باتیں' استہزائیہ برداشت کرتی رہیں۔ خاموشی کی چادر اوڑھے پراسرار بنی رہیں۔ کیوں کیا راز ہے۔ دوسروں کو نصیحتیں کرنے والی۔ اپنی اولاد کو راہ راست پر کیوں نہ لا سکیں۔ انہیں کس طرح کی تربیت دی ہے کہ وہ۔۔۔۔

وہ دونوں کمرے میں آگئیں۔ ثوبیہ اور دادی خالہ کا مشترکہ کمرا جو ان کے رازوں کا امین ہے مگر۔۔۔۔ جب خالہ دادی چپ رہیں۔ تو کمرا تو بے جان دیواروں کے سہارے کھڑا تھا۔ کیا بولتا۔ پھر عامر بوکھلایا ہوا آیا۔

"وہ سب جا رہے ہیں۔ اور فہد بھائی نے بھی کہیں گھر لے لیا ہے۔ وہ کل یہاں سے چلے جائیں گے۔"

وہ باہر بھاگ گیا۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے۔۔۔۔ بیٹھی رہ گئیں۔ فہد کیوں جا رہا ہے یہ ان دونوں کے سوا شاید اور کسی کو خبر نہ ہو۔

خالہ دادی کمرے میں آئیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا' کمر جھکی ہوئی۔ نہ جانے وہ کیوں اداس لگیں۔ سکون اور اطمینان جو ان کے چہرے کی رونق تھا۔ آج وہ چہرہ بے رونق تھا۔

طاہر میاں اندر آئے تو دونوں نے یک زبان ہو کر سوال کیا۔ "پاپا! فہد کہاں جا رہے ہیں؟"

"ماموں! دادی خالہ کے بیٹے تھے تو وہ کبھی آئے کیوں نہیں۔"

"وہ یہاں نہیں تھے۔ کئی سال سے امریکا میں سیٹل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ بات نہیں بنی' واپس آگئے۔ فہد سے کل بات کروں گا۔" دونوں سوالوں کا جواب۔

سمیعہ نے چپکے سے بتایا کہ "خالہ دادی کی مرضی کے خلاف ان کو ناراض کر کے وہ دونوں بڑے اپنی بیویوں کے اصرار پر گھر فروخت کر کے امریکا چلے گئے تھے۔ وہاں جاتے ہی پیسہ کمانے کی دوڑ میں لگ گئے اخراجات زیادہ کمائی کم' مہنگائی اور وہاں کے ماحول میں فٹ نہ ہو سکے۔ جب ہر جگہ مایوسی کا سامنا ہوا تو واپس آگئے ہیں۔ پشیماں ہیں اور معافیاں مانگ رہے ہیں۔ چھوٹے کو بھی لے گئے تھے۔"

"کیسی اولاد ہے۔ برسوں ماں کو بھولے رہے۔ وہ تو کر سکتے تھے۔"

"کرتے تھے مگر خالہ اماں سنتی نہ تھیں۔"

"آپ کو معلوم تھا امی کہ۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ مگر خالہ اماں کی تاکید تھی کہ کسی پر ظاہر نہ ہو۔ انہیں اس میں اپنی بے عزتی محسوس ہوتی تھی دیکھ لو! خالہ اماں کی دعائیں' عبادت' ان کا صبر' برداشت کس طرح بیٹوں کو واپس لے آیا۔ وہ جو امریکا ترقی کے لیے گئے تھے۔"

"امی! خالہ دادی سب کے لیے دعا کرتی ہیں اپنے بیٹوں کے لیے نہیں کرتی تھیں کیا؟ کہ وہ لوگ وہاں ناکام رہے۔ یا خالہ نانی کی طرح دعاؤں سے خارج۔۔۔"

"اللہ کو ماں کا دل دکھانے کا عمل پسند نہیں۔ اس لیے واپسی کے انتظام کیے۔ دعائیں تو وہ غیروں کے لیے بھی کرتی تھیں۔ بیٹوں کے لیے تو رو رو کر دعائیں مانگتی تھیں۔ مگر اللہ نے ان کے صبر کا صلہ اسی طرح دینا تھا۔"

"مگر خالہ دادی خوش نہیں ہیں۔" یہ سب کا متفقہ خیال تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن خالہ دادی کی رخصتی تھی۔ بیٹوں نے ایک گھر کرائے پر لے لیا تھا۔

ثوبیہ یونیورسٹی نہیں گئی۔ وہ فہد کا سامنا کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔ شانزے یونیورسٹی سے آئی تو خالہ دادی کے دو بیٹے انہیں لینے آئے ہوئے تھے۔ دو بہوئیں ان سے چپکے بیٹھے تھے اور ثوبیہ بھی اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟" شانی حیرت زدہ تھی۔

"میں خالہ دادی کے ساتھ جا رہی ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"ہم سے ناراض ہو کر؟" شانی گھبرا گئی۔

"نہیں! مجھے خالہ دادی کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ میں۔۔۔ ان جیسی بننا چاہتی ہوں۔ اپنی خطاؤں اور بدتمیزیوں کا کفارہ دینا چاہتی ہوں۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ فہد بھائی سے بھی معافی مانگ لوں گی۔ بہت غلط سوچ تھی میری۔" ثوبیہ میں اچانک تبدیلی آئی تھی۔ شانزے کا منہ کھلا رہ گیا۔

"فہد کہہ رہے تھے' خالہ امی آنے والی ہیں رخصتی کے لیے۔" شانزے نے اطلاع دی۔ "وہ اسی لیے ایک گھر خرید رہے ہیں۔ تم آؤ گی میری رخصتی پر؟" شانزے نے ثوبیہ کو خوش کرنے کے لیے کہا۔

"ہاں اور ابھی تو یونیورسٹی میں ملاقات ہوا کرے گی۔ تم بھی آنا میری شادی پر۔ آؤ گی نا؟" ثوبیہ تو حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

"تم' تمہاری شادی؟"

"ہاں' خالہ دادی کے چھوٹے بیٹے سے۔"

"او نو! ہرگز نہیں وہ شادی شدہ۔ ایک گوری کو چھوڑ کر یہاں اس لیے آیا ہے۔"

"معلوم ہے۔ گوری خود ہی چلی گئی تھی۔ ایک بچہ بھی ہے۔ پال لوں گی۔ گورا چٹا سنہری بالوں والا پیارا پیارا ہے۔"

ثوبیہ نے حیرانی کی سنچری کا شاید عہد کیا تھا۔

"شانی! میں بہت کمزور ہوں۔۔۔ مجھے ایک مضبوط پشت پناہ چاہیے اور خالہ دادی سے بڑھ کر کون سہارا دے سکتا ہے پھر۔۔۔ چھوٹا والا ہی اپنے بڑے بھائیوں کو امریکا سے لے کر آیا ہے۔ بہت رو رو کر معافی مانگتا رہا اپنی نالائقی کی۔ معافی مانگنے والے' اپنی غلطی تسلیم کرنے والے' ماں کی گود کو جائے پناہ سمجھنے والے بہت عظیم ہوتے ہیں۔ یہ مجھے یقین ہے۔"

"مگر۔۔۔ میں پھر بھی تمہیں چھوٹے سے شادی کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

شانی ضد پر اڑی رہی۔ ثوبیہ کے چہرے پر ملال کا سایہ رینگنے لگا۔

"شانی! اپنا ہے۔ کبھی کبھار بددعا بھی لگ جاتی ہے۔ مجھے پھپھو نے بددعا دی تھی کہ۔۔۔ ضیا جیسا رشتہ ملے گا۔ دیکھو! ایسا ہی ہو رہا ہے۔ مگر میں خالہ دادی کا دامن نہیں چھوڑوں گی۔ وہی میری ماں' میرا باپ' میرا سہارا ہیں۔ میری طاقت ہیں۔"

"تم یقیناً" پاگل ہو۔ تمہیں بہت اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔"

"میں خوش ہوں۔ شانی! سچ بہت اچھا فیصلہ کیا ہے میں نے اور تم غور کرو۔ اس چھوٹے میں خرابی کیا ہے؟ خوب صورت ہے' تعلیم یافتہ ہے۔ مجھے پسند ہے کیونکہ خالہ دادی اس کی ماں ہیں۔ وہ ایک عظیم ہستی کا بیٹا ہے۔"

شانی کو ثوبیہ کے چہرے پر ایسی روشنی نظر آئی۔ جیسے سورج کی سنہری کرنوں نے اس کو اپنے حصار میں لے لیا ہو۔

کیا یہ آنے والی خوشیوں کا اعلان تو نہیں؟

اس کی محرومیوں اور دکھوں کے ازالے کا اعلان۔۔۔۔

☼

ثمرہ بخاری

"اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے موسم سرما کی آمد آمد ہے۔ موسم سرما کی آمد کے ساتھ ہی گاجروں' مولیوں' مونگ پھلیوں کے ساتھ ساتھ کینو' مالٹے' امرود بھی بازاروں اور بازاروں سے زیادہ گھروں کی رونق بڑھانے کو آگئے ہیں۔ وطن میں بسنے والے پیارے پیارے من موجی' بے فکر لڑاکے' بدتمیز لوگ جو پیٹ بھرنے تک نہیں نیت بھرنے تک کھانے کے اصول پر گامزن ہیں۔ یہاں سے وہاں تک چھلکوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں مگر کھانے کا سلسلہ تمام ہونے میں نہیں آتا۔"

فریدہ کا جی تو چاہتا تھا اپنی ساس اور نند نھی کی طرح وہ بھی دیر تک چارپائی پر اینڈتی رہے۔ مگر مجبوری تھی سرتاج نے دکان پر صبح سویرے جانا ہوتا تھا اور ظالم اتنا تھا جب تک سوئی ہوئی بیوی کو جگا کر اس سے ناشتا نہ بنوالے گھر سے پیر باہر نکالنے پر راضی نہیں ہوتا تھا۔

"توبہ! پتا نہیں کس اللہ مارے نے یہ پراٹھے ایجاد کیے تھے۔ بندہ سیدھا سیدھا سوکھی روٹی بھی تو کھا سکتا تھا۔ پر نہ جی! چسکورے چٹورے لوگ عورتوں کے آرام کے دشمن' ہائے اللہ! یہ گیس کی لوڈشیڈنگ جو دن کے دس بجے ہوتی ہے' جو سویرے سویرے ہونے لگ جائے تو میری بھی دکھ بھری زندگی سے دکھ کچھ کم ہوجائیں۔"

دوسرا پراٹھا توے پر ڈال کر اب وہ انڈے فرائی کرنے لگی تھی۔ رات کا بچا مٹر قیمے کا سالن بھی گرم کر کے الگ رکھ لیا تھا۔ شوہر نامدار کو فرائی انڈے پر ٹرخا کے مٹر قیمے کے مزے دار سالن کے ساتھ تلا تلا پراٹھا نوش فرمانے کا پروگرام تھا۔

مٹر قیمہ' گرما گرم پراٹھا' فرائی انڈا' اور دودھ پتی کا بڑا سا مگ

"ہائے! پتا نہیں جنت میں اللہ نے نیک بندوں کے لیے یہ نعمتیں رکھی بھی ہیں کہ نہیں۔"

فریج کھولا' دودھ دیکھا تو صرف ایک کپ۔

"فریدہ! فریدہ! او چائے تو دے دے۔ ایک بندے کا ناشتا بناتے تو آدھا دن نکال دیتی ہے۔"

بدمزاج بندہ' جیسا سڑا رنگ' ویسی سڑی باتیں۔ سر جھٹک کر ساری شوہرانہ بکواس کو جھٹکا اور میٹھے لہجے میں وہیں سے پکارا۔

"وہ جی دودھ تو ختم ہے۔ رات کو آپ کی امی جان نے جلیبیاں ڈال کے نوش فرمالیا تھا۔"

"اوہو! تو اب میں چائے کیسے پیوں گا؟"

"منہ سے اور کیسے؟" فریدہ نے معصومیت کے ریکارڈ توڑے۔

"پاگل' جاہل عورت! تم سے مشورہ کس نے مانگا ہے۔ اٹھاؤ یہ برتن۔ ایک انڈا' دو پراٹھے۔ او بندہ خود سوچے ایک فرائی انڈے سے دو پراٹھے کھائے جاسکتے ہیں۔ میں نے روکھا ہی کھایا ہے دوسرا پراٹھا۔"

"جب بھی بولتے ہیں' کفر ہی تولتے ہیں۔ کبھی شکر کا کلمہ بھی بول لیا کریں۔"

شوہر منہ بناتا گھر سے نکلا۔ فریدہ نے مزے سے ناشتا اڑایا۔ اچھی طرح جانتی تھی ساس کو قیمہ مٹر پسند ہے۔ اس نے فریج میں بہت چھپا کر گلاس میں ڈال کر رکھا تھا مگر جیسا منہ ویسی چپیڑ' گلاس میں رکھتی یا جگ میں۔ فریدہ بھی ایک کائیاں تھی۔ ایک گلاس دودھ سے مزے کی دودھ پتی بنائی۔ خوب سڑک سڑک کر کے پی۔ سڑکے لگانے کا بھی اپنا ہی سواد ہے۔

"فریدہ کی چڑیل! اٹھ گئی ہے کہ ابھی تک سو رہی ہے۔"

ساس پکارتی رہی۔ فریدہ کان بند کیے دودھ پتی کے مزے لیتی رہی۔ جانتی تھی، اتنی جلدی وہ بستر کی جان چھوڑنے والی نہیں۔ بستر میں بیٹھی ہی للکارتی رہے گی۔

دودھ پتی پی کر ناشتے کے برتن سمیٹ کر سر پر دوپٹا اوڑھ کر وہ ساس کے کمرے میں آئی تو چہرے پر زمانے بھر کی معصومیت تھی۔

"جی امی جان! شاید آپ نے بلایا ہے مجھے۔"

ساس کا بس نہیں چل رہا تھا پکڑ کے گچی مروڑ دے۔ "نی! آوازیں دے دے کے میرا گلا بیٹھ گیا، تے تو بکواس کر رہی ہے، شاید میں نے بلایا ہے۔ تیرے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ پہلی آواز پہ کیوں نہیں آتی تو؟"

"مسائل کے تو انبار لگے ہیں۔ کہاں تک سنیں گی، کہاں تک سناؤں۔ یہ بتائیں پراٹھے ڈالنے شروع کروں آپ کے لیے؟" فریدہ نے کہا۔

"ہاں۔ ہاں تو شروع کر دے۔ میں منہ ہاتھ دھو کے آ رہی ہوں۔"

"رہنے دیں۔ شیروں کے منہ دھلے ہوتے ہیں امی جان!" فریدہ بولی۔

"نی رہن دے، شیر اس لیے منہ نہیں دھوتے کہ جنگل میں ڈریسنگ ٹیبلیں نہیں ہوتیں۔ جے اک واری شیشہ دیکھ لیں نا تے روز لائن بنا کے ندی پہ کھڑے ہوں، منحوس کہیں کے۔ دیکھ ذرا! مجھے کس طرح باتوں میں لگا لیا۔ جا، جا کے پراٹھے بنا، اور پراٹھے بنا کے کچن سے نکل جانا، باقی میں نے جو بھی پراٹھے کے ساتھ لینا ہوگا آپ ہی بنا لوں گی۔"

فریدہ چپکے سے مسکرائی۔ جانتی تھی، ساس مٹر قیمے کا راز فاش نہیں کرنا چاہتی۔ بولی کچھ نہیں۔

"اور دیکھ، ننھی ابھی اٹھی ہے کہ نہیں۔ وچاری ساری رات پڑھتی رہی ہے۔ لگتا ہے امتحان میں پوزیشن لے گی۔"

"ہن جی ضرور! اگر امتحان میں سوالات فلمی رسالے سے آ گئے تو۔"

فریدہ رکی نہیں۔ اتنا کہہ کر کمرے سے باہر آ گئی۔ جلدی جلدی ٹیڑھے میڑھے پراٹھے بنائے پھر گنگناتے ہوئے گاجروں، مولیوں، مالٹوں، مونگ پھلیوں کے چھلکوں سے اٹے صحن کی صفائی کرنے لگی۔

"اک تو اس گھر کے لوگ بڑے ہی چول ہیں۔ مجال ہے جو چھلکے ٹوکری میں ڈالیں۔ جب تک سارے گھر میں چھلکوں کا فرش نہ بچھائیں، کم بختوں کو چین ہی نہیں آتا۔"

"فریدہ! نی قیمہ مٹر کدھر ہے؟ تے دودھ کا ایک کپ رکھا تھا فریج میں، سب ہڑپ کر گئی اے چڑیلے!" ساس جیسے جلتے توے پر بیٹھی تھی۔

"آئے ہائے امی جان! آپ بھی ناں کمینوں کی طرح ذرا، ذرا سی چیز کے لیے فوت ہونے بیٹھ جاتی ہیں۔ مزے کی بات سنیں، سویرے جب میں کچن میں پراٹھے بنا رہی تھی نا تو آپ کے لاڈلے پتر مسکین صاحب نے اچانک ہی فریج کی تلاشی لینی شروع کر دی تھی۔ قیمہ مٹر گلاس میں پڑا دیکھا تو پہلے خوب گرم ہوئے۔ مجھے کافی کچھ سنائیں تے فیر بتایا گلاس سالن ڈالنے کے لیے نہیں پانی پینے کے لیے ہوتے ہیں۔ جب میں نے بتایا کہ یہ شرارت آپ کی امی جان کی ہے۔ تو مسکرائے اور بولے، ضرور اماں نے یہ میرے لیے ہی رکھا ہوگا۔ تو بس پھر کھا گئے قیمہ مٹر کا سالن، پراٹھا، فرائی انڈے دو عدد اور دودھ پتی کا ایک پورا بڑا والا مگ۔"

"اچھا، پر اب میں کیا کھاؤں۔ گھر میں تو انڈے بھی نہیں ہیں۔"

"اچار تو ہے نا، آپ ایسا کرو اچار کھا لو۔ گرم گرم پراٹھے کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔"

"تو یہ مجھے بتا رہی ہے۔ پتا نہیں مسکین کو یہ عورتوں والی عادت کہاں سے پڑ گئی ہے۔ کہیں بھی کوئی چیز چھپا کے رکھوں، نکال کے کھا جاتا ہے، تے مجھے خیالی سواد کے مزے لینے پڑتے ہیں۔"

دوپہر کو مسکین کی دکان پر کام کرنے والا ملازم لڑکا کھانا لینے گھر آیا تھا اور روز کی طرح آج بھی تین درجن کینو، مالٹے، ایک کلو مونگ پھلی اور بے حساب گاجر، مولیاں دے گیا تھا۔ کھانا ابھی کچا پکا تھا۔ مطلب یہ کہ گوشت تو گل گیا تھا مگر اس میں ڈالی دال ابھی حد سے زیادہ کچی تھی۔ ہانڈی میں نمک زیادہ پڑ گیا تھا۔ آٹے کا پیڑا ڈالنے کی نوبت نہیں آئی۔ لڑکا کھانا لینے پہنچ گیا۔

"چلو کوئی نہیں، گاہکوں میں مصروف مسکین کو کون سا ذائقے کا پتا چلنا ہے۔ ساری فکریں رکھو ایک طرف اور لطف اٹھاؤ آنے والی سوغاتوں کا۔"

کینو چھیلتے ہوئے چھلکے کا رس اڑ کر ساس امی جان کی آنکھ میں پڑ گیا تھا۔ اب وہ دہائیاں اور ان کی لاڈو ننھی بیگم گاجر کھاتے ہوئے ماں کو صرف تسلیاں دے رہی تھی۔

"مونگ پھلی تو آج بہت ہی سوادی ہے۔" فریدہ نے سر دھنا تھا۔

"بھابھی..... اے بھابھی! تم نے میرا گلابی جوڑا تو دھو دیا تھا نا۔ مجھے آج شام کو اپنی دوست کی سالگرہ میں وہی پہن کے جانا ہے۔"

فریدہ نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ "دھونا بھی تھا۔"

"ہاں تو اور ایسے ہی تمہارے سامنے کرسی پہ پھینکا تھا۔"

"نہیں، میں سمجھی استری کرنے کو دیا ہے۔ میں نے تو استری کر کے ہینگر میں ڈال دیا تھا۔"

"اماں!" ننھی نے چلا کر دل تھام لیا۔

"چل اٹھ چھوڑ دے ان مونگ پھلیوں کی جان۔ اٹھ کے جوڑا دھو ننھی کا۔"

فریدہ نے خوش رنگ سا قہقہہ لگایا۔ "مزے کی گل سنو، گھر میں واشنگ پاؤڈر بھی ختم ہے۔"

"اماں!" ننھی پھر چلائی۔ "اب میں بے بی کی سالگرہ پہ کیا پہنوں گی؟"

"فکر کیوں کرتی ہو ننھی! تم میرا نیلا جوڑا پہن جانا۔"

"رہنے دو بھابھی! یہ فضول کا پیار جتانے کی کوشش نہ کرو، جانتی ہو نا، تمہارے کپڑے مجھے پورے نہیں آتے، ڈھائی فٹ تو قد ہے تمہارا جو شرٹ ٹخنوں تک سلواتی ہو، میرے گھٹنوں سے بھی اونچی ہوتی ہے۔ اماں! مجھے نہیں پتا، مجھے پیسے دو۔ میں بازار سے نیا ریڈی میڈ سوٹ خرید کے لاؤں گی۔"

"آہو! ادھر تیرا چاچا دکان کھول کے بیٹھا ہے نا، نی بس کر، دماغ نہ کھا میرا، اتنے کپڑے ہیں تیرے پاس، کوئی بھی پہن جانا اور مجھے ایک مولی بھی چھیل کر دے، مونگ پھلی کھا کھا کے گرمی سی ہو رہی ہے۔"

"ننھی! بے بی تمہاری وہی والی سہیلی ہے نا جس کے بھائی جان محترم کی اپنی ذاتی سی ڈیز کی شاپ ہے اور جہاں چھاپے کے دوران اخلاق سوز فلمیں رکھنے کی وجہ سے بھائی جان محترم کی بھرے بازار میں چھترول بھی ہوئی تھی۔"

ننھی کو یہ بے وقت کی راگنی پسند نہیں آئی۔ جس کے نتیجے میں اگلے تیس منٹ تک تو تکرار ہوتی رہی اور ہانڈی کی وہ دال جو ادھ پکی دکان پر بھیجی تھی اب حلوے میں تبدیل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم، کیا ہو رہا ہے آپو جی!" آج پھر شام کے سات بجتے ہی گلی کے دوسرے سرے پر رہنے والی شبنم آن پہنچی تھی۔

یہ ہر دوسرے، چوتھے روز شام کے سات بجے شبنم عرف شبو کا بن سنور کے چلے آنا، یہ خوامخواہ تو نہیں ہو سکتا۔ سات بجے ہی تو مسکین بھی دکان سے گھر آتا ہے۔ ہوں اب سمجھی، یہ سوکھی سڑی کالی توری میرے میاں پہ ڈورے ڈال رہی ہے، جانتی نہیں ہمیں تو یہ ڈور اس وقت کاٹوں گی جب تو اس کے سہارے آسمانوں کی سیر کر رہی ہوگی۔

"کیا سوچ رہی ہو آپی؟" شبو نے بغور مگر مسکرا کر دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"سوچ رہی ہوں تیری شکل اس کھسرے سے کتنی

تی ہے۔ جو جمعرات کو ملنے آتا ہے۔"

شبنم کا جامنی سا چہرہ نیلا ہوا، پھر خون کے گھونٹ پیتی وہ کچن سے نکل کر برآمدے میں کرسی پر جا بیٹھی۔

ننھی نے کمرے سے جھانکا۔

"یہ شبنم آج پھر موجود ہے۔ کمال ہے نہ تو میری اس سے دوستی، نہ بھابھی اسے لفٹ کراتی ہے، پھر یہ اکثر کیوں آنے لگی ہے، وہ بھی شام کو سات بجے کے قریب۔ سات بجے تو مسکین بھائی گھر آتے ہیں۔ تو کیا یہ کلر کلر چھپکلی مسکین بھائی کی وجہ سے۔ ہا... ہائے لکھ لعنت، اس نے اس گھر کی عورتوں کو عقل سے پیدل سمجھ رکھا ہے۔"

ننھی یہی سب سوچتی تیزی سے کمرے سے نکلی، برآمدے میں بیٹھی شبنم مسکرائی۔

"کیسی ہو ننھی؟"

"جیسی بھی ہوں اچھی ہوں، تمہیں فکر کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہا! کیا ہوا ہے اس گھر کے لوگوں کو، تم سارے اتنے خراب موڈ میں کیوں ہو؟"

ننھی نے جواب نہیں دیا، کچن میں آگئی، جہاں فریدہ خود کو نارمل کرنے کے لیے اتنی سردی میں اسکوائش بنا کر پی رہی تھی۔

"یہ شبنم اتنا بج سنور کے کیوں آنے لگی ہے۔ تم نے اس پر غور کیا بھابھی؟" اگلے روز ننھی فریدہ سے کہہ رہی تھی۔

"آہو بالکل کیا اور میں بالکل صحیح نتیجے پر پہنچ گئی ہوں، تیرا بھائی بڑا کمینہ ہے ننھی!"

"جو بھی ہے تمہارا گھر والا ہے، فکر کرو اس کی۔ ایسا نہ ہو، یہ شبو کام و کھا جائے۔ بھائی آخر کو کماؤ مرد ہے۔ اس طرح کی مسٹنڈیاں ایسے ہی مردوں پہ تو نظر رکھتی ہیں۔"

"ہوں۔ کل بھی برآمدے میں بیٹھی بار بار دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ تو تیرا بھائی ہی کل لیٹ آیا تھا۔ مایوس ہو کے بچاری کو واپس جانا پڑا تھا۔"

"میں نے بھائی کو فون کیا تھا، کہہ دیا تھا۔ دیر سے آنا۔ ہم سب آپا رفیعہ کے گھر جا رہے ہیں۔"

دونوں ہنس پڑیں، مگر پھر سنجیدہ ہو گئیں، شبو والا معاملہ واقعی گڑبڑ تھا۔

اب تو شبو پر چوبیس گھنٹے نظر رکھنے کی ضرورت تھی۔ شام کو مسکین گھر آیا تو ساتھ میں گرما گرم سموسے اور گاجر کا حلوہ بھی تھا۔ ذرا دیر بعد شبنم بھی آ پہنچی۔ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"فریدہ! یہ میرا بٹوہ تو کمرے میں رکھ آؤ اور ننھی بیٹا! میرے لیے ایک گلاس پانی تو لا۔ حلق خشک ہو رہا ہے۔" آج تو مسکین کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دونوں اٹھ گئیں، مگر نظر دونوں نے رکھی۔

ان کے جاتے ہی مسکین نے شبو کی پلیٹ میں دو مزید سموسے اور گاجر کا حلوہ ڈال دیا تھا۔ بن بن کر شرماتی شبو اس وقت اتنی بری لگ رہی تھی مثال دینا مشکل تھا۔

ننھی نے بھائی کے لیے گلاس میں ڈالا پانی مارے غصے کے خود پی لیا اور فریدہ نے بٹوے سے سارے پیسے نکال کر اپنے پرس میں ڈال لیے۔

"سرخ و سفید گول مٹول چائنیز کٹ بیوی اچھی نہیں لگتی، یہ کالے دانتوں، پیلی آنکھوں والی شبو بھاتی ہے۔ اس لیے اس سے عشق بگھارنے میں تھرل ہے۔ تے بیوی سے محبت کے دو بول بولنا اب تمہارے لیے فضول اور بے کار ہے، اچھا بچو ایسے تو ایسے ہی سہی۔

فریدہ نے بمشکل خود کو نارمل کیا تھا۔ واپس آتے ہوئے جان بوجھ کر شبو کی کرسی کے قریب اس کا پیر پھسلا اور وہ شبو پر آگری۔ مگر اس کے دل میں یہ خیال تو دور، دور تک نہیں تھا۔ جب وہ شبو پر گرے گی تو شبو کرسی سمیت نیچے گرتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں سے لڑھک جائے گی اور صحن میں گر کر بازو کی ہڈی تڑوا بیٹھے گی۔

"او موٹی بھینس! اندھی ہوئی ہے تو اور تجھے چلنے کی بھی تمیز نہیں ہے؟" مسکین اس کے سر پر کھڑا چلا رہا تھا۔

ایک غیر عورت کے لیے اتنی ہمدردی۔ فریدہ کا دل ڈوب سا گیا۔ ننھی بڑھ کر اسے پکڑ نہ لیتی تو وہ یقیناً" مسکین کا بازو اپنے مبارک ہاتھوں سے توڑ دیتی۔

مسکین صاحب شبو کو اسپتال لے جانے کو تیار تھے۔ لیکن انہیں یہ نہیں پتا تھا اس گھر میں ان کے ہر ارمان کو مٹی میں ملانے کا تہیہ کیا جا چکا ہے۔ ننھی نے شبو کے بھائیوں کو فون کر دیا تھا۔

ایک ہی گلی کی تو بات تھی۔ بھائی جان کون سے کالے کوسوں پہ رہتے تھے۔ ان کی آمد پر مسکین نے تو کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی۔

"یہ یہاں آئی کیا کرنے تھی؟" بھائی صاحب کو معلومات حاصل کرنے کا ازحد شوق تھا۔

"پتا نہیں جی، میں اور میری نند تو بازار گئے ہوئے تھے۔ واپس آئے تو یہ اور میرے میاں مسکین صاحب شاید سیاست پر تبصرہ فرما رہے تھے۔"

بھائی پہلے پیلے پھر نیلے اور آخر میں لال ہو گئے۔ قیاس تھا، اگر یہ دونوں معصوم صورت عورتیں درمیان میں نہ آتیں تو شبو کو بازو کے ساتھ ساتھ سر عزیز سے بھی جدا ہونا پڑتا۔

"اپنے میاں سے کہنا، اب میرے سامنے نہ آئے۔ مجھے شکل نہ دکھائے۔" بھائی نے دانت پیس کر پیغام دیا۔

"پر کیوں جی۔ وہ بچارے تو دکان سے اپنے گھر آئے تھے، کوئی آپ کے گھر کی کند (دیوار) تھوڑی پھلانگی) جو آپ انہیں دھمکیاں دے رہے ہیں۔"

گل (بات) تی تھی، جلتے کڑھتے بھائی صاحب عزیزی شبو کے ہمراہ رخصت ہو گئے۔ تب مسکین صاحب ڈرتے ڈرتے چونکنے انداز میں کمرے سے باہر تشریف لائے۔

"چلے گئے وہ دونوں۔ کچھ کہہ تو نہیں رہے تھے؟" انداز بظاہر بے نیازانہ تھا۔

"کہہ رہے تھے۔ آپ نے انہیں نظر آنے کی کوشش کی تو یہ آپ کی صحت اور زندگی دونوں کے لیے سخت مضر ہوگا۔"

سموسوں اور گاجر کے حلوے سے انصاف کرتے ہوئے دونوں صدیوں کی بھوکی دکھائی دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اگلی سویر پہلے سے بھی زیادہ سرد تھی یا فریدہ ہی آج بستر نہ چھوڑنے کے بہانے تلاش کر رہی تھی۔

"فریدہ! اٹھو بھی۔ ناشتا بناؤ۔ میں نے دکان جانا ہے۔"

"آپ کی دکان کے سامنے ہی نتھو کا تنور نما ہوٹل ہے، ارے وہی جس پر فائیو اسٹار نتھو ہوٹل کا بورڈ لگا ہے وہاں سے کچھ کھا لینا۔"

"میں نے مشورہ نہیں، کھانا مانگا ہے۔"

"میرا مشورہ بھی کھانے سے متعلق ہے۔" وہ اب پھر سے آنکھیں موند چکی تھی۔

"جہنمی عورت آگ میں جلے گی۔" دانت پیس کر اطلاع دی جسے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا۔

مسکین نے الماری کھولی تو ساتھ میں خون بھی کھول گیا۔ اس میں ایک بھی کپڑا استری نہیں تھا۔

"فریدہ او فریدہ، او میرے کپڑے بھی استری نہیں کیے۔ اب میں دکان پہ کیا پہن کے جاؤں؟"

ادھر سے جواب میں خراٹے گونج رہے تھے۔ ایک سوٹ نکالا خود استری کیا اور بھوکا ہی دکان پہ چلا گیا۔

"ہونہہ محبت کی پینگیں بڑھاؤ۔ گاجر کے حلوے اور سموسے لاؤ شبو کے لیے اور میں تمہیں اتنی سردی میں کپڑے استری کر کے دوں اور ناشتے بناؤں تمہارے لیے۔ اتنی بھی پاگل کی پتر نہیں ہوں۔"

"فریدہ! نی فریدہ!" ساس آوازیں دے رہی تھی۔

"توبہ ایک تو اس نے پتا نہیں قومی اسمبلی کے اجلاس اٹینڈ کرنے ہوتے ہیں جو اتنی سویرے اٹھ جاتی ہے، جب اس کی اپنی ذاتی بیٹی اس کی آواز نہیں سن رہی، سو رہی ہے تو مجھے کیا مصیبت ہے۔ اف سردی کا موسم گرم گرم بستر۔ واہ میرے مالک کیا کیا نعمتیں اتاری ہیں۔ مگر تیرے یہ ظالم بندے مجھے صحیح طریقے سے ان نعمتوں کو انجوائے بھی نہیں کرنے دیتے۔"

"فریدہ! نی فریدہ!" ساس چلائی۔
"چل نی فریدہ! نیند کا ایک دور ہو رہا چلنا چاہیے۔"

☼ ☼ ☼

عزیزی شبو رانی بازو عشق کی پُرخار وادی میں بازو تڑوا کر فی الحال کہیں آنے جانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ گھر میں ہی بستر پر رونق افروز ہو کر جلیبی بائی انار کلی ڈسکو چلی۔ شیلا کی جوانی وغیرہ دیکھتی اور اس وقت کو یاد کرتی جب اعلا پائے کا یہ میوزک اسے بھی ناچنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا مگر اب آہ گلے میں ڈالی گئی منحوس بیلٹ اور اس سے بندھا ہوا مجروح بازو۔

"تیرا بیڑا غرق تو نے میرا ایک بازو توڑا ہے تیرے دونوں ٹوٹیں۔ تیرا میاں تجھے اپنے گھر سے دفع دور کرے تیرا ککھ نہ رہے' مجھے اس حال تک پہنچانے والی موٹی سفید بطخ۔"

آج کل ایک ہی شغل تھا فریدہ جیسی تمام بیویوں کو کوسنا اور پھر جلیبی بائی دیکھ کے آہیں بھرنا۔

شبو کی طرف سے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا سو فریدہ کی چلبلی طبیعت خاصی مطمئن' خوش باش تھی۔ بازار جانے کا موڈ ہو رہا تھا۔ بدرنگ سا دوپٹا شوخ رنگ سوٹ پر اوڑھا۔ سوٹ کے ساتھ کا دوپٹا بیگ میں رکھا' چہرے پر غم کے گہرے بادل لانے کے لیے آنکھوں کے نیچے ہلکا ہلکا کاجل لگا کر حلقوں کا تاثر بنایا اور تھکے تھکے انداز میں چلی آئی امی جان جی کی خدمت میں۔

"اے بھابھی! تمہیں کیا ہوا ہے۔ قسمے عجیب منحوس سی لگ رہی ہو۔"

دوسروں کے بارے میں اس گھر میں ہمیشہ سچ بات کہنے اور اپنے بارے میں کسی کی ایک نہ سننے کے سنہرے اصول پر عمل کرنے کا رواج ہمیشہ سے تھا۔

"میری سہیلی کی اماں فوت ہو گئی ہے۔ میں افسوس پر جا رہی ہوں۔"

"کمال ہے اتنا افسوس تو تمہیں اپنی سگی خالہ کی وفات پہ بھی نہیں ہوا تھا۔"

ننھی نے تاک کے وار کیا تھا۔ یقیناً "اسے شک ہو گیا تھا بھابھی محترمہ جھوٹ فرما رہی ہیں۔ فریدہ نے وضاحتوں میں ٹائم برباد کرنے کے بجائے گھر سے نکلنے کو ترجیح دی۔

"صدقے جاواں کتنی رونق ہے بازاروں میں۔ ایویں لوگ بکواس کرتے ہیں' وطن عزیز میں بڑی مہنگائی ہے' لوگ کھانے کو ترس رہے ہیں بھوکے مر رہے ہیں۔ تاں کبھی ایسا ہوا ہے۔ بھائی بھوک سے مر رہا ہو۔ سیلاب نے اس کا گھر بار سب برباد کر دیا ہو اور آپ ہزاروں روپے ایویں دل پشوری (دل بہلاوے) کے لیے لٹا دیں۔ نئیں ناں تو فیر یہ جھوٹ ہی ہوا ناں کہ پاکستان میں بہت سے لوگ غربت کے مارے ہیں۔ چلو جی کپڑے خریدو۔ ادھر جوتوں پہ بھی سیل لگی ہے۔ تو کیوں نا آج کسی اچھی اور مہنگی سی جگہ سے کھانا بھی کھایا جائے' گھر سے باہر آتے ہی دوپٹا تبدیل ہو گیا تھا۔ ہونٹوں پہ لپ اسٹک' چہرے پہ فاؤنڈیشن کی تہہ اس سہیلی کے گھر آکر جمائی تھی' جس نے ساتھ بازار جانا تھا۔ مگر قسمت کی خرابی (سہیلی کی) آج صبح سے اچانک اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا' جو تاحال جاری تھا۔ سو فریدہ کو اکیلے ہی بازار آنا پڑا۔

مشہور زمانہ فروٹ چاٹ کھاتے ہوئے یوں ہی نظر اٹھائی تھی۔ مگر نظر تو پلٹنا بھول گئی۔ یہ مسکین ہے۔ ہمیشہ شلوار قمیص پہننے والا نویں نکور نیلی جینز شرٹ اور سب سے بڑھ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور یہ ساتھ بھورے بالوں والی بندریا کون ہے۔ مشہور زمانہ چاٹ کی پلیٹ اٹھا کے ماری زمین پہ اور قریب تھا کہ وہ جا کر اسی طرح اس ہنسوں کے جوڑے کو بھی پٹخ دیتی مگر اسی وقت مسکین نے بھی اسے دیکھ لیا۔ اور جب چاٹ والا اس سے اس نقصان کا ہرجانہ طلب کر رہا تھا۔ دونوں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب بھی ہو چکے تھے۔

"ہائے ربا کیا بگاڑا ہے میں نے کسی کا۔ کیسی ٹٹ پینی قسمت بنائی ہے میری۔"

سارا موڈ غارت ہوا' اور جب گھر واپسی ہوئی تو

صورت پر اس سے کہیں زیادہ درد اور سوز تھا جتنا کہ سویرے گھر سے نکلتے ہوئے تھا۔ یہاں تک کہ ننھی کو اپنی بدگمانی پر سخت ندامت ہوئی تھی۔

"کیسے فوت ہوئی تمہاری سہیلی کی اماں؟" ننھی کے پوچھنے کی دیر تھی۔ فریدہ پھوٹ پھوٹ کے روئی ہے تو خاموش کروانا مشکل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس رات مسکین کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی۔ فریدہ نے دیر سے آنے کا سبب نہیں پوچھا۔ آج وہ شادی کے ان چھ برسوں میں کوئی پانچویں بار پھولوں کے گجرے لایا تھا۔ اس کا مطلب ہے' یہ پانچویں مرتبہ مجھے دھوکا دے رہا ہے۔

مارے غصے کے فریدہ کا بس نہیں چل رہا تھا۔ مسکین کا کیا کر ڈالے۔ ادھر مسکین تھا کہ خوامخواہ مسکرا رہا تھا' فریدہ کو محبت بھری نشیلی نظروں سے دیکھ کر دلی محبت کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

"کیا بات ہے' آنکھوں میں کوئی تکلیف ہو گئی ہے بیماری لگ گئی ہے۔"

"نن..... نہیں بالکل ٹھیک ہیں' کیوں؟" مسکین اس سوال پر گڑبڑایا تھا۔

"تے فیر ٹیڑھی کیوں کر کے دیکھ رہے ہو' قسم سے بڑے ہی لوفر لگ رہے ہوتے تالے زہر دی۔"

بیگم کے اس ارشاد کے بعد محبت کی مزید ایکٹنگ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی تھی۔

"ایک کپ چائے تو بنا دو میرے لیے۔"

"تاں میں کسی کے پیو کی نوکر ہوں۔"

"کیا ہو گیا ہے۔ ایک پیالی چائے کے لیے ہی تو کہہ رہا ہوں۔"

"تو کیا ہو گیا ہے' ایک پیالی چائے کا ہی تو انکار کیا ہے میں نے۔ جہاں سارا دن گزارا ہے وہاں چائے بھی پی آتے۔"

"ان ہی باتوں کی وجہ سے میرا گھر آنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"جی نہیں چاہتا تو پھر کیا کرنے آتے ہو۔ اور میں نے کب منت کی ہے' میں نے کب ہاتھ جوڑے ہیں۔"

میڈم فریدہ جو چلانا شروع ہوئی تو پھر خاموش کروانا کسی کے بس میں نہ رہا۔

☼ ☼ ☼

"بھابھی! رات کو بہت ہی رولا (شور) پایا تھا تم نے' فلم دیکھنے بیٹھی تھی مجال ہے جو کوئی ایک لفظ بھی پلے پڑا ہو میرے۔"

"آہو! تم فلمیں نہیں دیکھو گی تو کون دیکھے گا۔ کسی کو میرے دکھ کا' میرے غم کا احساس ہی نہیں ہے۔"

"ہیں! کیا ہوا؟"

"تیرا بھائی کسی چڑیل پہ دکان کی ساری آمدنی لٹا رہا ہے۔ یاد ہے پچھلے دنوں اماں نے نئی کشمیری شال لانے کو کہا تھا۔ بہانا کر دیا تو نے بھی گرم جوڑے کے لیے پیسے مانگے تھے نئیں ناں دیے۔ کہاں سے دیتا۔ سارا پیسہ تو اس چڑیل پہ لٹا رہا ہے۔"

"لگتا ہے شامت آگئی ہے اس کی' پتا لگاؤ بھابھی! کہاں کہاں ملتے ہیں دونوں۔ ہم بھی وقت پہ چھاپہ ماریں گے۔"

حسینہ مہ جبینہ کہاں رہتی ہے پتا لگانے میں دیر نہیں لگی۔ مسٹر مسکین کی دکان کے پچھواڑے ہی غریب خانہ تھا ان کا۔

ایک دن دکان پر ہی ننھی اور فریدہ نے پکڑ لیا۔ کافی ہٹ ڈراما ہوا جس نے دیکھا' داد دیے بغیر نہیں رہ سکا' فریدہ نے اس کو مسکین کی دکان پہ دیکھ کر دہائی دی تھی۔

"بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ لڑکے والے لمبے چوڑے جہیز کا رولا ڈال رہے ہیں اور تم روز ٹرخا رہے ہو۔"

"یہ..... یہ مسکین کی بیٹی کی شادی۔ آپ کون ہیں اور یہ تو خود اتنی عمر کے نہیں ہیں۔ بیٹی کا ویاہ۔" وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"کوئی کم عمر کے نہیں ہیں ذرا بے حس سے ہیں نا۔

دل پہ کچھ نہیں لیتے اس لیے کم عمر لگتے ہیں' بیوی بچاری تو اسی بے حسی کو جھیلتے' ملبی پہ آگئی ہے میں پڑوسی ہوں ان کی۔"

مسکین صاحب اتنے گھبرائے ہوئے کہ نا ہاں اور نا ہی نہ کرپائے' باقی کی قیامت نھی نے ڈھادی۔ بیٹی کا رول اس نے ادا کیا تھا۔ اتنی بڑی بیٹی وہ تو مسکین کی صورت پہ تھوکنے کو تیار ہوگئی تھی۔

مسکین صاحب اتنے شرمندہ۔ گھر آکے بھی ان دونوں سے گلہ نہیں کرسکے البتہ یہ دونوں ناراض رہیں۔

"بھائی جی کو شرم نہیں آتی۔ یہ بھی خیال نہیں آتا۔ جوان بہن کی سسرال اسی شہر میں ہے۔ ویسے بھابھی میں سوچ رہی ہوں۔ تیری باقاعدہ شاگردی اختیار کرلوں۔ دیکھ ناں تو نے کتنی عقل مندی سے میاں کو اپنے رعب میں رکھا ہوا ہے۔ ورنہ وہ بھی تو ہوتی ہیں ادھر میاں نے گھر میں قدم رکھا ادھر تھر تھر کانپنے اور خدمتیں کرنے لگیں۔"

"ہاں ہوتی ہیں ایسی پاگل خانیاں بھی۔ چل دفع کر پھر تو آج سے ہی میری شاگردی اختیار کرلے۔ پر سن امی جان جی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"لے دس بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ امی جان تو ویسے ہی آپ کی عادتوں کو کتی عادتیں قرار دیتی ہیں۔ انہیں تو واقعی کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"اچھا تو شاگردی کی فیس بھی تو پوچھ بھلا کیا ہوگی۔"

"ہیں تو اب فیس بھی لوگی مجھ سے۔ اچھا چلو سنہرے مستقبل کے لیے قبول ہے مجھے۔ پر بھابھی تم نے رشتے داری کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ کمینگی کی انتہا کردی ہے۔"

"کمینگی میں جتنا سکھ ہے ناں۔ تجھے اس کا اندازہ ہی نہیں ہے۔"

"اچھا بول پھر کیا فیس ہے تیری؟"

"میری فیس یہ ہے کہ آج سے گھر کی صفائی تو کرے گی۔"

پہلے تو تھی بدکی کہ گند پھیلانے میں جتنی تیز تھی صفائی کرنے سے اتنی ہی جان جاتی تھی' مگر پھر راہ بھرلی۔ اس کا منگیتر حامد خاصا تیز طرار واقع ہوا تھا' امی جان کو اس کا دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا کاروبار بھا گیا تھا ورنہ فریدہ نے توصاف کہا تھا' ایسے چلتر' کتر کتر بولنے والے سانپ نما لڑکے میاں کے عہدے پر فائز کرنے کے لائق ہرگز نہیں ہوتے مگر جتنا عزیزی نھی بیگم کو بھابھی کی عقل و دانش پر یقین تھا' اتنا ہی اماں جان محترمہ بہو کی ذہانت کے سلسلے میں بے یقین تھیں۔ ان کا کہنا تھا" فریدہ صرف پٹھی (الٹی) مت دے سکتی ہے۔"

✲ ✲ ✲
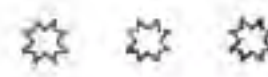
رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد مسکین کی گھر میں جو رہی سہی عزت تھی' وہ بھی جاتی رہی بلکہ اب تو وہ خود بھی نھی سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یہ سب اس موٹی کی وجہ سے ہوا ہے۔ تماشا بنادیا میرا' فریدہ کو دیکھ دیکھ کر خون جوش مارتا مگر بظاہر بھیگی بلی بنا بیٹھا رہتا۔

ان ہی دنوں نھی کی شادی کا ہنگامہ اٹھا۔ دن رات بازاروں کے چکر' شاپنگ' مزے ہی مزے' مسکین نے اب بہت دیر سے گھر آنا شروع کردیا اب تو وہ دوپہر کا کھانا بھی گھر سے نہیں منگواتا تھا۔ فریدہ نے نوٹس نہیں لیا۔ اچھا ہی تھا ناں۔ امی جان کے لیے صبح ہی کھانا بنا کر رکھ دینے کے بعد دونوں بازار نکل جاتیں اور شام کو واپسی ہوتی۔

"نی ہانڈی میں تو روز آلو' انڈے تو کبھی خالی آلو اور کبھی خالی خولی انڈے بنا کے چلی جاتی ہے۔ روٹی مجھے بازار سے منگوانی پڑتی ہے۔ میرا پیٹ خراب ہوگیا ہے۔" امی جان دونوں کو اطلاع دیتیں۔

"چھوڑو امی جان جی' یہ دیکھو یہ کپڑا کتنا نرم و ملائم ہے۔" فریدہ نوٹس ہی نہیں لیتی تھی۔ نھی بھی اپنی ترنگ میں تھی۔ ماں کے بجائے بھابھی کا ساتھ دیتی۔

✲ ✲ ✲

"نی آج شام کو نھی کے سسرال والے آنے والے ہیں' تم دونوں آج بازار جانے کا پروگرام کینسل کرو اور شام کی تیاری کرلو۔" ساس نے فون سننے کے بعد دونوں کو اطلاع دی تھی۔

"کیوں کیا کرنے آرہے ہیں؟" فریدہ نے سوال اٹھایا۔

"او ہونے والی بہو رہتی ہے اس گھر میں۔ ان کا آنا بنتا ہے' تجھے کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔"

"ہائے ہائے! تکلیف کی بھلا کیا بات ہے۔ چار سے پانچ گھنٹے چولہے کے سامنے کھڑے رہنا بھلا مشکل کام تھوڑی ہے۔"

"اور مہمانوں کی فضول فضول باتوں پہ دانت نکال کے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا' یہ تو پہلے کام سے بھی زیادہ آسان ہے۔ میں تو بہت خوش ہوں امی جان جی۔"

"بھابھی! میرے چہرے پہ مساج تو کردو۔ اور سنو شام کو میرا میک اپ تم نے کرنا ہے۔"

"چل خیر۔ ٹھیک ہے۔ تو بریانی کا مسالہ بنا' سویٹ ڈش بھی بنا کے فریج میں رکھ دے۔ قورمے کے لیے لہسن پیاز بھی ابھی سے چھیل لے' میں شام کو تجھے تیار کردوں گی۔ دیکھ ناں اگر میں یہ سارے کام کرنے بیٹھ گئی تو تجھے تیار کرنے کا ٹائم ہی کہاں نکلے گا۔"

بات معقول تھی۔ نھی کو ماننا پڑی۔

"دیکھ سسرال والوں سے زیادہ میٹھا بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خاموشی سے ایک طرف بیٹھی رہنا۔ میں کہہ دوں گی' اب ہماری کڑی شرمیلی ہوگئی ہے۔ بھئی شادی کے دن جو قریب آرہے ہیں۔"

"پر کیوں بھابھی' کیا سوچیں گے وہ لوگ' ہم اتنی دور سے ملنے آئے ہیں ادھر مزاج ہی نہیں ملتے۔"

"او ہو' بہت خوش اخلاقی برت چکی ہے تو' اب مزید ریکارڈ نہ بنا' ورنہ جب سسرال جائے گی تو' بڑی مشکل ہوگی۔ خوش اخلاق بہو کو تو سسرال والے لپیٹ لپوٹ کے کھا جاتے ہیں۔ تجھے یاد نہیں' جب میری شادی ہوئی تھی' میں کہاں زیادہ بولتی تھی۔ وہ تو بعد میں مجھے اندازہ ہوگیا تو بھی بالکل میری طبیعت کی ہے تو میں نے دوستی کرلی۔ اور ہاں سن۔"

"او ہو بھابھی! یہ پن بالوں میں لگاؤ نا' سر میں کیوں ٹھوک رہی ہو۔"

"او باتوں میں دھیان نہیں رہا' میں کہہ رہی تھی نندوں اور جیٹھانی کے بچوں کو لفٹ کروانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایویں زیادہ فری کرلے گی تو پھر ان کا سارا دن تیرے سجے سجائے کمرے میں گزرے گا۔"

نھی چونکی اور اثبات میں سر ہلانے لگی۔ "یہ تو بڑی اہم بات بتائی ہے نے' بلکہ موقع ملا تو ایک آدھ کو دھمو کا بھی جڑ دوں گی۔"

"خیر۔ اب اتنی بھی جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جتنا کہا اتنا کافی ہے اور ہاں کھانے کی تعریف کریں تو کہہ دینا بھابھی نے بنایا ہے۔"

"ہیں' پر یہ تو میں نے پکایا ہے۔"

"یا غلے اگر انہیں پتا چل گیا ناکہ کڑی کھانے بنانے میں ماہر ہے جاتے ہی کچن کا نظام تیرے متھے ماریں گے۔ تجھے پتا ہے نا' کتنا بڑا ٹبر ہے ان کا۔"

"اللہ تجھے چاند سا کاکا عطا فرمائے بھابھی۔"

"آمین اور ایک اور بات۔ جاتے ہی چاند سے کاکے کی کوشش نہ شروع کردینا۔ کچھ وقت اپنے انجوائے کرنے واسطے بھی رکھ لو۔ کاکے اگر دو' تین سال بعد بھی آجائیں تو خیر ہے۔"

"میں یہ جھمکے پہن لوں' اچھے لگیں گے نا؟"

"مرضی تیری ویسے اب تو شادی میں تھوڑے دن ہی رہ گئے ہیں۔ اچھی لگو یا بری' اب کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"چلو پھر رہنے دیتی ہوں' اتنے بھاری ہیں۔ کان میں درد ہونے لگتا ہے۔"

✲ ✲ ✲

نھی کی شادی پر کافی رونق لگی۔ مہندی کے روز فریدہ نے گوٹے کے کام والا سوٹ پہنا' میک اپ بھی

بڑی نفاست سے کیا اور پھولوں کا زیور بھی پہنا۔ وہ ٹیتھی نظروں سے بار بار مسکین کی طرف دیکھتی رہی، مجال ہے، جو منحوس مارا ایک بار بھی مسکرایا ہو۔ یوں بن رہا تھا۔ جیسے فریدہ اس کی نہیں پڑوسی کی بیگم صاحبہ ہے۔ اگر غور سے دیکھ لیا تو پڑوسیوں سے تعلقات خراب بھی ہوسکتے ہیں۔

رسمیں جاری تھیں۔ جب فریدہ نے ڈانس کا اعلان کیا تو ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

فریدہ نے ڈیک آن کیا۔ گیت کے بول ابھرے، ہونٹ تو مسکین کے بھی ہل رہے تھے۔ مگر اتنے شور نے عزت رکھ لی، کسی نے وہ کلمات نہیں سنے جو فریدہ کی شان میں ادا کیے گئے تھے۔

یہ اسی دل جلے کا کیا دھرا تھا کہ ایک کے بعد دوسرا اسٹیپ لیتے ہوئے مسز مسکین لڑکھڑائی ہیں۔ مدد لینے کے لیے مسکین کی طرف ہاتھ بھی بڑھایا ہے۔ جسے مسکین نے نظرانداز کیا ہے اور فریدہ لہرا کر فرش پر جو آئی ہے تو لینے کے دینے پڑ گئے ہیں۔

ایک ہی شور ہے۔ "ہائے میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔"

مہمان خواتین نے ہی اٹھا کر بیڈ پر ڈالا۔

"ہائے ڈاکٹر کو بلاؤ!" وہ دہائیاں دے رہی تھی۔

"مسکین بھا جی! آپ کی بیوی بڑی تکلیف میں ہے۔ ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلوا رہے؟" رشتے کی ایک بہن نے کچھ حیرت سے سوال کیا۔

"او ایسے ہی اسے ڈرامے کرنے کی عادت ہے۔ ٹھیک ہوجائے گی سویر تک اور ویسے بھی سوائے ڈانس کرنے اور لڈیاں ڈالنے کے اور کون سا کوئی کام ہے۔"

فریدہ نے سنا، ایک تو پیر کی تکلیف، دوسرے لفظوں کی اس مار کا صدمہ، مارے غصے کے تھرا اٹھی اور پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ہی مسکین کو خوب سنائیں۔

رات گئے تک پیر مزید سوج گیا۔ مسکین کو اسپتال لے کے جانا ہی پڑا۔ ڈاکٹر نے بتایا ہڈی تو بچ گئی ہے، مگر پیر پر چوٹ شدید آئی ہے۔ بیڈ ریسٹ ضروری ہے۔

"ہائے کیا کیا ارمان نہ تھے۔ برات میں ستاروں والی گلابی ساڑھی، ولیمہ کے لیے نیلا لہنگا سب خواب مٹی ہوگئے۔ بیڈ سے پیر نیچے رکھنا مشکل ہو رہا تھا اور یہاں پر کون اتنا فارغ تھا جو اسے سہارے دے دے کر اندر باہر لاتا۔

"مسکین! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ تھوڑا کھانا تو لادو۔"

رات کے بارہ بجے وہ سارے کام سمیٹ کر کمرے میں آیا تھا۔

"بھوک لگ رہی ہے۔ تم نے دس بجے کے قریب پلیٹ بھر کے بریانی کھائی تو تھی۔" انداز میں حیرت اور بےزاری تھی۔

"او پتا نہیں، کس نے کس وقت کی دشمنی اتاری تھی، بغیر بوٹیوں کے صرف چاولوں سے پلیٹ بھر کے مجھے پکڑا دی۔ جاؤ نا، ایک پلیٹ میں چنگی چنگی بوٹیاں ڈال کے لادو۔"

آج مہندی تھی، ابھی کل شادی پھر پرسوں ولیمہ ہے، تم رج رج کے بوٹیاں کھا لینا۔ اس وقت مجھے سونے دو، میں بہت تھکا ہوا ہوں۔"

مسکین نے کمبل اوڑھا۔ ذرا دیر بعد خراٹے گونجنے لگے، مگر بوٹیوں سے بھری پلیٹ کا تصور اور مسکین کی بےحسی پر غصہ۔ فریدہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

صبح پیر کا درد مزید بڑھ گیا تھا۔ اسے بری طرح رونا آرہا تھا۔

"یہ کس مرجانے ڈاکٹر کے پاس لے کے گئے تھے۔ میرے پیر میں تو اور بھی درد ہونے لگا ہے۔"

"اچھا، آئے ہوئے ہیں تمہارے میکے والے، تم ان کے ساتھ کسی سیانے ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔" مسکین نے اتنا کہا اور باہر کی راہ لی۔

"سنو، میرے لیے ناشتا تو بھجوا دینا۔"

وہ اگلے تین گھنٹوں تک انتظار کرتی رہی۔ مسکین باہر جا کر یا تو کاموں میں مصروف ہوگیا تھا یا پھر رشتہ دار لڑکیوں سے گپیں لڑانے میں۔ خیال ہی نہیں رہا کمرے میں بیوی بھوکی بیٹھی ہے۔

مگر آج بھوک اور درد سے زیادہ مسکین کی بےحسی اور لاپروائی تکلیف دے رہی تھی۔ شام کو تکلیف کچھ کم تھی، وہ شادی میں شریک ہوئی، مگر چلنا پھرنا مشکل تھا۔ ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد منھی اور اس کے سسرال والے پہلی مرتبہ ان کے ہاں کھانے پر آرہے تھے۔ فریدہ کا پیر اب ٹھیک ہوچکا تھا۔ مگر کچن میں سارا دن برباد کرنے کا خیال موڈ خراب کر رہا تھا۔

"سنیں جی۔ آج کڑاہی بازار سے بنوا لینا، شامی کباب اور کھیر بھی بازار سے ہی آئے گی۔ گھر میں اور بڑے کام ہیں۔"

مسکین کے ماتھے پر بل تو آئے، مگر خاموش رہا، جانتا تھا بحث فضول ہے۔ امی جی نے سنا تو کچھ بگڑیں۔

"پہلی واری کڑی شادی کے بعد اپنے سسرال والوں کے ساتھ آرہی ہے۔ بازار کے کھانے رکھنا اچھا نہیں لگتا، میں پوری مدد کراؤں گی، تو بسم اللہ تے کر۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے نا، کڑاہی، شامی کباب اور کھیر بازار سے آجائے گی، باقی سارا کچھ ہم گھر پہ بنالیں گے۔"

ماں کچھ بولنے لگی، مسکین نے کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے میں آرڈر پر سب کچھ بنوا کے لیتا آؤں گا۔"

فریدہ کو اس کی ہاں نے بھی طیش دلایا۔

"ہاں۔ اب بہن آرہی ہے تو سب کچھ اسپیشل بنوا کے لایا جارہا ہے، کبھی میرے لیے تو آج تک کچھ نہیں لائے۔"

پیر کی تکلیف میں جو رویہ مسکین کا رہا تھا، اس نے بھی فریدہ کے دل کو بہت دکھایا تھا۔ فریدہ نے صفائی کا بہانا کرکے آدھا دن گزار دیا۔

بریانی کا مسالا اور قورمہ امی جان نے بنایا۔ فریدہ نے صرف سلاد کاٹی۔ شام کو ہنستی مسکراتی منھی بھی اپنی ساس، نندوں اور میاں کے ساتھ چلی آئی۔

"ارے یہ منھی پاگل تو یہاں سے جاتے ہی سارے سبق بھول گئی ہے۔ کیسے ہنس ہنس کے ہر کسی سے بات کر رہی ہے۔ بڑی نند کے بچوں سے خوب دوستی ہے، پھر جیسے ہی چائے آئی، اس نے اپنے میاں حامد کو خود پیش کی وہ کھانے کی ایک ایک چیز میاں کے سامنے رکھتی رہی۔"

"نی منھی! تو، تو بالکل ہی عقل سے پیدل ہے، کیا سبق پڑھایا تھا میں نے تجھے۔" منھی کچن میں آئی تو فریدہ برس پڑی۔

منھی مسکرائی۔ "بھابھی! تمہاری زندگی سے ہی تو سبق سیکھا ہے میں نے اور مجھے یہ پتا چلا ہے ——— محبت مروت اور احساس میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد ہے تمہارے پیر کی اس چوٹ پر مسکین بھائی کی بےحسی، میں نے سوچا کیا فائدہ ایسے رعب اور بےنیازی کا جو عورت کو میاں کے دل سے دور کردے۔ تم ہمیشہ حیران ہوتی تھیں، تمہاری گوری رنگت، اتنا سجنے سنورنے کے باوجود مسکین بھائی دوسری عورتوں کی طرف کیوں متوجہ ہوجاتے ہیں۔ میری سمجھ میں وجہ آگئی ہے، جو عورتیں شادی کے بعد میاں کو ملکیت سمجھنے لگتی ہیں اور ان کے چھوٹے کاموں کو نظرانداز کرتی چلی جاتی ہیں۔ نوبت پھر یہاں تک آتی ہے۔ میاں ان کو نظرانداز کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنے سارے کام آپ کرنے کا عادی ہوجاتا ہے۔ اسے کسی بھی کام کے لیے پھر بیوی کی مدد کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ تو بھابھی جی! میں نے سوچا ہے میں حامد کی یہ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں آپ پوری کروں گی، عادی بناؤں گی اس کو۔"

منھی حامد کے لیے شربت کا گلاس لینے آئی تھی لے کر چلی گئی عقل مند فریدہ جو منھی کو سبق پڑھاتی تھی آج منھی اس کے لیے ایک نئی سوچ چھوڑ گئی۔

*

مہر گل

"ماہین سعید آرہی ہے آج۔ اپنی شام کی مصروفیات کینسل کردینا۔"

حیدر لغاری نے موبائل آف کرتے ہوئے اپنی بیگم سونیا لغاری سے کہا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی اپنے کمر تک آتے گیسوؤں کو سنوار رہی تھی۔ ٹھٹک کررکی۔

"شاید ہم دونوں کے درمیان یہ معاہدہ ہوچکا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی مصروفیات میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔"

اس نے آئینے میں حیدر لغاری کو دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"آف کورس! مجھے یاد ہے، مگر آج کی مصروفیات کینسل کرنے میں تمہیں بھی فائدہ ہے۔" حیدر نے سیل فون کارنر ٹیبل پر رکھا اور گھوم کر اس کی طرف آیا۔

"ماہین سعید کون ہے؟" سونیا نے چہرے پر فاؤنڈیشن لگاتے ہوئے استفسار کیا۔

"ماہین سعید کو بھول گئیں؟ وہ نہایت معیاری جریدے میں کام کرتی ہے۔ معروف شخصیات کے انٹرویو کرتی ہے۔" حیدر لغاری کے کہنے پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنس پڑی۔

"معروف لوگوں کے انٹرویو کرتی ہے، تو تم اتنے ایکسائیٹڈ کیوں ہورہے ہو؟" اس کے طنز پر حیدر لغاری سلگ کررہ گیا۔

"کیوں میں مشہور شخصیات میں شامل نہیں کیا؟" حیدر نے بھنچتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کبھی تھے ... اب پانچ، چھ سالوں سے سوائے گیدرنگ اور پارٹیوں کے کوئی مصروفیت نہیں رہی تمہاری۔" وہ بدستور اس پر طنز کررہی تھی۔

حیدر لغاری پاکستان کی فلم انڈسٹری کا ایک بڑا نام تھا۔ اسّی کی دہائی میں اس نے فلم انڈسٹری میں قدم رکھا تھا اور بیس سال تک اس پر راج کیا تھا۔ اس کی اس حکومت میں ایک بڑا حصہ اس کی بیگم سونیا لغاری کا بھی تھا، جو خود بھی ٹاپ کی ماڈل اور اداکارہ تھی۔ دونوں کی جوڑی نے پاکستان فلم انڈسٹری کو کئی سپرہٹ فلمیں دیں۔ مگر شوبز وہ دنیا ہے، جہاں چڑھتے سورج کی پرستش کی جاتی ہے۔

حیدر لغاری کا بھی زوال شروع ہوچکا تھا۔ نئے چہرے دریافت ہوچکے تھے اور آہستہ آہستہ حیدر لغاری اس دنیا سے بے دخل ہونے لگا تھا۔ سونیا کو اب بھی کچھ رول مل جایا کرتے تھے۔ وجہ اس کی سحرانگیز شخصیت اور اس کے چہرے کا بھولپن تھا۔ اڑتیس سال کی عمر میں بھی وہ تیئس چوبیس سال کی معلوم ہوتی تھی۔ حیدر لغاری نے ایک مرتبہ پھر سونیا کا طنز برداشت کیا تھا۔

"اسی لیے تو انٹرویو کا وقت دیا ہے ڈارلنگ! اس کے میگزین کی شہرت پاکستان بھر میں ہے، اس میں انٹرویو کا مطلب پبلسٹی ہے۔ اس سے حاصل کردہ مقبولیت کے سبب ہم دوبارہ فلم نگری میں قدم رکھ سکیں گے مائی ڈیئر!" اس نے سگریٹ سلگائی۔

"اوہ واقعی! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ حیدر لغاری کوئی کام بغیر اپنے فائدے کے نہیں کرتا۔" سونیا اب ساڑھی کی فال درست کررہی تھی۔ در حقیقت وہ خود کو مصروف ظاہر کررہی تھی۔ اس کی بے پروائی کو حیدر زیادہ دیر برداشت نہیں کرپایا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"ہاں! نہیں کرتا میں اپنے فائدے کے بغیر کوئی کام۔" اس کی انگلیاں سونیا کے گداز بازوؤں میں گڑی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"اور کان کھول کے سن لو! میرے لیے آج کا انٹرویو بہت اہم ہے۔ یہ میری مجبوری ہے کہ وہ فیملی انٹرویو لینا چاہتی ہے لہٰذا تمہارا انٹرویو بھی ہونا ہے۔ اسی لیے تمہیں آج گھر میں رہنا ہے۔ ٹھیک پانچ بجے وہ آئے گی ... اور اگر تم نہ رکیں تو تمہاری جانب سے میں تمہارا ابتدائی تعارف تو کرا ہی دوں گا کہ تمہارا تعلق وہیں سے ہے، جہاں عیاش لوگ صرف اپنا دل بہلانے جاتے ہیں۔ اور ... اور بھی بہت کچھ مائی لو! سوبی کیئر فل اینڈ لیو ایٹ ہوم۔" اس نے ایک ایک لفظ چبا کر

کہا اور ایک جھٹکے سے اسے چھوڑ کر باہر نکل گیا۔
سونیا کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔ اس کے بازوؤں کی دودھیا جلد پر حیدر کی انگلیوں کے نشان واضح تھے۔ مگر اس کا دکھ یہ تکلیف نہیں تھی۔ وہ تو اپنی روح پر لگے زخموں کے ادھڑ جانے پر بلبلا رہی تھی۔
"تو ثابت ہوا حیدر لغاری! کہ تم نے آج بھی مجھے شہرت کا ایک زینہ ہی سمجھا ہے۔ میں جو تمہاری ترقی کے حصول کے لیے اپنی راتیں بااثر عیاش، بھیڑیوں کے حوالے کردیتی ہوں اور دن میں مختلف لوگوں اور صحافیوں کے سامنے اپنے چہرے پر منافقت کا پردہ چڑھائے تمہاری اور اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار ثابت کرتی رہتی ہوں، مگر تمہاری نظروں میں میری حیثیت ایک مہرے سے زیادہ نہیں۔
حیدر لغاری! اس زندگی سے اچھی زندگی تو میری وہیں تھی، جہاں میں صرف اپنی آواز بیچتی تھی، رقص کرتی تھی، مگر تم نے تو مجھے پیشہ ور بھی بنادیا۔ کاش میں تمہارا مکروہ چہرہ لوگوں کو دکھا سکتی۔ مجھے اپنی بدنامی کا کوئی خوف نہیں، مگر میرے بچے جنہیں میں کبھی ممتا نہیں دے پائی۔ ان سے ان کی عزت اور خودداری چھیننے کا بھی مجھے کوئی حق نہیں۔ میں صرف ان کی خاطر آج پھر اپنے چہرے پر جھوٹ اور منافقت کا ماسک چڑھاؤں گی۔"
وہ تکیے میں منہ دیے بری طرح رودی۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم!" معروف صحافی ماہین سعید ایک فوٹو گرافر کے ساتھ آچکی تھی۔
ڈرائنگ روم میں آج نہ جانے کتنے عرصے بعد سونیا اور حیدر آپس میں بات کرتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ فوٹو سیشن ہوچکا تھا اور اب انٹرویو کا آغاز ہو رہا تھا۔ ماہین سعید نے گفتگو کا آغاز کیا۔
"آپ کی جوڑی شوبز کی دنیا کی چند گنی چنی کامیاب جوڑیوں میں سے ایک ہے۔ اس کامیابی کا راز کیا ہے؟"
"ہماری کمزوریاں جو ایک دوسرے کے پاس ہیں۔" بے ساختہ سونیا کے منہ سے نکلا۔ حیدر نے اسے کینہ توز نظروں سے گھورا۔
"کیا مطلب؟" ماہین سعید نے چونک کر پوچھا۔
"ان کا مطلب ہے، ہم دونوں ایک دوسرے کی کمزوری ہیں۔ پیار اور محبت کی بیڑیاں ہمیں جدا ہونے نہیں دیتیں۔" حیدر نے ایک دم بات سنبھالی۔
"سچ کہا تم نے حیدر! یہ بیڑیاں ہی تو ہیں۔" سونیا سوچ کر رہ گئی۔
"پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی آپ کی؟"
"وہیں پر جو عیاش لوگوں کی پسندیدہ جگہ ہے۔" سونیا نے سوچا مگر جواب اس کے برعکس دیا۔
"ایک پارٹی تھی ہمارے مشترکہ دوست کی طرف سے۔ وہیں ہماری ملاقات ہوئی اور پھر دوستی۔"
"اور یہ دوستی شادی تک کیسے پہنچی؟"
"صرف پانچ لاکھ روپے کے ——— عوض مجھے خرید لیا تھا حیدر لغاری نے۔" سونیا نے کرب سے سوچا۔
"ارے! اس ملاقات کے بعد تو ہم بڑے بے چین رہے، سو کچھ دنوں بعد ہی ان کی مما کے سامنے پروپوزل رکھ دیا اور یہ ہماری ہوگئیں۔" حیدر نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔
"آپ کے متعلق سنا ہے کہ آپ کی ایک بیگم گاؤں میں بھی رہتی ہیں؟"
اس سوال پر حیدر کا چہرہ تن گیا۔ "پلیز! اٹ از مائی پرسنل میٹر۔ اس بارے میں سوال نہ کریں تو بہتر ہے۔"
"کاش حیدر! تم مجھے بھی دنیا کے سامنے ارزاں نہ کرتے۔ مجھے بھی کسی گاؤں کے ایک کمرے میں چھوڑ آتے۔" سونیا کے اندر موجود عورت نے صدائے احتجاج بلند کی۔
"اوکے! اگر آپ کے اسکینڈلز تو بہت سی ہیروئنوں کے ساتھ بنے ہیں۔ سونیا! کیسے برداشت کرتی تھیں آپ؟"

"یہ میرے تھے ہی کب جو مجھے دکھ ہوتا۔" سونیا کے اندر کی عورت مسلسل چیخ رہی تھی مگر وہ مسکرا کر بولی۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی

"ویری گڈ! شعر و ادب سے بھی لگاؤ ہے آپ کو۔ کچھ اپنے بیک گراؤنڈ کے متعلق بتائیں گی آپ؟"
اس سوال پر سونیا کے چہرے پر تاریکی پھیل گئی، جبکہ حیدر کے چہرے پر محظوظ ——— مسکراہٹ چھاگئی تھی۔
"میری پیدائش لاہور کے ایک غزل گائیک خاندان میں ہوئی تھی۔ میں نے گریجویشن پنجاب یونیورسٹی سے کیا تھا۔ پھر لغاری فیملی کو تو آپ جانتی ہیں۔ اس جاگیردار گھرانے سے میرا تعلق جڑ گیا اور پھر حیدر کے ساتھ ہی میں نے شوبز میں قدم رکھا۔"
اس نے اٹکتے ہوئے اپنا تعارف مختصر طور پر کاٹ چھانٹ کر بیان کردیا۔
"بچے کتنے ہیں آپ کے؟" اس سوال پر سونیا کی آنکھوں میں چمک آگئی۔
"تین بچے ہیں ہمارے۔ بڑا بیٹا جواد انجینئر ہے اور امریکا میں سیٹل ہے۔ اس کی بھی ایک بیٹی ہے۔ دوسرے نمبر پر اسد ہے، جو ایم بی اے کے بعد آسٹریلیا کی فرم میں جاب کر رہا ہے اور تیسرے نمبر پر سیمینہ ہے۔ انٹر کے بعد میں نے اس کی شادی کردی تھی وہ دبئی میں ہے۔" اس کے چہرے پر ممتا دمک رہی تھی۔
"اتنی کم عمری میں بچوں کی شادی کردی، وہ بھی اتنی دور؟"
"ساری زندگی دور ہی تو رہے میرے بچے۔ پہلے حیدر نے انہیں مجھ سے دور کانونٹ میں رکھا، کیونکہ وہ مجھے صرف نوٹوں کی مشین بنانا چاہتا تھا اور اب میں نے انہیں دل پر پتھر رکھ کر دور بھیج دیا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اپنی ماں ——— اور باپ کے گھناؤنے روپ کو پہچانیں۔" اس کی سوچوں نے پھر دہائی دی۔
"بس! بچوں کے رجحانات تھے ——— اور بیٹی کا رشتہ اچھی جگہ سے آگیا تھا۔" حیدر نے اس کی طویل چپ کی وجہ سے خود ہی جواب دیا۔
"فضول خرچ کون ہے زیادہ، یہ یا آپ؟"
"آپ تو جانتی ہیں لیڈیز کے ہی خرچے زیادہ ہیں جناب! نیو ڈریسز، میک اپ، جیولری۔" حیدر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔
"اور ان فضول خرچیوں کے تاوان میں ایک ایک لمحہ ہر رات کس طرح میں اپنے روح اور جسم کو رہن رکھتی ہوں، اس کا کیا حساب۔" سونیا کے اندر کی عورت کرلائی۔
"آج کل آپ نظر نہیں آرہے اسکرین پر حیدر صاحب! اس کی کیا وجہ ہے؟"
اس سوال پر حیدر کے لبوں کی مسکراہٹ واضح طور پر پھیکی پڑی تھی۔
"نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دو فلمیں ابھی انڈر پروڈکشن ہیں۔ کچھ ٹی وی ڈرامے ہیں اور ویسے بھی میں اب پروڈکشن کی فیلڈ میں آنے کا سوچ رہا ہوں۔"
"کوئی پیغام جو آپ قارئین کو دینا چاہیں؟"

دیے کو چھوڑ نہ دینا کہیں تم چاہ خاور میں
یہ تن تو تن ہے، من کو بھی جلا کر خاک کرتا ہے

نفس نامی الاؤ، خواہشوں کے ناگ کی صورت
بدن کو نیلا کرتا ہے، دلوں کو راکھ کرتا ہے

سونیا نے بڑے گداز لہجے میں شعر پڑھے۔
"بہت شکریہ! آپ لوگوں کا۔ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ ہمیں دیا۔" ماہین سعید اپنی ٹیم کے ہمراہ چلی گئیں۔
اگلے ماہ اسے کوریئر سے رسالے کی کاپی موصول ہوئی۔ اندرونی صفحات پر حیدر اور سونیا کی مسکراتی تصویر آویزاں تھی اور پہلی ہی سطر میں لکھا تھا۔
"شوبز کی دنیا کی ——— کامیاب ترین جوڑی۔"
"کامیاب ترین۔" سونیا کے لبوں سے بے آواز نکلا اور پھر وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگی۔

☆

فرحت اشتیاق

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وٹوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا ۔لیزا محمود خالد کے پاس رہی۔ وٹوریا نے ارب پتی بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وٹوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نینی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسد سے کروا دیتے

مکمل ناول

ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پروپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین، سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر کبھی کبھی آمنہ شہریار، سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کرکے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کرکے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

ام مریم، زین سے منگنی ختم کرکے واپس چلی جاتی ہے۔ سکندر دوسرے دن دوبارہ گھر آتا ہے مگر شہریار خان اسے دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔ اموجان رو رو کر التجا کرتی ہیں کہ سکندر کو معاف کر دیں، وہ بہت چھوٹا ہے مگر شہریار خان ان کی ایک نہیں سنتے اور سکندر کو اپنی تمام جائیداد سے عاق کرکے، ہر رشتہ توڑ کر اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ زین غصے سے کھڑا دیکھتا رہتا ہے۔

سکندر روما چلا جاتا ہے لیزا کو ہر بات پر یاد کرتا ہے۔

سیم یعنی ام مریم اور لیزا یعنی کلثوم، محمود خالد کی بیٹیاں ہیں۔ ام مریم بچپن سے ہی بہت ضدی اور بدتمیز تھی۔ اپنے شوہر ہاشم سے بھی اس کا رویہ بہت خراب ہے، ہاشم اسے منانے کے ہر وقت جتن کرتا رہتا ہے۔

سکندر روما آنے کے بعد غیر ارادی طور پر لیزا جیسے معمولات اختیار کرنے لگتا ہے۔ فلورنس میں لیزا کی نمائش پر پہنچتا ہے تو لیزا بہت حیران رہ جاتی ہے۔ بہت خوش ہو کر وہ اپنی ایگزیبیشن کا پہلا دن گزارتی ہے۔ شام کو وہ سکندر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتی ہے تو سکندر بہت مجبور ہو کر اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا مردانہ وقار مضروب ہو چکا ہے۔ وہ ندامت محسوس کرتا ہے اور ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ اپنا ماضی یاد کرتا ہے کہ کس طرح اس کے بھائی کی منگیتر ام مریم نے ایک لڑکی ہوتے ہوئے، اسے رجھانے کی کوشش کی اور جب وہ اس کی باتوں میں نہ آیا تو انتہائی گھٹیا الزام لگا کر اسے اپنے گھر والوں کی نظروں میں ذلیل کروایا۔

ام مریم ہاشم کی بیوی کو طلاق دلوا کر اس سے شادی کرتی ہے مگر بڑی ہوشیاری سے یہ بات چھپاتی ہے۔

۱۳
تیرہویں اور آخری قسط

یہ شام کا وقت تھا اور وہ لوگوں کے ہجوم میں گم ساحل سمندر پر تھا۔ اسے اس وقت دنیا کے کسی بھی فرد سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے انتظار تھا تو لیزا کا۔ سے انتظار تھا تو لیزا کی فون کال کا۔

”سکندر! تم کہاں ہو؟ میں تمہارے ہوٹل پہنچی ہوئی ہوں۔ تم اس وقت کہاں ہو۔ میں تمہارے پاس آرہی ہوں۔“

اس کے موبائل پر کالز آ ضرور رہی تھیں، مگر وہ کالز لیزا کی نہیں تھیں۔ ایک ضد تھی اس کے اندر۔ اسے لیزا سے بات کرنی تھی، صرف — لیزا سے۔ اسے لیزا کی کال ریسیو کرنی تھی۔ اسے باقی کسی سے بات نہیں کرنی۔ لیزا تو سب لوگوں جیسی نہیں ہے ناں۔ وہ تو اسے بہت چاہتی ہے۔ وہ اس کے لیے پینٹنگ، روما اور سب کچھ چھوڑ سکتی ہے۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس نے کہا تھا، وہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ چاہے وہ اسے دکھ دے گا، مایوس کرے گا، وہ تب بھی اس کا ساتھ نبھائے گی۔ پھر آج وہ اپنے کہے لفظوں کو کیوں نبھا نہیں رہی تھی۔

اس کا دل شدت سے لیزا کی فون کال کا منتظر تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، اس کے اندر مایوسیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس کے دل اور دماغ میں جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔ دل کہہ رہا تھا، وہ آئے گی وہ دوسرے لوگوں جیسی نہیں۔ وہ اس کے خونی رشتوں جیسی نہیں وہ اس سے بے تحاشا محبت کرتی ہے۔ وہ اس پر بھروسا کرے گی۔

”سکندر! میں تم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتی ہوں، جتنی پہلے کرتی تھی۔ سیم نے جو کچھ کہا، میں اس کے کہے کسی ایک بھی لفظ کا یقین نہیں کرتی۔ میں صرف تمہارا یقین کرتی ہوں سکندر!“

اسے شدت سے انتظار تھا، لیزا کے لبوں سے ان جملوں کو سننے کا۔ وہ اسے فون کرے اور یہ بات کہے۔ مگر اس کا دماغ اسے بتا رہا تھا۔ لیزا آزمائش کی اس گھڑی میں اس کے ساتھ نہیں کھڑی ہوگی۔ جس پل اسے اس کی محبت کا یقین شدت سے چاہیے، اس پل وہ اس کے ساتھ نہیں، بلکہ اس کے مخالف کھڑے لوگوں کے ساتھ کھڑی ہوگی۔ وہ جو اس پر سنگ باری کر رہے ہیں، جنہوں نے اسے زندہ درگور کیا ہے۔ لیزا ان ہی کے ساتھ کھڑی ہوگی اس کے ساتھ نہیں۔ پر لیزا تو ایسی نہیں ہے۔ وہ اسے جانتی ہے۔ وہ اسے سمجھتی ہے۔ وہ تو زندگی ہے ناں سکندر شہریار کی اور زندگی یوں تو ساتھ نہیں چھوڑا کرتی۔

ایک گھنٹہ، دو گھنٹے، تین گھنٹے۔

گھڑی میں گزرتا ہر اگلا لمحہ اسے یقین دلا رہا تھا، لیزا اس کے ساتھ نہیں۔ وہ اس کے مخالف کھڑے لوگوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ لیزا کے ہاتھوں میں بھی ان تمام لوگوں کی طرح سنگ ہیں۔ اسے آنا ہوتا تو وہ کب کی آ چکی ہوتی اسے فون کرنا ہوتا تو وہ کب کا اسے فون کر چکی ہوتی۔

کئی گھنٹے سمندر پر گزار کر وہ وہاں سے پلٹا تھا، بہت مایوس اور ناکام۔ درد سے بھری ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی تھی۔

”تم بھی دنیا کے باقی تمام لوگوں جیسی ہی ثابت ہوئیں۔ تمہاری محبت کی کمزوری پر روؤں یا اپنی حماقتوں پر جو چند روزہ التفات کو زندگی بھر کا ساتھ، ناقابل شکست اعتبار اور کبھی نہ ختم ہونے والی محبت سمجھ بیٹھا تھا۔“

وہ واپس اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر درد اور غم پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تپتی سی تلخی بھری تھی۔

”بار بار ٹھوکر کھاتا ہوں، پھر بھی نہیں سمجھتا کہ محبت میرے لیے نہیں، خوشی میرے لیے نہیں، ہنسی میرے لیے نہیں، زندگی میرے لیے نہیں، لیزا میرے لیے نہیں۔“

اس کے اندر پھیلتی مایوسیاں غصے اور تلخی میں بدل رہی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ لیزا کے سامنے جائے اور اس سے لڑے۔

”نبھا نہیں سکتی تھیں تو محبت کی کیوں تھی تم نے مجھ سے؟ اچھا بھلا زندگی کو گھسیٹ رہا تھا ناں۔ مگر اب

۔۔۔ اب کیسے زندہ رہوں گا؟ بتاؤ! مجھے اب تمہارے بغیر میں کس طرح زندہ رہوں گا؟"

وہ ٹوٹ کر بکھر رہا تھا' ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ عمر بھر کی سنگ باری کے بعد کیا اب بھی ریزہ ریزہ ہو کر نہ بکھرتا؟ اس کی زندگی کی آخری امید اور آخری خواب بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

"دوسروں کے دیے زخموں کے باوجود میں زندہ رہا تھا۔ مگر تمہارے دیے بے اعتباری کے زخم کے بعد اب میں زندہ کس طرح رہوں گا؟"

ایک پل اس کا دل چاہا' وہ ننھے بچوں کی طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روئے۔ چلا چلا کر اسے بیلا (Bella) کہہ کہہ کر پکارے۔ وہ بہت خوش ہوتی ہے ناں! جب وہ اسے Bella کہتا ہے۔ اسے اس کا یہ کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ اس لفظ کی کشش سے بندھی اس کے پاس چلی آئے گی۔

اگلے پل وہ تلخی سے خود پر ہنس رہا تھا۔ خود اپنا مذاق اڑا رہا تھا۔ جسے اب بھی نہیں آتا' وہ اس کا لاحاصل انتظار کرنا چاہتا ہے تو شوق سے کرے۔ کل خونی رشتوں نے اس کا اعتبار نہیں کیا تھا' آج زندگی نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کردی تھی۔ اسے کہاں جانا ہے' اس نے جگہ بتادی تھی۔ ڈرائیور سے کچھ دیر انتظار کرنے کا کہہ کر وہ اندر چلا گیا تھا۔ وہ واپس گاڑی میں آکر بیٹھا تو اس نے ڈرائیور سے اپنے ہوٹل چلنے کے لیے کہا۔ آج کی باقی بچی شام اور تمام رات اسے اسی شہر میں گزارنی تھی کہ اسے دوہا کے لیے کل صبح کی فلائٹ میں سیٹ مل سکی تھی۔

اسے آج کی سیٹ مل جاتی تو وہ آج اور ابھی اس شہر سے نکل جاتا۔ اپنے ہوٹل کی طرف جاتا' وہ شہر کی رونقوں کو تلخی سے دیکھ رہا تھا۔ نکال لے گا' وہ خود کو زندگی کی تمام رونقوں سے باہر۔ کل تو وہ دوہا جارہا ہے مگر اب وہاں بھی نہیں ٹھہرے گا۔ وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ کسی انجان جگہ پر' جہاں اسے کوئی نہ جانتا ہو۔ ملٹی نیشنل کمپنی اور لیگل ایڈوائزر کی جاب اسے نہیں چاہیے۔ جب یہ تعلیم یہ موجودہ اسٹیٹس اس کے ماضی سے اس کا پیچھا نہیں چھڑا سکتا تو اس تماشے کی ضرورت کیا ہے۔ وہ پھر سے بنجارہ بن جائے گا۔ وہ پھر سے اسمارٹ اسٹریٹ جیسی بن جائے گا۔ تلخی اور نفرت سے اپنے مستقبل کے لیے یہ سب سوچ لینے کے باوجود اس کے اندر محبت شدت سے رو رہی تھی۔ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

وہ لیگل ایڈوائزر سے واپس بنجارہ بن جائے' جیسی بن جائے یا جو کچھ بھی' مگر وہ اس کی محبت اپنے دل سے مرتے دم تک نہیں نکال سکتا۔ کیسی بات تھی محبت کے بڑے بڑے دعوے لیزا نے کیے تھے' اس نے نہیں۔ اس نے تو اس کی محبت قبول ہی بڑی مشکلوں سے کی تھی مگر آج آکاس بیل کی طرح وہ محبت اس کے وجود سے لپٹی تھی۔ اس کی سانسوں' اس کی دھڑکنوں میں بسی تھی۔ جس روز سانس رکنی تھی اس روز ہی یہ محبت اس کے وجود کا ساتھ چھوڑ سکتی تھی اس سے پہلے تو ہرگز نہیں۔

گاڑی اس کے ہوٹل کے سامنے آکر رک چکی تھی۔ وہ دکھ اور کرب سے ہوٹل کی عمارت کو دیکھ رہا تھا۔

تین روز پہلے وہ اس ہوٹل میں کتنی خوشیوں اور امنگوں کے ساتھ آکر ٹھہرا تھا۔ آج وہ مایوس اور شکست خوردہ اس میں واپس قدم رکھ رہا تھا۔ سکندر شہریار کا وجدان اسے ٹھیک بتاتا تھا' اس کی زندگی میں کبھی بھی کچھ بھی اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی زندگی کی نحوست نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ساری دنیا کی عورتوں میں لیزا محمود کی بہن کون نکلی تھی وہ بدکردار لڑکی؟ یہ اس کی زندگی کی نحوست ہی تو تھی۔

وہ انہونی ہو گئی تھی جس کا خوف اسے لیزا کی محبت قبول کرنے کے پہلے لمحے سے ڈراتا تھا۔ لیزا محمود اسے واقعی کبھی بھی نہیں ملنے والی تھی۔ اس کی بیلا اس کے لیے نہیں تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ روئے۔ محبت کیا ایسی بے بس کردینے والی چیز ہے کہ وہ بتیس سال کا مضبوط اور توانا مرد بلک بلک کر رونا چاہتا تھا۔

"کیوں اعتبار نہیں کیا تم نے میرا؟ کیوں بیلا!" وہ کھڑکی کھول کر کھڑا ہوگیا۔

جب سے وہ زندگی میں آئی تھی' اس کے خوف ناک خوابوں اور سروائیکل پین نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر آج خوابوں سے بھی بدترین سچائی جاننے کے بعد اسے پھر سے سروائیکل پین ہونے لگا تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے سے درد کی شدید لہر اٹھ رہی تھی اور اس کے بازوؤں تک پھیل رہی تھی۔ بارہ سال پہلے زندگی ختم نہیں کی تھی۔ اسے گھسیٹتا رہا تھا' پر آج واقعی مر جانے کو دل کر رہا تھا۔ وہ محبتوں کے دعوے کرتی تھی اور وہ اس سے سچی محبت کر بیٹھا۔ اسے اپنی زندگی مان بیٹھا۔

وہ اس کے لیے سمورائی کی طرح بہادر تھا۔ وہ اسے پانی کی طرح طاقت ور اور گہرا لگتا تھا۔ وہ اسے اپالو سے زیادہ حسین لگتا تھا۔ اپنے دل کے بند دروازے کی چابی اس نے صرف سکندر شہریار کو دی تھی۔ وہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑ سکتی تھی۔

وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی سوائے اعتبار کے۔ وہ اس پر اعتبار نہیں کرتی تھی۔ باقی سب کچھ کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے گھر واپس آکر آمنہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہی کہا تھا کہ سکندر اپنے ہوٹل میں ہے مگر کسی سے بھی فی الحال ملنا نہیں چاہ رہا۔ مگر وہ ماں تھیں ناں۔ ان کے دل کو خبر نہیں ہوتی تو کس کو ہوتی؟

مسلسل روئے جا رہی تھیں۔

"میری سکندر سے بات کرادیں شہریار! میرا دل گھبرا رہا ہے۔ نجانے کس حال میں ہے میرا بچہ۔ میں اسے فون کروں گی۔ وہ میرا فون ضرور اٹھائے گا۔ بہت پیار کرتا ہے وہ مجھ سے۔" وہ روتے ہوئے شہریار خان کی منت کر رہی تھیں۔

"آمنہ! وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر میں تمہاری اس سے بات کرادوں گا۔"

وہ باپ کی بے بسی دیکھ رہا تھا۔ زار و قطار روتی آمنہ ان سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں۔ وہ مسلسل سکندر کا موبائل نمبر ملا رہا تھا۔ کبھی اپنے فون سے' کبھی ماں کے فون سے' کبھی باپ کے فون سے' کبھی گھر کے لینڈ لائن نمبر سے۔

نوریہ بھی وہاں آگئی تھی۔ وہ بھی آمنہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ ہوا کیا تھا' یہ اسے پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اسے صرف اتنا پتا تھا کہ آج آمنہ لیزا کے گھر اس کا رشتہ مانگنے گئی تھیں۔ وہاں کیا ہوا' یہ نوریہ کو نہیں پتا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ نہ اس سے کچھ پوچھ پا رہی تھی نہ شہریار خان سے۔

جب نوریہ سے سامنا ہوگا' اسے سچائی پتا چلے گی تو وہ اس سے کیا کہے گا؟ یہ کہ بارہ سال قبل اس نے ایک بدکردار لڑکی سے محبت کی تھی اور کل شام سے پہلے تک اس محبت کو دل سے لگائے بیٹھا تھا؟ وہ کس کس کو جواب دہ تھا۔۔۔ کس کس کو۔

"پاپا! امو جان کو بخار ہو رہا ہے۔"

نوریہ جو آمنہ کے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔ چائے پلانے کے لیے ان کے پاس بیٹھی تو ان کی پیشانی چھوتے ہوئے فوراً بولی۔ فون ملاتا زین گھبرا کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ابھی بھی زار و قطار رو رہی تھیں۔ انہوں نے چائے پینے سے انکار کردیا۔

"امو جان! چائے پی کر دوا لے لیں۔ آپ کو بخار ہو رہا ہے۔" وہ بے اختیار ماں کے پاس آیا۔ ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ ماں کے پیروں پر تھے۔

"جب تک میں سکندر سے نہیں مل لیتی' کچھ نہیں کھاؤں گی۔ مجھے میرے بیٹے سے ملوادیں۔ آپ لوگوں کی سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آرہی؟ ماں کا دل غلط نہیں کہتا۔ ماں کا دل کبھی غلط نہیں کہتا۔ وہ کھو

جائے گا مجھ سے۔ وہ ایک بار پھر کھو جائے گا مجھ سے۔"

انہوں نے غصے سے چلاتے ہوئے بات شروع کی تھی مگر جملے کے آخر میں آکر ان کی آواز آنسوؤں اور آہوں میں بدل گئی۔

"سکندر! فون اٹھالو۔ امو جان کی خاطر ہی فون اٹھالو۔" اس کے دل نے بڑی شدتوں سے بھائی کو پکارا تھا۔ سکندر کو کال ملانے کے ساتھ ساتھ وہ آج رات میں اور کل دن بھر میں دوہا اور امریکا جانے والی فلائٹس کا بھی پتا کر رہا تھا۔ فون بھی کر رہا تھا اور لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ کے ذریعے بھی معلومات لے رہا تھا فلائٹس کے متعلق۔

لیپ ٹاپ پر وہ کل صبح دوہا جانے والی ایک فلائٹ کے بارے میں معلومات لے رہا تھا اور ساتھ ہی آمنہ کے موبائل سے ایک مرتبہ پھر سکندر کو کال ملا رہا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے دوسری جانب سکندر کی آواز سنی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے بولنے کے لیے لب کھولنے چاہے۔ مگر اس کی زبان گونگی ہو گئی۔ وہ اس سے کیا کہے اور کیسے؟ وہ فون ہاتھ میں لے کر دوڑتا ہوا باپ کے پاس آیا۔ اس نے فون انہیں تھمایا۔

"سکندر!" اس نے دبی آواز میں کہا۔ آمنہ نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔ آمنہ نے شہریار خان کے ہاتھوں سے لپک کر فون لینا چاہا مگر وہ چاہتا تھا اس کے پاپا بات کریں۔ امو جان روتی رہیں گی فون پر۔ شہریار خان فوراً" بات کر کے یہ پتا لگالیں گے کہ وہ ہے کہاں۔ شہریار خان بھی شاید یہی چاہتے تھے' اس لیے بجائے آمنہ کو فون دینے کے وہ بیڈ پر سے اٹھ گئے۔ آمنہ فوراً" اٹھنا چاہ رہی تھیں۔ اس نے ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے شانے کے گرد ہاتھ رکھا۔ وہ آنکھوں میں محبت لیے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

"امو جان! میں سکندر کو آپ کے پاس واپس لاؤں گا' وعدہ کر رہا ہوں۔ آپ اس وقت پاپا کو اس سے بات کرنے دیں۔"

اس نے اپنی روتی ہوئی بیمار ماں کو گلے سے لگالیا۔ چند گھنٹوں میں وہ شدید بیمار نظر آنے لگی تھیں۔ وہ بخار میں پھنک رہی تھیں۔

"سکندر بیٹا! تم کہاں پر ہو؟"

شہریار خان گھبرائے ہوئے سے انداز میں فوراً" بولے تھے' جیسے انہیں خوف تھا کہ کہیں سکندر فون بند نہ کر دے۔

"میں تمہارے پاس آرہا ہوں بیٹا! میرا انتظار کرنا۔ پلیز! میرا انتظار کرنا۔"

اس نے اپنے باپ کے چہرے پر سکندر کے پھر کھو نہ جانے کا خوف اور پریشانی دیکھی۔ انہوں نے مزید کچھ کہے بغیر فوراً" ہی فون بند کر دیا تھا۔

"زین! آؤ میرے ساتھ۔ سکندر اپنے ہوٹل میں ہے۔"

وہ بولتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکلے۔ وہ نویرہ کو یہ اشارہ کرتا کہ وہ امو جان کا خیال رکھے' باپ کے پیچھے بھاگا تھا۔

☼ ☼ ☼
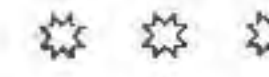
ایک بار پھر وہ دونوں ہوٹل جا رہے تھے۔ وہ گاڑی چلا رہا تھا۔ شہریار خان اس کے برابر میں بیٹھے تھے۔ بہت پریشان' بہت فکر مند۔ گاڑی چلاتا وہ گاہے گاہے باپ کی سمت دیکھ رہا تھا۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر وہ بہت بوڑھے اور کمزور نظر آنے لگے تھے۔ وہ باپ کی آنکھوں سے چھلکتا درد اور خوف پوری شدتوں سے محسوس کر رہا تھا۔

رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ جب وہ ہوٹل پہنچے۔ اس کے قدم سکندر کے کمرے کی جانب اٹھ نہیں پا رہے تھے۔ وہ اس کا سامنا کیسے کرے گا۔ اس کے کانوں میں خود اپنی آوازیں گونج رہی تھیں۔

"پاپا! میں آج یا تو اس کی جان لے لوں گا یا اپنی جان دے دوں گا۔ میں اس ذلیل' بے غیرت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

چلتے چلتے وہ رک گیا تھا۔ اس کی نظریں اپنے دونوں ہاتھوں پر تھیں۔ ان ہاتھوں سے اس نے بڑے بھائی کو مارا تھا اور وہ جواب میں خاموشی سے صرف خود کو بچاتا رہا تھا۔ اس نے بدلے میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔

"تمہارا انتخاب درست نہیں ہے زین! کیسے سمجھاؤں تمہیں ۔۔۔ مریم کسی بھی طرح تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔"

بھائی کی محبت بھری صدائیں تھیں اور جواب میں اس کی نفرت سے پھنکارتی آوازیں۔

شہریار خان لفٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ انہوں نے مڑ کر اسے تعجب سے دیکھا۔

"کیا ہوا زین! جلدی آؤ۔"

باپ کے پکارنے پر وہ چونکا۔ وہ فوراً" تیزی سے چلتا ان کے پیچھے لفٹ میں گھسا تھا۔ لفٹ سے نکل کر وہ دونوں سکندر کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سکندر سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ مگر کیسے مانگ پائے گا؟ کسی کی پوری زندگی تباہ کر دو اور پھر معافی مانگ لو۔ کیا آج اس کی معافی سکندر کو اس کی زندگی کے گزرے قیمتی ترین بارہ سال لوٹا سکتی ہے ۔۔۔؟ اس کے خواب لوٹا سکتی ہے؟ آج اس کی معافی کھوکھلے لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگی۔

سکندر نے دستک پر دروازہ کھولا۔

وہ اسے شہریار خان کے ساتھ وہاں دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے ان دونوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ اس کا چہرہ ایسا بے تاثر اور سرد سا تھا' جیسے وہ خوش ہونے' دکھی ہونے' حیران ہونے یا کسی بھی طرح کے جذبات کو محسوس کرنا ہی بھول چکا تھا۔

زین شہریار اس کے پاس آیا تھا' وہ حیران نہیں تھا۔ زین شہریار ساری زندگی اس کے پاس نہ آتا۔ اسے غم نہیں ہوتا۔

اندر داخل ہوتے ہی زین کا دل دھک سے رہ گیا۔ بیڈ پر سکندر کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ ارد گرد اس کے کپڑے اور دیگر سامان یوں بکھرا تھا گویا وہ ان لوگوں کے آنے سے قبل اپنی پیکنگ کا کام کر رہا تھا۔ اس نے شہریار خان کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اندر آتے ہی سوٹ کیس دیکھ چکے تھے۔ ان کے چہرے پر بے تحاشا خوف آگیا تھا۔

"تم کہاں جا رہے ہو سکندر؟" انہوں نے پریشانی سے فوراً" پوچھا۔

"دوہا ۔۔۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے دوہا واپس جا رہا ہوں۔ آفس میں تھوڑا ارجنٹ کام آگیا ہے؟"

وہ بے حد سنجیدگی سے انتہائی غیر جذباتی انداز میں بولا۔ جیسے آج جو کچھ ہوا تھا' اس سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ جیسے برسوں سے اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' اس سے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچ رہی ہے۔

"تم واپس جا رہے ہو؟" شہریار خان کا لہجہ ان کی پریشانی' خوف اور دکھ کو ظاہر کر رہا تھا۔ اب کی بار یہ بیٹا دور گیا تو پھر کبھی نہیں ملے گا۔ ان کے چہرے پر خوف چھایا ہوا تھا۔ وہ تینوں کھڑے ہوئے تھے۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ سکندر اسے بالکل بھی نہیں دیکھ رہا۔ بے تاثر اور غیر جذباتی سے انداز میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھے' وہ صرف باپ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف ان ہی سے مخاطب تھا۔

"اتنی جلدی مت جاؤ سکندر! میں سب ٹھیک کر رہا ہوں۔ ایک دن تو اور رک جاؤ۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔"

شہریار خان بہت آہستہ آواز میں شکستہ لہجے میں بولے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ان کی تمام تر توانائیاں سلب ہو گئی تھیں۔ وہ گھر پر جس مضبوطی سے بول رہے تھے' جس مضبوطی سے انہوں نے محمود خالد سے فون پر بات کی تھی اور پھر جس امید کے ساتھ یہاں آئے تھے سب کچھ یک لخت ہی ناامیدی اور مایوسی میں ڈھل گیا تھا۔ سکندر کو جانے کی تیاری کرتا دیکھ کر جیسے ان کے اندر ساری امیدیں دم توڑنے لگی تھیں۔

"آفس میں ضروری کام نہ ہوتا تو رک جاتا۔" سکندر اسی غیر جذباتی انداز میں بولا تھا۔ جیسے شہریار

خان کے جملے کا مفہوم اس نے سمجھا ہی نہیں تھا۔ اسے جیسے اب کسی بھی چیز کے ٹھیک ہو جانے یا مکمل طور پر بگڑ جانے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ ان سب سے اتنا دور جا چکا تھا کہ اب اپنی تکلیف اور دکھ کا ان کے سامنے اظہار تک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ آج جو کچھ لیزا کے گھر پر ہوا' اس نے اسے توڑ پھوڑ کر نہیں رکھ دیا ہو گا؟ اپنے اندر کی شکست و ریخت وہ ان دونوں سے چھپا رہا تھا اور وہ ٹھیک ہی تو کر رہا تھا' جن کی وجہ سے اس نے سب کچھ کھویا تھا' کیا ان ہی کے گلے لگ کر اس سب کچھ — کھو جانے کا ماتم کرتا؟ آنسو بہاتا؟

وہ سکندر کے سرد اور سپاٹ چہرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آئی نمی کے سبب سکندر اسے دھندلا نظر آرہا تھا۔ اس کا یہ بھائی ایسا تو نہ تھا۔ کبھی یہ بہت محبت کرنے والا' محبتوں کا بہت مان رکھنے والا' جن سے محبت کرتا تھا' ان کی بہت پروا کرنے والا تھا۔

اس کی نفرتوں کو سہنے کے باوجود بھی وہ آخری وقت تک اسے ام مریم کی مکاریوں سے بچانے کی کوششیں کرتا رہا تھا' محض اس کی محبت میں۔ آج سکندر کو خود سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑا دیکھ کر اسے اپنا وہ محبتوں سے سرشار پیارا بھائی بہت یاد آرہا تھا۔

"شکر! تم نے قسم تو توڑی۔ میرے پاس آئے تو سہی۔ مجھ سے بات کرنا کیوں چھوڑ دیا ہے تم نے زین!" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی تھیں۔

"امو جان سے کہیے گا پریشان نہ ہوں۔ میں جانے سے پہلے ان سے فون پر بات کر کے جاؤں گا۔ صبح آٹھ بجے ہے میری فلائٹ۔"

وہ اسی غیر جذباتی اور فاصلہ لیے انداز میں شہریار خان سے مزید بولا تھا۔ وہ موجودہ طوفان' جس میں اس کی زندگی گھری تھی' اس پر وہ ان دونوں سے ایک لفظ بھی بولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے بیٹا!" شہریار خان نے سکندر کو دکھ سے دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔

"میری ہمدردی کی آڑ میں آئندہ اگر تم نے لیزا یا امو جان سے ام مریم اور میرے رشتے کے خلاف کچھ کہا تو میں ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔"

اس کا دل درد سے پھٹنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔ کوئی اپنے خون' اپنے [illegible] جائے سے ایسی نفرت بھی کر سکتا ہے؟

"زین! میں نے تم سے کہا تھا ناں' یہ لڑکی تمہارے لیے ٹھیک نہیں۔ یہ ایک بدکردار لڑکی ہے۔"

اس کا بھائی شرم اور غیرت کے سبب پوری بات واضح لفظوں میں اسے بتا نہیں پا رہا تھا۔ مگر وہ اسے اس بدکردار لڑکی سے بچا لینا چاہتا تھا اور وہ بجائے رک کر بھائی کی بات سننے کے' اس کی آنکھوں میں جھانکنے کے اسے مارنے لگا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی پر ہاتھ اٹھا رہا تھا۔ اسے بری طرح مار رہا تھا اور وہ صرف خود کو بچا رہا تھا۔ جواب میں اسے مار نہیں رہا تھا۔ وہ چھوٹے بھائی سے پٹ رہا تھا پر جواب میں اس پر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا۔

وہ یکدم ہی رو پڑا۔ وہ آگے بڑھا اور سکندر کے سامنے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ شہریار خان اور سکندر دونوں اس کی اس حرکت پر حیرت سے ساکت رہ گئے۔

"سکندر! مجھے مارو۔ پلیز! مجھے مارو۔ جیسے میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا تھا' آج تم بھی مجھے اسی طرح مارو۔ مجھے مارو سکندر! میں بھائی کہلانے کے لائق نہیں۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہے کہ تمہیں مجھ جیسا حاسد اور کم ظرف بھائی ملا۔"

وہ سکندر کے پاؤں پکڑ کر زارو قطار رو رہا تھا۔ ایک پل کی حیرانی کے بعد سکندر نے فوراً" پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے پاؤں چھڑانا چاہتا تھا' مگر وہ اسے ایسا کرنے نہیں دے رہا تھا۔

"زین! اٹھو۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟" سکندر اس کی طرف جھکا۔ اس نے پوری قوت استعمال کر کے اس کے ہاتھ اپنے پیروں پر سے ہٹائے اور اسے بازوؤں سے مضبوطی سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ

سکندر کے سامنے کھڑا زارو قطار رو رہا تھا۔ شہریار خان ان دونوں کے نزدیک کھڑے تھے۔ مگر یوں جیسے ان میں کچھ بھی بولنے کی سکت نہ ہو۔

"یہ کیا بچپنا ہے زین؟" اس نے روتے ہوئے سکندر کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ ناراضی تھی' نہ غصہ اور نہ ہی نفرت۔ اس کی آنکھیں فقط بے تاثر تھیں۔

"مجھ حاسد اور کم ظرف کو معاف کر دو سکندر! ساری زندگی تم سے مقابلہ کرنے کے سوا میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرے حسد نے تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا۔ تمہارے خواب' تمہاری خوشیاں' تمہارا کیریئر' تمہارا گھر...."

"تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے زین! میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہوں۔ جو کچھ ہوا' وہ میرے نصیب میں لکھا تھا۔"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ وہ ان سب سے اتنے فاصلے پر جا چکا تھا کہ وہ اس کی معافی بھی سننے کو آمادہ نہیں تھا۔ وہ نہ جذباتی ہوا تھا' نہ اس کی آنکھوں میں نمی آئی تھی' نہ آواز بھرائی تھی' نہ لہجہ تلخ یا شیریں ہوا تھا۔ وہ اسی بہت فاصلہ لیے ہوئے سپاٹ سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کا بھائی نہیں تھا' ایک انجان شخص تھا' جس کے ساتھ ناراضی ظاہر کرنا' غصہ کرنا یا جذباتی ہونا سکندر شہریار پسند نہیں کر رہا تھا۔

شہریار خان کی آنکھوں میں بے بسی اور اشک تھے۔ وہ بھی اسی کی طرح بے بسی اور دکھ سے سکندر کو خود سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑا دیکھ رہے تھے۔ اس نے آستین سے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو صاف کیے۔ لہجے کو ہموار کیا اور سنجیدگی سے بولا۔

"تمہاری زندگی میں سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے سکندر! مگر میں اب کی بار کچھ برا نہیں ہونے دوں گا۔ میں لیزا کو واپس لاؤں گا سکندر!"

سکندر کے غیر جذباتی انداز نے اس کے آنسوؤں کو روک دیا تھا۔ ہاں! اس کا لہجہ رندھا ہوا ضرور تھا۔ سکندر کے بے تاثر چہرے پر یکدم ہی بہت سختی اور کھردرا پن آیا تھا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے زین! تمہیں کسی کو بھی واپس لانے کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے۔ صفائیاں دے کر ملا ساتھ اور وضاحتیں پیش کر کے ملی محبت مجھے ہرگز نہیں چاہیے۔ آپ لوگوں سے میری درخواست ہے' ایسا کچھ مت کیجیے گا۔"

ایسی سختی' ایسا فیصلہ کن انداز' ایسا اٹل لہجہ تھا سکندر کا کہ وہ تو وہ' شہریار خان بھی اسے سمجھانے یا قائل کرنے کی ہمت نہیں کر پائے تھے۔ وہاں مزید رکنا اور کچھ بھی کہنا سننا بے سود تھا۔ سکندر ان سب سے اتنی دوری پر جا چکا تھا کہ ان کی آوازیں اس کے کانوں تک تو ضرور پہنچ رہی تھیں' مگر دل پر دستک نہیں دے سکی تھیں۔ وہ سکندر سے بات کر سکتے ہیں' اسے چھو سکتے ہیں' اسے دیکھ سکتے ہیں' مگر وہ اس کے پاس نہیں جا سکتے۔ وہ ان کے پاس ہوتے ہوئے بھی ان کے پاس نہ تھا۔ وہ معافیوں' شرمندگیوں اور ندامتوں کے اظہار سے بہت پرے جا چکا تھا۔

اس نے دور جانے میں جلدی نہ کی تھی۔ انہوں نے اس تک آنے میں بہت دیر کر دی تھی۔ اتنی دیر کہ اب وہ اپنے دل کے دروازے کسی کے لیے بھی کھولنے کو آمادہ نہیں تھا۔ بہت مایوس' بہت ناکام' بہت دل شکستہ وہ باپ' بیٹا گھر لوٹ آئے۔

☼ ☼ ☼

گھر واپس آتے ہی آمنہ کی حالت دیکھ کر ان دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ بیڈ پر ہوش و حواس سے بیگانہ پڑی تھیں۔ نویرہ انہیں ہوش میں لانے کے جتن کر رہی تھی۔

"سکندر بھائی کو پکارے جا رہی تھیں امو جان۔ کبھی آپ کو اور زین کو آوازیں دے رہی تھیں کہ سکندر کو واپس لے آؤ۔ ان کو پکارتے پکارتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔"

گھبرائی گھبرائی سی نویرہ شہریار خان کو بتا رہی تھی۔ اس نے دوڑ کر ڈاکٹر کو فون کیا۔ آمنہ کا بخار پہلے سے

بھی زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر اس کا خود کو کوڑے مارنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ماں کو بارہ برسوں بعد اس کا بچھڑا ہوا بیٹا واپس ملا تھا اور وہ اس سے پھر کھو جانے والا تھا۔ ڈاکٹر آکر جا چکا تھا۔ آمنہ اب ہوش میں تھیں۔ ٹمپریچر بھی کچھ کم تو ہو گیا تھا، مگر رو مسلسل رہی تھیں۔ وہ کسی کے بھی بہلانے سے چپ نہیں ہو رہی تھیں۔

وہ ابھی اپنے اس بھائی سے مل کر آیا تھا، جس کی زندگی اس نے تباہ کی تھی۔ وہ اب اپنی ماں کو دیکھ رہا تھا جس کے دل کو زخم اس نے لگائے تھے۔ مگر کیا وہ اکیلا مجرم ہے سکندر اور اموجان کا؟ وہ بد کردار لڑکی بھی تو اس کے بھائی اور ماں، باپ کی مجرم ہے۔ اس کے اندر ایک جنون سا بھرنے لگا۔ اس کے بھائی اور ماں کی اس حالت کی ذمہ دار وہ لڑکی بھی تو ہے۔ روتی ہوئی ماں کو دیکھتا وہ یکدم ہی جنونی سے انداز میں کمرے سے نکلا۔ وہ لاؤنج میں شہریار خان کے پاس جا رہا تھا۔

شہریار خان کچھ دیر قبل کمرے سے چلے گئے تھے، یوں جیسے آمنہ کا تڑپ تڑپ کر رونا ان سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد سے وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ ہاشم بھی گھر میں ہی موجود تھا، مگر اس کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں تھا۔ ملازمہ نے اسے بتایا تھا کہ ہاشم نے اس سے پانی منگوایا تھا۔ وہ نیند کی گولی کھا کر سو گیا ہے۔ اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ اسے فی الحال ہاشم کا بالکل بھی خیال نہیں آ رہا تھا۔ وہ کمرے میں لباس تبدیل کرنے گئی تو اس نے ہاشم کو گہری نیند سوتا پایا تھا۔ اس وقت اسے لیزا اور سکندر کا بھی خیال نہیں آ رہا تھا۔ ہاشم سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ در حقیقت اسے اس وقت کوئی بھی یاد نہیں تھا، سوائے اپنے پاپا کے۔

وہ مسلسل اپنے پاپا کو سوچ رہی تھی۔ پاپا اس سے ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ کیا کرے۔ آخر وہ کیا کرے۔

اس نے بے چین ہو کر سر دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ پاپا کو سب کچھ پتا تھا۔ انہیں سب کچھ شروع سے پتا تھا۔ وہ ماضی کی ہر بات جانتے تھے۔ اس کے دل کی بے چینی اور بے کلی پھر بڑھ گئی تھی۔

نہیں، نہیں پاپا اسے چھوڑیں گے تھوڑا ہی۔ وہ بس یونہی خفا ہو گئے ہیں۔ ماں، باپ وقتی طور پر خفا ہو جائیں، مگر اولاد کو چھوڑ تھوڑا ہی دیتے ہیں۔۔۔ اور پاپا اسے، اپنی ام مریم کو کبھی چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ وہ ان سے معافی مانگے گی۔ وہ پاپا کے پاؤں پکڑ لے گی۔ وہ انہیں منا لے گی۔ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگ لے گی۔ جس وقت اس سے وہ تمام غلطیاں ہوئیں، وہ بہت چھوٹی تھی۔ پھر اس وقت پاپا اس سے بہت دور ایک دوسرے ملک میں رہتے تھے۔ اسے صحیح اور غلط سمجھانے والا کوئی نہیں تھا۔ پاپا کا دل خوش کرنے کے لیے وہ لیزا سے بھی معافی مانگ لے گی۔

پاپا کا دل خوش کرنے کے لیے اب کی بار وہ خود کو واقعی تبدیل کر لے گی۔ وہ پوری وفاداری سے ہاشم کی ہو جائے گی۔ وہ اب جلد سے جلد ماں بننے کی کوشش کرے گی۔

پاپا جب اپنے نواسے یا نواسی کو گود میں لیں گے تو ان کا دل خود بخود ہی اس کے لیے بھی گداز ہو جائے گا۔ بس! اب اسے جلد سے جلد ماں بن جانا چاہیے تاکہ پاپا کا دل اس کے لیے پھر سے نرم ہو جائے اور ہاشم کے دل میں بھی اگر آج کی باتوں سے کچھ بدگمانی آئی ہے تو اسے اپنے بچے کی ماں بنتے دیکھ کر وہ اسی طرح اس کا دیوانہ رہے جیسے ابھی ہے۔ وہ سب ٹھیک کر لے گی۔ وہ سب کچھ ٹھیک کر لے گی۔ دوسرے رشتے طعنے دیتے ہیں۔ ماں باپ تھوڑا ہی ایسا کرتے ہیں۔ پاپا اگر سب جانتے بھی ہیں تو کیا ہوا۔ وہ پھر سے کبھی وہ سب دہرائیں گے بھی نہیں۔ وہ اسے اس کی گھر گرہستی سنبھالتا دیکھیں گے۔ اسے اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ ہنسی خوشی رہتے دیکھیں گے تو ساری ناراضی اور کدورت دل سے مٹا دیں گے۔

"بیگم صاحبہ! آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے

ہیں۔" ان کے ملازم نے اسے آکر اطلاع دی۔ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

"کون ہے؟ تم نے نام نہیں پوچھا؟" گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے تعجب سے پوچھا۔ رات کے پونے گیارہ بج رہے تھے۔ اس وقت کون آیا تھا؟

"زین شہریار نام بتا رہے ہیں۔"

"زین شہریار؟" وہ بری طرح حیران ہوئی۔ اگر آج وہ سکندر شہریار سے لیزا کے ہونے والے شوہر کے روپ میں نہ ملی ہوتی تو اس وقت اسے سوچنا پڑتا کہ کون زین شہریار؟ مگر اب اسے معلوم تھا کہ یہ کون تھا۔

"انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ میں آتی ہوں۔"

ملازم سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔ پتا نہیں، وہ کیوں آیا تھا، کیا چاہتا تھا۔ بہرحال اسے زین سے کسی بھی طرح کا کوئی ڈر یا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بغیر کوئی ہچکچاہٹ یا جھجک محسوس کیے ڈرائنگ روم میں آگئی تھی۔

وہ سامنے ہی کھڑا تھا۔ جیسے اس کے آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ بارہ سال بعد سامنا ہو رہا تھا۔ تب وہ انیس سال کا کم عمر لڑکا تھا۔ اب اکتیس سال کا مرد۔

"کیسے ہو زین؟" اندر آنے کے بعد اس نے پرسکون سے انداز میں کہا۔

"بیٹھو!" وہ مسکرا کر بولی۔ زین اسے خونی نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں، تم سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ تمہارے پاپا کے گھر پر آج جو تماشا ہوا، وہ تم نے کیوں کیا تھا؟ ایک بار سکندر کی زندگی اجاڑ دی تھی، کیا وہ کافی نہیں تھا تمہارے لیے؟" وہ تنفر سے بولا۔

"میں نے کسی کی زندگی نہیں اجاڑی۔ تمہارے بھائی نے جو کچھ بارہ سال پہلے میرے ساتھ کیا تھا، میں نے وہ سب کے سامنے بیان کیا ہے۔" وہ نڈر اور بے خوف ہو کر بولی۔

"بکواس بند کرو مریم! کم از کم میرے سامنے اب پارسائی کا ڈھونگ مت کرنا۔ میں تمہاری ساری سچائی جانتا ہوں۔ شرم آتی ہے مجھے خود پر کہ تم جیسی بیچ لڑکی سے میں نے محبت کی تھی اور اس محبت کو اب تک دل سے لگائے بیٹھا تھا۔ سکندر ٹھیک کہتا تھا، تم طوائفوں سے بھی بدتر ہو۔ ان کا بھی شاید کوئی کردار ہوتا ہو گا۔ تمہارا تو کوئی کردار۔۔۔"

"شٹ اپ زین! جسٹ شٹ اپ۔ میرے ہی گھر پر کھڑے ہو کر مجھے گالیاں دینے والے تم ہوتے کون ہو؟" سخت لب و لہجے میں اس نے زین کی بات کاٹی۔

"میں کون ہوں؟ کیا تم نہیں جانتیں میں کون ہوں؟ میں وہ احمق ہوں، جسے تم نے محبت کا نام لے کر خوب بے وقوف بنایا۔ جس نے تمہاری محبت میں پاگل ہو کر اپنے سگے بھائی سے قطع تعلق کر لیا۔ جو وفادار اور محبت کرنے والی بیوی کے ہوتے ہوئے آج تک تمہیں یاد کیا کرتا تھا۔"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ تم اپنے بھائی کو چھوڑ دو۔ نہ ہی میں نے تم سے یہ فرمائش کی تھی کہ میری محبت کو دل سے لگائے رکھنا۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنس کر بولی۔ یہ احمق تو آج بھی احمق ہی تھا۔

"میں تمہاری ساری سچائی جانتا ہوں، تمہیں کیا اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے یا تم اتنی بیچ اور بے شرم ہو کہ۔۔۔"

"زین شہریار! تم میرے لیے نہ تو کل اتنے اہم تھے کہ میں تمہیں سوچتی نہ ہی آج مجھے اس بات سے کوئی فرق پڑ رہا ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہو۔" وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرائی۔ وہ بے خوفی سے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہی تھی۔

"تمہیں کوئی فرق پڑنا بھی نہیں چاہیے ام مریم! جو لڑکی اپنی ماں کا گھر اجاڑ سکتی ہے، اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ پر ناجائز تعلقات قائم کر سکتی ہے، اس کا بچہ اپنی کوکھ میں پال سکتی ہے، اپنے باپ سے

ساری عمر جھوٹ بول سکتی ہے' اپنی بہن کی خوشیوں کو اجاڑ سکتی ہے۔ اسے زین شہریار کو دھوکا دیتے ذرا سی بھی شرمندگی نہیں ہونی چاہیے۔ اسے زین سے منگنی کرنے کے بعد اس کے بڑے بھائی کے ساتھ رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ جو لڑکی اپنے ماں' باپ اور بہن کی خوشیوں کو اجاڑ سکتی ہے' اس کے لیے کسی کی بھی زندگی تباہ کرنا معمولی بات ہونی چاہیے۔" وہ اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بہت تلخی سے بول رہا تھا۔

ایک دم ہی اس نے دیکھا کہ زین ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف کسی کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کی اس طرف پشت تھی۔ وہ بے اختیار مڑی۔

ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہاشم کھڑا تھا۔

ہاشم؟ لیکن ـــ تو سلیپنگ پلز لے کر سو چکا تھا۔ وہ خود کمرے میں دیکھ کر آئی تھی۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ سلیپنگ پلز لینے کے بعد تو وہ اگلی صبح سے پہلے بیدار نہیں ہوا کرتا تھا۔

"ہاشم!" اس کے لبوں سے بے آواز نکلا۔

پیروں کے نیچے سے زمین نکلنا کیا ہوتا ہے' یہ اسے زندگی میں پہلی بار اس لمحے سمجھ میں آیا تھا۔

"ہاشم! یہ سکندر کا چھوٹا بھائی ہے۔ پاپا نے اس کے ساتھ میری منگنی کروائی تھی' جب میں امریکا میں گریجویشن کر رہی تھی۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے جلدی سے کہا۔ بوکھلاہٹ میں اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا بولے۔

زین اور ہاشم ایک دوسرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ہاشم کے چہرے پر وہ کوئی بھی تاثر پڑھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

"مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوئی جیسا روایتی جملہ نہیں بول سکوں گا ہاشم صاحب! کیونکہ مجھے آپ سے مل کر ـــــ ہمدردی ہو رہی ہے۔ آپ پر ترس آ رہا ہے۔ میں نے اس لڑکی کی محبت میں بے وقوف بن کر اس سے صرف منگنی ہی کی تھی' آپ نے تو بے وقوفی کی حد کرتے ہوئے اسے اپنی بیوی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ آپ کو سادہ کہوں یا اعلا ظرف' جو آپ نے ایک بدکردار عورت کو گھر میں بسا رکھا ہے؟ بہرحال! میں چلتا ہوں۔ میں یہاں اسے صرف یہ وارننگ دینے آیا تھا کہ اب کی بار یہ میرے بھائی کی خوشیوں کے راستے میں آئی یا اس نے سکندر اور لیزا کی شادی رکوانے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار ڈالوں گا مگر اس بار میں اسے سکندر کی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گا۔"

زین اسے نفرت اور حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سب کہتے ہی واپس گھوما اور وہ بہت تیز قدموں سے ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ اس نے بوکھلا کر ہاشم کی طرف دیکھا۔

"ہاشم! یہ بکواس کر رہا تھا۔ میں نے اس سے منگنی توڑ دی تھی۔ اس بات کی جلن اور غصہ نکالنے کو یہ یہاں آیا تھا' تاکہ تمہارا دل مجھ سے خراب کروا سکے۔"

وہ تیزی سے ـــ ہاشم کے پاس آئی۔ اس نے ہاشم کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ کوشش کر کے مسکرائی۔ ہر بازی الٹ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ کیا کرے۔

ہاشم نے بغیر کچھ کہے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر سے ہٹایا تھا۔ بڑی سختی کے ساتھ ... اور بغیر کچھ بھی کہے ڈرائنگ روم سے جانے لگا۔

"ہاشم! میری بات سنو۔ تم اس انجان آدمی کا جس سے تم زندگی میں پہلی بار ملے ہو' اعتبار کرو گے میرا نہیں؟ زین مجھ سے جل گیا ہے ہاشم! وہ میری خوش گوار شادی شدہ زندگی کو دیکھ کر جیلس ہو گیا ہے۔"

وہ دوڑتی ہوئی ہاشم کے پیچھے ڈرائنگ روم سے نکلی۔

ہاشم نے رک کر ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کی سخت اور سرد نگاہیں اسے یہ وارننگ دے رہی تھیں کہ خبردار! میرے پیچھے مزید ایک قدم بھی مت آنا۔ وہ ٹھٹک کر ڈر کر اپنی جگہ پر رک گئی تھی۔ ہاشم تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔

اس کے ماتھے پر اور ہتھیلیوں پر پسینہ آ رہا تھا۔ پہلے اس کے پاپا اور اب ہاشم ـــ ایک ہی دن میں یہ کیا ہو گیا تھا؟

زندگی میں پہلی بار وہ خود کو سنگلی میں کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

زندگی میں پہلی بار اسے مات ہو جانے کا خوف لاحق ہوا تھا۔

زندگی میں پہلی بار اسے سب کچھ ہار جانے کا اندیشہ درپیش ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ مریم کے گھر سے نکل گیا۔ فوراً" ہی وہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اس نے ایک جنونی سی کیفیت میں آنا" فانا" مریم کے گھر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سکندر سب کچھ چھوڑ کر واپس جا رہا ہے' اس کی ماں اسے جاتا دیکھ کر تڑپ تڑپ کر رو رہی ہے اور جو وجہ ہے آج کے اس سارے واقعہ اور سارے ہنگامے کی' وہ سکون سے اپنے گھر میں بیٹھی ہے۔

اسے سکندر کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک کرنا ہے مگر اس سے بھی پہلے مریم سے حساب صاف کرنا ہے۔ اسے یہ دھمکی دینی ہے کہ اب وہ سکندر کی زندگی میں آئی' اس کی خوشیوں کے راستے میں آئی تو وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ اس نے اسی وقت شہریار خان سے مریم کے شوہر کے گھر کا پتا معلوم کیا تھا۔ وہ مریم کے شوہر کو سرسری سا جانتے تھے۔ گھر کا پتا ان کے پاس نہیں تھا۔ وہ اسے کہیں سے بھی پتا معلوم کر کے دے سکتے تھے' مگر اس کی آنکھوں میں پھیلا جنون دیکھ کر جیسے وہ چاہتے تھے کہ وہ مریم سے نہ ملے۔

"چھوڑ دو ام مریم کو اس کے حال پر زین! اب اس کے پاس جانے' اسے کچھ کہنے سننے کا کیا فائدہ ہے۔" انہوں نے دکھ بھرے انداز میں اس سے کہا تھا۔

"پاپا! میں اسے چھوڑ دیتا' معاف بھی کر دیتا' اگر بات صرف میری ذات کی ہوتی۔ سکندر کا بہت قرض ہے مجھ پر پاپا! امو جان کا بہت قرض ہے۔ مجھے یہ قرض چکانے ایک بار تو ام مریم کے پاس جانا ہی ہو گا۔"

کیا وہ اپنے بھائی کی زندگی کی بربادی کا' اپنی ماں کی موجودہ حالت کا' اپنے گھر کے بکھرے شیرازے کا اپنے گھر سے روٹھی خوشیوں کا' ان میں سے کسی ایک بھی چیز کا اس بدکردار لڑکی سے حساب نہیں مانگے؟

اس کا اٹل اور دو ٹوک انداز دیکھ کر شہریار خان نے اپنے کسی کاروباری دوست سے ہاشم اسد کا پتا لے کر اسے دیا تھا۔

وہ اس کے پیچھے پورچ تک آئے تھے' اسے یہ سمجھانے کہ وہ جنون میں آ کر کوئی غلط قدم نہ اٹھائے۔

"آپ فکر مت کریں پاپا! زندگی میں پہلی بار میں درست کام کرنے جا رہا ہوں۔ میں وہ کر رہا ہوں جو آپ کے بیٹے اور سکندر کے بھائی کو کرنا چاہیے۔" اس نے ان سے سنجیدگی سے کہا تھا اور گھر سے نکل گیا تھا۔

اور اب جبکہ وہ مریم سے مل آیا تھا۔ اسے بے عزت بھی کیا تھا' اسے دھمکایا بھی تھا' تب اس کے گھر سے نکلنے کے بعد اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔ اس کے گھر جا کر' اسے سامنے کھڑا دیکھ کر اس کے اندر ام مریم کے لیے نفرتیں ہی نفرتیں تھیں۔ وہ اسے خونی نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا' جیسے بس نہ چل رہا ہو اسے جان سے مار ڈالے۔ مگر اب ـــ اس نے گاڑی ایک سڑک کے کنارے پر روک دی۔

بارہ سال پہلے اس نے اس لڑکی سے والہانہ محبت کی تھی۔ پچھلے بارہ برسوں سے وہ اس کی محبت دل کے نہاں خانوں میں چھپائے بیٹھا تھا۔ مگر اس سے مل کر ابھی ابھی اس بات کی تصدیق ہوئی تھی کہ ام مریم نے اس سے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی محبت نہیں کی تھی وہ اسے دھوکا دینے پر ذرا بھی شرمسار نہ تھی۔ اپنی محبت کی اس تذلیل اور رسوائی پر اس کا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

اس کے سچے اور کھرے جذبوں کا اس لڑکی نے کس بے رحمی سے مذاق اڑایا تھا۔ ام مریم اس کی محبت کیا' اس کی نفرت کے بھی لائق نہیں تھی۔ وہ

اس کی اتنی انمول چاہتیں اور محبتیں پانے کی مستحق ہی نہیں تھی۔

اس کے دل کے کہیں بہت اندر ایک درد پھیل رہا تھا۔ محبت کی رسوائی' محبت کی توہین پر' محبت کے جھوٹا ہونے پر اور محبت کے آج بھی دل میں موجود ہونے پر ہاں! یہ سچ تھا' وہ اس بدکردار اور جھوٹی لڑکی سے آج بھی محبت کرتا تھا۔ اس محبت پر وہ خود سے بھی شرمسار تھا' خفا تھا' مگر وہ اسے دل سے نکال نہیں سکتا تھا۔ وہ اب باقی ساری عمر ام مریم سے نفرت کرے گا۔ ایسی نفرت جس کے اندر درد' ذلت' نارسائی اور کرب شامل ہوگا۔

ام مریم نے محبت کا نام لے کر اس کے ساتھ کھیلا تھا' مگر وہ تو حقیقت میں اس سے محبت کر بیٹھا تھا۔ جب محبت اتنی سچی تھی تو دل سے کیونکر نکل سکتی تھی۔

اسے اپنے اور مریم کے لاس اینجلس میں گزارے وقت کے مختلف مناظر یاد آرہے تھے۔ اس کی وہ محبت' وہ ساتھ' وہ باتیں کیا سب کچھ جھوٹ تھا؟

کیا ام مریم نے تب کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس سے محبت نہیں کی تھی؟ اس سچائی کو تسلیم کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔

وہ تو آج بھی اتنا ہی بے وقوف اور احمق تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد بھی اپنے دل سے اس لڑکی کی محبت نکال کر پھینک نہیں پا رہا تھا۔ وہ دنیا کے سامنے' ام مریم کے سامنے چیخ چیخ کر نفرت کا اعلان کرے گا۔ مگر دل کے اندر سے اسے کبھی بھی نکال نہیں سکے گا۔

اسے گاڑی اس طرح سڑک کے کنارے روکے کافی دیر گزر گئی تھی۔ نجانے کس چیز کی آواز سے وہ چونکا تھا۔ شاید کوئی گاڑی اس کی گاڑی کے پاس سے گزری تھی۔ وہ ایک دم ہی چونک کر سیدھا ہوا۔ اسے سکندر کا اور اپنی ماں کا خیال آیا تھا۔

آج کی رات محبت کا سوگ منانے کی رات تو نہ تھی۔ آج کی رات تو بہت اہم تھی۔ آج رات بھر میں اسے سب کچھ ٹھیک کر دینا تھا' تاکہ کل صبح سکندر واپس نہ جاسکے۔ سکندر ان سب میں سے کسی کے بھی روکنے سے نہیں رک رہا تھا' مگر وہ لیزا کے روکنے سے تو رکے گا نا؟

گھر سے نکلتے ہوئے وہ یہی سوچ کر آیا تھا کہ پہلے مریم کے گھر جائے گا اور پھر لیزا سے ملے گا۔ اس نے وقت کی پروا نہیں کی تھی۔ اس نے گاڑی محمود خالد کے گھر جانے والے راستے پر ڈال دی۔

☆ ☆ ☆

رات کے تین بج رہے تھے۔ ہر سو خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ کمرے میں اسی طرح' اسی انداز میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ محمود خالد اور مریم کے جانے کے بعد سے اس نے اپنا بیٹھنے کا انداز تک تبدیل نہیں کیا تھا۔

اس نے ابھی تک وہی لباس پہنا ہوا تھا' جو سکندر اور اس کی امو جان کی آمد کے وقت پہن رکھا تھا۔ وہی میک اپ' وہی جیولری۔ زندگی میں یکدم ہی ایسا طوفان آیا تھا' جس نے اس کے حواس گم کر دیے تھے۔ اس نے سیم کی نفرت کے سوا باقی ہر بات بھلا دی تھی۔

وہ خالی خالی نگاہوں سے کمرے کو دیکھ رہی تھی۔ اسے صرف یہ یاد تھا کہ سیم اس سے نفرت کرتی ہے' باقی کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ سکندر بھی نہیں' اپنے پاپا بھی نہیں۔ سیم نے آج اپنے اور سکندر کے رشتے کے حوالے سے جو کچھ کہا' وہ اس پر بھی کچھ نہیں سوچ پائی تھی۔

جب ڈرائنگ روم میں سب کے سامنے سیم نے سکندر پر الزامات لگائے' تب وہ حیران پریشان ہوئی تھی۔ وہ فوری طور پر اس صورت حال اور ان تمام باتوں کو بالکل بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ بس اتنا سمجھ میں آیا تھا کہ سیم اور سکندر ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے اور ماضی میں جس بھی حوالے سے وہ دونوں ایک دوسرے سے ملے تھے' آج ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے۔

اس وقت صورت حال ایک دم ہی ایسی عجیب د غریب اور ہنگامی و حادثاتی سی ہوگئی تھی کہ وہ نہ تو کچھ بول پائی تھی' نہ کچھ سوچ' سمجھ پائی تھی۔

پھر جب وہ شاید اس صورت حال کو سوچ اور سمجھ تی' سکندر سے فون پر بات کر پاتی' تب سیم اس کے پاس اس کے کمرے میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ سیم کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی۔ سکندر ایسا تھا ہی نہیں۔ وہ سیم سے نرمی سے سکندر کی حمایت میں بولی تو اس نے روتے ہوئے مزید سکندر کے خلاف بولنا شروع کر دیا۔

وہ اس وقت تک سیم کو بالکل بھی غلط نہیں سمجھ رہی تھی۔ مگر اس نے ایک پل کے لیے بھی سکندر کو بھی غلط نہیں سمجھا تھا۔ وہ سیم کے سکندر پر سنگین الزامات کو محض الزامات ہی سمجھ رہی تھی۔ یقیناً" سیم کو کوئی غلط فہمی ہوگئی تھی۔

وہ سیم کو سمجھانا چاہتی تھی کہ سکندر بہت اچھا اور باکردار انسان ہے۔ وہ سیم کے ساتھ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سیم اس سارے واقعہ کو دوبارہ سوچے اسے اندازہ ہو جائے گا کہ اسے کوئی سنگین نوعیت کی غلط فہمی ہوئی تھی سکندر کے متعلق۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ سکندر کی حمایت میں سیم سے مزید کچھ کہہ پاتی' محمود خالد وہاں آگئے۔

وہاں آکر جو کچھ انہوں نے کہا اور اس کے جواب میں جو کچھ سیم نے کہا' اس نے اس کے حواس مختل کر دیے تھے۔ اسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔ جسے آپ ساری زندگی دوسرے ہر رشتے سے بڑھ کر اپنا سمجھتے ہیں' جس میں آپ اپنا ہر رشتہ دیکھتے رہیں' جس کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ جب دنیا کا کوئی ایک فرد بھی میرے ساتھ کھڑا نہیں ہوگا' تب یہ ایک رشتہ میرے ساتھ موجود ہوگا۔ ایک دن اچانک ہی آپ کو اس رشتے کے بارے میں پتا چلے وہ جھوٹ تھا' فریب تھا' وہ بے تحاشا محبتیں دراصل بے حساب نفرتیں تھیں اور یہ بتائے بھی آپ کو خود وہی رشتہ' وہی شخص تو اپنے پیروں پر کھڑا رہنا ناممکن نظر آنے لگتا ہے۔

پچھلے کئی گھنٹوں میں سیم کی نفرتوں کو سوچنے کے سوا اس نے کوئی بھی اور بات نہیں سوچی تھی۔ وہ کسی ننھی سی بچی کی طرح سہمی ہوئی تھی۔

وہ اعتبار' بھروسا' یقین سب کچھ کھو رہی تھی' خود پر' دنیا پر' لوگوں پر' رشتوں پر' محبتوں پر۔ اگر سیم کی محبت جھوٹ ہو سکتی ہے تو پھر دنیا کی ہر محبت اور ہر رشتہ جھوٹا ہو سکتا ہے۔ پھر دنیا ہی جھوٹی ہو سکتی ہے۔

"کلثوم بیٹا! اب تک اسی طرح بیٹھی ہو؟"

اس نے محمود خالد کی آواز سنی۔ وہ کمرے میں کب داخل ہوئے اسے پتا نہیں چلا تھا۔ اس نے خالی خالی نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ وہ جیسے اس کے دل کی حالت سمجھ رہے تھے۔ فرش پر بکھرے کانچ سے بچتے ہوئے وہ اس کے برابر میں صوفے پر آکر بیٹھ گئے۔

"پاپا! سیم مجھ سے نفرت کس طرح کر سکتی ہے؟"

اس نے کسی ننھے بچے کی طرح ضدی لہجے میں پوچھا۔

"وہ کچھ بھی کر سکتی ہے کلثوم! بدی کے جس راستے پر وہ چل پڑی ہے' اس پر اسے ہر غلط' صحیح نظر آنے لگا ہے۔ وہ صحیح اور غلط' نیکی اور بد میں تمیز بھول بیٹھی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ سیدھے راستے پر پلٹ آئے۔ اس نے بہت سے لوگوں کے دل دکھائے ہیں' بہت سی زندگیاں برباد کی ہیں۔ میں بہت ڈرتا ہوں کہیں اللہ اس کی گرفت نہ کر لے۔ وہ توبہ کر لے' وہ سیدھے راستے پر پلٹ آئے۔ تم بھی بہن کے لیے یہی دعا مانگو کلثوم! کسی گرفت' کسی پکڑ سے پہلے وہ توبہ کر لے۔ اولاد ہے وہ میری۔ اگر اسے کوئی دکھ پہنچا تو میں کیسے سہ پاؤں گا؟" بولتے ہوئے ان کی آواز رندھ گئی۔

وہ اپنے پاپا کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی' جو آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔

"پاپا! آپ سب کچھ جانتے تھے۔ آپ نے مجھے کبھی کچھ کیوں نہیں بتایا؟ میں ہمیشہ آپ کو برا سمجھتی رہی' آپ کو غلط سمجھتی رہی۔"

باپ کو نگاہوں کے سامنے دیکھ کر اسے یاد آیا تھا کہ اگر سیم بہت سے لوگوں کی مجرم ہے تو وہ بھی تو اپنے باپ کی مجرم ہے۔ وہ پچھلے پانچ سالوں سے محض اپنے

باپ کو سزا دینے کے لیے اذیت دینے کے لیے ان سے ملی تک نہیں تھی۔

"بیٹا! تم مجھ سے ذہنی اور جذباتی طور پر بہت دور تھیں۔ تم مریم سے بہت قریب تھیں۔ تھوڑا دور میں نے کیا تھا تمہیں خود سے۔ مکمل طور پر دور مریم نے کروا دیا۔ تم اس پر آنکھیں بند کرکے اعتبار کرتی تھیں۔ تم مجھ سے اس حد تک متنفر تھیں کہ اگر میں کبھی تمہیں سچائی بتانے کی کوشش کرتا تو تم مجھ سے لڑ پڑتیں۔ پچھلے پانچ سالوں سے تم سے محض فون کی حد تک میرا رابطہ تھا۔ وہ فون کالز جو میں کرتا تھا اور تم انہیں بے زاری سے ریسیو کرتی تھیں۔ تم مختصر اور اکھڑی اکھڑی بات کرتی تھیں مجھ سے۔ تم مکمل طور پر مریم کے زیر اثر تھیں۔ تمہیں مریم کے متعلق کچھ بھی بتانے سے پہلے میرے لیے ضروری تھا تمہارا اعتبار پانا۔ تم مجھ پر اعتماد اور اعتبار کرتیں تب ہی تو میری باتوں کا تمہیں یقین بھی آتا۔ بولتے ہوئے دل کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر مریم نے تمہارا دل اور ذہن میرے خلاف اس حد تک کر رکھا تھا کہ بارہا مجھے خدشہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اس کے کہنے میں آکر صرف مجھے تکلیف پہنچانے کے لیے تم کسی غلط آدمی سے شادی نہ کرلو۔ ذرا سوچو کلثوم! اگر تمہارے پاکستان یہاں میرے پاس آنے سے پہلے میں تمہیں فون کرکے یہی تمام باتیں بتاتا جو آج میں نے کہی ہیں تو تب کیا تم میرا یقین کرتیں؟ تم یہی سوچتیں کہ ان باتوں کے پیچھے میری کوئی سازش ہے۔ میں تم دونوں بہنوں کو دور کروانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بیٹی ہے میری کیا کہوں مگر مریم کا سازشی ذہن بہت خطرناک منصوبہ ساز ہے۔ میں تمہیں اس کے خطرناک عزائم سے بچانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہیں تھی۔ مگر تمہارے مستقبل کی بہت فکر تھی بیٹا! مریم تمہاری زندگی برباد کر دینے تک سے دریغ نہ کرتی اور تم اسے اپنا سب سے سچا رشتہ اور عزیز از جان بہن سمجھتے ہوئے مکمل طور پر اس کے زیر اثر خود کو تباہ کر ڈالتیں۔ اس نے جیسے کوئی اسم پڑھ کر پھونک رکھا تھا تم پر۔ وہ کہتی 'دن ہے'۔ تم کہتیں 'دن ہے'۔ وہ کہتی 'رات ہے'۔ تم کہتیں رات ہے۔ ایسے میں 'میں کوئی ڈائریکٹ اور صاف صاف بات تم سے کیسے کرسکتا تھا کلثوم!"

باپ کی ہر بات حرف بہ حرف سچ تھی۔ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ اگر آج سیم نے خود اپنے منہ سے اس سے نفرت کا اظہار اور اس کی زندگی کی تباہی کی خواہش کا اعتراف نہ کیا ہوتا تو اس کے پاپا ہی کیا وہ دنیا کے دوسرے کسی بھی اور فرد کے کہنے پر اس کی خود سے نفرت کا یقین نہ کرتی۔

"مجھے معاف کردیں پاپا! میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

صرف پچھلے پانچ سال ہی تو نہیں' اس سے پہلے جب وہ لندن میں ساتھ رہتے تھے تب بھی اس نے ہمیشہ ہر وہ کام کیا تھا' جس سے باپ نے اسے منع کیا تھا۔ کچھ اور کیا' اپنا نام تک۔ وہ ام کلثوم نہیں علیزا محمود تھی۔ اس نے باپ کے دل کو بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ محمود خالد نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگالیا۔

"نہیں میری جان! تمہیں مجھ سے معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر مجھ برا سمجھتی تھیں تو تمہارے بچپن میں 'میں نے خود کو تمہارے سامنے بہت لاپروا اور بہت غیر ذمہ دار باپ کے طور پر ہی پیش کیا تھا۔ میں تمہیں وہ توجہ اور پیار کبھی نہ دے سکا تھا' جو میں نے مریم کو دیا تھا۔ تم مجھ سے یونہی دور نہیں ہو گئی تھیں۔ میں نے بھی تمہاری پروا نہیں کی تھی۔ ایک بیٹی کو آنکھوں کا تارا بنا کر میں دوسری کو بھول ہی بیٹھا تھا۔"

وہ باپ کے کندھے پر سر رکھ کر بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ اسے پتا تھا' اس کے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ چند لمحوں بعد انہوں نے چونک کر اس کا سر اپنے کندھے پر سے اٹھایا۔

"باہر زین آیا ہوا ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"زین؟" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ زین ان کے گھر؟ اتنی رات گئے؟

"کافی دیر ہوگئی اسے آئے ہوئے۔ کافی دیر میری کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی ہے۔ بہت کچھ واضح ہو[گیا] اس سے باتیں کرکے۔ بہت سی الجھی گتھیاں سلجھ [گئیں]۔ اب وہ تمہیں بلا رہا ہے۔ وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ جاکر اس سے مل لو۔ میں نے بہت کہا' اندر آکر بیٹھ جاؤ۔ مگر وہ کہہ رہا ہے۔ اسے لان میں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے۔"

باپ کے کہنے پر وہ فوراً صوفے پر سے اٹھی۔

"کلثوم!" اسے محمود خالد نے پیچھے سے پکارا۔ وہ مڑی۔

"جو فیصلہ بھی کرو' سوچ سمجھ کر کرنا۔" وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

"کون سا فیصلہ پاپا؟"

"اپنے اور سکندر کے مستقبل کا۔" وہ گزری شام اور رات سکندر کو بھولی رہی تھی۔ اسے ایک پل کے لیے بھی اس کا دھیان نہیں آیا تھا۔ لیکن اس کا خیال نہ آنے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں تھا کہ وہ اور سکندر الگ ہو رہے ہیں۔ ٹھیک ہے محبت اور رشتوں پر اس کا یقین متزلزل ہوا تھا' مگر سکندر کی محبت اس کے دل میں اسی آب و تاب سے موجود تھی۔

"پاپا! میرا مستقبل کل بھی سکندر کے ساتھ وابستہ تھا' آج بھی اس کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔"

اس نے باپ کے لبوں پر طمانیت اور سرشاری سے بھری مسکراہٹ آتے دیکھی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی کمرے سے نکل گئی۔

وہ لان میں آئی۔ لان میں فقط ایک بلب جل رہا تھا' اس لیے اسے زین فوری طور پر اندھیرے میں نظر نہیں آسکا تھا۔ جب اس مدھم روشنی سے اس کی آنکھیں مانوس ہوئیں تو اسے زین سیڑھیوں پر بیٹھا نظر آیا۔ لان سے بھی سیڑھیاں فرسٹ فلور پر جاتی تھیں۔

"یہیں آجاؤ لیزا!" وہ اس سے مدھم آواز میں بولا۔

وہ آہستگی سے چلتی اسی اسٹیپ پر زین سے قدرے فاصلے پر بیٹھ گئی۔

زین اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اس کے لیے ایک بھائی اور دوست والی محبت اور نرمی چھلک رہی تھی۔

"جو الزامات مریم آج دوپہر سکندر پر لگا کر گئی تھی میں نے ان سب کے جھوٹا ہونے کا انکل کو بتایا ہے۔ میں تمہیں بھی تفصیل سے وہ سارا واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کیوں زین؟"

"تاکہ تمہیں سکندر کا اعتبار آسکے۔ تاکہ تم اسے چھوڑنے کی بات سوچو بھی نہیں۔" وہ اس کی حیرت کے جواب میں سنجیدگی سے بولا۔

"مگر میں سکندر کو چھوڑ کب رہی ہوں؟" وہ متعجب سے انداز میں بولی۔

"چھوڑ نہیں رہیں' مگر تم اس کے پاس بھی تو نہیں گئیں لیزا! نہ تم اس کے پاس گئیں' نہ اسے فون کیا۔ تم نے کسی بھی طرح اسے یہ یقین نہیں دلایا کہ تم مریم کا نہیں' اس کا اعتبار کرتی ہو۔"

زین کے لفظوں نے اسے یکلخت ہی سکندر کے لیے فکرمند کردیا۔ سکندر کہاں تھا؟ وہ ٹھیک تو تھا؟ آج دوپہر کے بعد سے اب اس وقت پہلی مرتبہ اس نے مکمل توجہ کے ساتھ سکندر کو سوچا۔ زین بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم تو اس سے بہت محبت کرتی تھیں۔ پھر تم ہم لوگوں جیسی کیسے ہوگئیں؟ سکندر سے محبت کی تھی تو اس کا اعتبار بھی تو کرنا تھا ناں لیزا۔ جو ہم سب نے اس کے ساتھ کیا' تم تو وہ مت کرو۔" زین کے لہجے میں بے پناہ دکھ تھا۔

"مجھے سکندر کا اعتبار ہے زین! میں اس کا اعتبار کیوں نہیں کروں گی؟"

بولتے ہوئے اسے سکندر بڑی شدتوں سے یاد آیا۔

وہ کہاں تھا؟ وہ خیریت سے تو تھا ناں؟ اسے سکندر کی محرومیاں' اس کے دکھ' اس کے خوف سب یاد آگئے تھے۔ وہ اس کا ساتھ قبول کرتے ہوئے کس قدر ڈرا تھا۔ اس کی محبت چھن جانے کا کیسا ایک انجانا سا خوف اسے اپنی لپیٹ میں لیے رکھتا تھا۔ وہ دکھوں کو خود میں سموئے' اپنا داغ داغ دل لیے کس قدر تنہا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ کتنے بھیانک کھیل کھیلے تھے۔ وہ رشتوں اور محبتوں سے کس قدر خوف زدہ رہا کرتا تھا۔ وہ ہنستے ہنستے کس طرح ڈر کر چپ ہو جایا کرتا تھا' جیسے اسے زندگی سے یہ خوف ہو کہ زندگی کو اس کا ہنسنا گوارا نہ ہو گا۔ زندگی ابھی آکر اس کی مسکان چھین لے گی۔

"تم صاف کیوں نہیں کہتے سکندر شہریار! کہ تم رشتے بناتے ہوئے ڈرتے ہو۔" اس کے کانوں میں اپنی غصے سے چلاتی آواز گونجی۔

"ہاں ڈرتا ہوں۔ بہت ڈرتا ہوں۔ رشتے نبھانے کی اہلیت گنوا چکا ہوں۔" اس کے کانوں میں سکندر کی دکھ بھری آواز گونجی۔

"کیوں خود کو کانٹوں پر گھسیٹ رہی ہو؟ تمہیں میرے ساتھ میں کانٹوں بھرے راستے کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔" وہ اس کی ضد سے ہار مانتا اس سے کہہ رہا تھا۔

"مجھے تھوڑا وقت دینا لیزا! میں برسوں سے اندھیروں میں رہنے کا عادی ہو چلا ہوں۔ میں تمہاری پسند کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کروں گا۔ بس! تم مجھ سے مایوس مت ہو جانا۔ مجھے تھوڑی رعایت' تھوڑی گنجائش دیتی رہنا۔" پھر سکندر نے بڑے دکھ کے ساتھ اس سے التجا کی تھی۔

"پلیز! مجھے کبھی چھوڑنا نہیں۔ مجھے سب نے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے رشتوں نے اور زندگی نے صرف نفرتیں دی ہیں۔ اگر تم نے مجھے چھوڑ دیا' اگر تم مجھ سے دور ہو گئیں تو میں زندہ کس طرح رہ پاؤں گا؟"

سکندر کا دکھ بھرا وہ لہجہ اس وقت اسے رلا رہا تھا۔ زین اس کی خاموشی کو نجانے کیا سمجھا تھا۔ وہ اسے بارہ سال قبل گزرے اس واقعہ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ غائب دماغی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی باتیں مکمل توجہ سے سن بھی نہیں پا رہی تھی۔ اسے تو سکندر کے خوف' خدشے' اندیشے اور ان کے جواب میں اپنے وعدے یاد آنے لگے تھے۔

دوپہر سے اب تک اسے سکندر کا خیال کیوں نہیں آیا تھا؟ کیا وہ نہیں جانتی سکندر رشتوں کا ڈسا ہوا ہے؟ اس کے بہت اعتبار دلانے پر وہ اس کے ساتھ رشتہ جوڑ پایا تھا۔

آج سیم کو اس کی بہن کے روپ میں دیکھ کر' سیم کی الزام تراشیاں سننے کے بعد اس کی کیا حالت ہوئی ہو گی؟

کیا وہ منتظر نہیں رہا ہو گا اس کا کہ وہ اس کے پاس آئے گی اور آکر کہے گی۔

"سکندر! سیم سمیت دنیا کا کوئی بھی فرد تمہارے متعلق کچھ بھی کہے' مجھے اس کا نہیں صرف اور صرف تمہارا اعتبار ہے۔"

اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ کل دوپہر سے اب تک اسے سکندر کے کسی دکھ کا خیال نہیں آیا تھا۔ اب آرہا تھا۔

وہ سکندر کی زندگی کے نہ ختم ہونے والے دکھوں کو سوچ رہی تھی۔ آخر زندگی کو اس پر رحم کیوں نہیں آتا عمر بھر کی تنہائیوں اور دکھوں کے بعد اسے اس کی محبت ملی۔ وہ ابھی پل بھر کے لیے ہی خوش ہوا تھا کہ زندگی نے یہ بدصورت سچائی اس کے سامنے لا کر کھڑی کر دی کہ لیزا اس ام مریم کی سگی بہن ہے' جو اس کی زندگی کی تباہی کی ذمہ دار ہے۔ اسے زندگی میں پہلی بار سیم کی بہن ہونے پر شرم آئی' ندامت ہوئی۔

"پتا نہیں کیوں' ایک ڈر سا ہے میرے اندر' کچھ برا ہو جانے کا۔ جب تک تمہیں سمجھا رہا تھا۔ تب تک خود کو بھی سمجھا لیا تھا کہ تم میرے لیے نہیں ہو۔ مگر اب تمہارے لیے میرا دل ضدی بچے کا سا ہو رہا ہے۔ اب مجھے اپنی زندگی میں لیزا محمود چاہیے۔"

اس شخص کو اس نے بے حساب چاہا تھا۔ بے حساب محبت کی تھی اس سے۔ پھر ایسا کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ اس کے غم پر رو نہ پڑتی؟ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ زین اسے خود میں کھویا اور آنسو بہاتا دیکھ رہا تھا۔ وہ ہنوز اسے اپنا' سکندر کا اور سیم کا ماضی بتا رہا تھا۔

وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اسے کچھ بھی نہ بتائے۔ کچھ بھی جانے بغیر بھی اسے سکندر پر اعتبار ہے۔

"پتا ہے لیزا! آج میری انکل کے ساتھ بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں آیا تو اس لیے تھا کہ انہیں اور تمہیں مریم کی سچائی بتا سکوں' تم دونوں پر سکندر کی بے گناہی ثابت کر سکوں۔ مگر انکل نے یہ انکشاف کر کے مجھے حیران کر دیا کہ وہ مریم کی تمام تر بدصورت سچائیوں سے آگاہ ہیں۔"

اس واقعہ کی تفصیلات سنانے کے ساتھ ساتھ زین نے یہ بھی بتایا تھا کہ بارہ سال اس نے سیم کی باتوں پر اندھا اعتبار اس لیے کر لیا تھا کہ سکندر کے خلاف غبار تو اس کے دل میں برسوں سے جمع ہو رہا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی ذہین بھائی سے حسد اور نفرت کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی جب اس کی زندگی میں سیم نہیں آئی تھی۔ بولتے بولتے وہ رک گیا۔ وہ دکھ سے بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"انکل نے مجھ سے تمہارے اور مریم کے بارے میں بہت سی باتیں شیئر کی ہیں۔ میں نے ان کی باتوں کو سننے کے بعد تمہارے بارے میں بہت سوچا لیزا!"

وہ زین کی طرف دیکھ ضرور رہی تھی' مگر اس کا ذہن اور دل سکندر ہی میں الجھا تھا۔

"تم میں اور مجھ میں بڑی عجیب اور حیرت انگیز مماثلت ہے لیزا! تمہاری ایک سال بڑی بہن' جو زندگی کے ہر میدان میں تم سے آگے تھی۔ ہائی اچیور (high achiever) تھی اور میرا ایک سال بڑا بھائی جس سے میں ہر لحاظ سے پیچھے تھا۔

ہم دونوں ہی نے اپنے اپنے بھائی اور بہن کی اس برتری کو بڑے عجیب اور ابنارمل انداز میں لیا۔ میں نے اپنے بھائی سے حسد اور مقابلہ بازی شروع کر دی۔ اس سے جیت نہ پایا تو اس سے نفرت دل میں بٹھالی اور تم نے اپنی بہن کو خود سے اتنا برتر اور عظیم تسلیم کر لیا کہ زندگی بھر جو کچھ وہ تم سے کہتی رہی تم آنکھیں بند کر کے کرتی رہیں۔ وہ تمہیں تباہی کے دہانے تک لے جانا چاہتی تھی اور تم آنکھیں بند کر کے اسے برتر مان کر اس کے پیچھے چلی جا رہی تھیں۔"

زین کی باتوں میں کچھ ایسی سچائی تھی کہ وہ اس کے لفظ توجہ سے سننے پر مجبور ہو گئی۔ وہ سیم کو خود سے برتر' خود سے بہتر اور اعلا مان کر اس کی ہر بات مانا کرتی تھی' یہ کوئی اسے پہلی بار بتا رہا تھا۔

"کاش! ہم دونوں ہی نے اپنے ہائی اچیور بھائی اور بہن کے غیر معمولی ہونے کو نارمل انداز میں لیا ہوتا تو آج ہماری زندگیاں بہت مختلف ہوتیں۔" زین کے لہجے میں بہت دکھ' بہت پچھتاوے تھے۔

وہ زین کی آنکھوں میں پھیلے غم کو سمجھ رہی تھی۔ زین کی آنکھیں۔ جو اس سے کہہ رہی تھیں کہ کاش! اس نے اور زین نے وہ نہ کیا ہوتا جو انہوں نے کیا۔ کاش! ان دونوں نے اپنے برتر اور غیر معمولی ذہین بھائی اور بہن کی برتری کو اس انداز میں نہ لیا ہوتا' جیسے انہوں نے لیا۔ زین نے سکندر کو اپنا دشمن اور حریف سمجھ لیا اور اس نے اپنے آپ کو مکمل طور پر سیم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس پر اس حد تک انحصار کرنے لگی کہ اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ بھی خود کر لینے کی اہلیت گنوا بیٹھی۔

"میں تم سے یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں لیزا! کہ میرا اور تمہارا غم اور پچھتاوے کسی حد تک ایک جیسے ہیں۔ مجھے یقین ہے تم میری باتوں کو سمجھ رہی ہو گی۔ میرا بھائی مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے لیزا۔ مجھے میرا بھائی ڈھونڈ کر واپس لا دو۔ میں اسے واپس لا نہیں پا رہا میں اسے واپس لانا چاہتا ہوں' اس کے گلے لگنا چاہتا ہوں' اس سے بہت پیار کرتا ہوں اسے یہ بتانا چاہتا ہوں۔ میری مدد کر دو لیزا! پلیز' میری مدد کر دو۔" بولتے بولتے زین کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو

آگئے۔ وہ انہیں بہنے سے روک رہا تھا۔

"سکندر کہاں ہے؟" اس نے اپنے آنسو زین سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"وہ واپس جا رہا ہے لیزا۔" اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا؟"

"ہم میں سے کوئی بھی اسے روک نہیں پا رہا۔ یہ کام صرف تم کر سکتی ہو۔ اسے روک لو لیزا۔ اسے یہ سوچنے پہ مجبور نہ کرو کہ اس سے محبت کرنے والا ہر فرد اسے دکھ دے گا۔ اسے چھوڑ دے گا۔" زین کی آنکھوں سے دو آنسو گرے تھے۔

"اسے روک لو لیزا! وہ دوہا نہیں جا رہا' وہ زندگی سے دور جا رہا ہے اور اب کی بار وہ گیا تو تم سمیت ہم میں سے کوئی بھی اسے واپس زندگی کی طرف نہیں لا پائے گا۔"

وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ وہ سکندر کے جانے کی بات سن کر رونا بھول گئی تھی۔

"پر میں نے اسے چھوڑا کب ہے زین! میں سکندر کے ساتھ کل بھی تھی' آج بھی ہوں۔ مجھے اتنی رعایت تو ملنی چاہیے کہ کل جس لڑکی کو یہاں دیکھ کر سکندر یہاں سے غصہ میں فوراً" چلا گیا تھا' وہ میری سگی بہن تھی۔ وہ بہن جو میرے لیے میرے ماں' باپ سے بھی بڑھ کر تھی۔" وہ غصے' ناراضی اور بے بسی سے بولی۔

"سکندر مجھ سے ملے بغیر' مجھ سے بات کیے بغیر جا رہا تھا۔ اتنی بے اعتباری؟ محبت کی تھی تو اعتبار بھی تو کرتا لیزا محمود پر۔

لیزا کو زندگی کہتا تھا تو زندگی کے بنا یہاں سے کیسے جا سکتا تھا؟"

زین بے اختیار طمانیت بھرے انداز میں مسکرایا تھا۔

"اس کا مطلب ہے تم سکندر سے بدگمان نہیں ہو؟"

"میں اس سے کیوں بدگمان ہوں گی زین! میں نے اس سے محبت کی ہے۔ میں نے اس کے ساتھ عمر بھر کا ناتا جوڑا ہے۔ بس! میں پریشان ہو گئی تھی' بوکھلا گئی تھی۔ مگر سکندر سے بے اعتبار تو میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہوئی تھی۔"

زین نگاہوں میں پیار اور احترام لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"سکندر کو روک لو لیزا! اسے اپنا ساتھ دے دو۔ اسے اتنا پیار دو کہ وہ گزرے ماہ و سال کی تمام محرومیاں اور غم بھول جائے۔"

وہ زین کی آنکھوں میں سکندر کے لیے محبت دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆
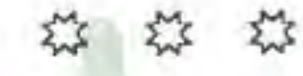
صبح کے پانچ بج رہے تھے' جب وہ زین کے ساتھ سکندر کے ہوٹل جا رہی تھی۔ اس کی فلائٹ صبح آٹھ بجے تھی تو ابھی تو وہ ہوٹل ہی میں ہو گا۔ کل دوپہر وہ اس کے گھر سے گیا تھا۔ اور آج صبح وہ اس کے پاس جا رہی تھی۔ یہ بہت وقت تھا۔ اس عرصے میں بہت سارے گھنٹے گزر چکے تھے۔

وہ اتنے بہت سارے گھنٹوں میں اس کے پاس نہیں گئی تھی۔ اسے کوئی فون کال تک نہیں کی تھی۔ سکندر کی اس سے خفگی اور بدگمانی جائز تھی۔ پر ارادتاً" تو اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ کیا اگر وہ سکندر سے یہ کہے گی کہ اس نے کل ایک لمحے کے لیے بھی سکندر پر شک نہیں کیا تھا تو وہ اس کا یقین کرے گا؟ یا پھر سمجھے گا کہ زین اسے سب سچائیاں بتا کر' منا کر اس کے پاس لایا ہے؟

سکندر کو اس پر اعتبار کرنا چاہیے۔ اسے اس کی حالت کو بھی تو سوچنا چاہیے۔ کل وہ خود ایک بہت بڑے طوفان کی زد میں آئی تھی۔

وہ عمر بھر جس بہن پر آنکھیں بند کر کے اندھا بھروسا کرتی آئی تھی' جس کے بتائے ہر راستے پر آنکھیں بند کر کے چلتی آئی تھی۔ جس کی بتائی ہر بات

مائی ائی تھی۔ ایک ہی پل میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ بہت چاہنے والی بہن اسے جس راستے پر چلاتی رہی تھی اس کا اختتام ایک گہری کھائی پر جا کر ہوتا تھا۔ تو کیا اتنے بڑے دل دہلا دینے والے انکشاف کے بعد وہ نارمل رہ سکتی تھی۔

سکندر کو اسے اتنی رعایت، اتنی گنجائش تو دینی ہی پڑے گی کہ بہن کی بھیانک سچائی دیکھ کر اس کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا۔ سکندر شہریار لیزا کو اپنی زندگی کہتا ہے۔ اگر لیزا محمود واقعی اس کی زندگی ہے تو پھر زندگی کو اس طرح اتنی آسانی سے کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟

وہ دونوں ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ زین نے گاڑی ہوٹل سے باہر سڑک پر ہی روک دی۔

"تم جاؤ! وہ چیزوں کو بہت منفی انداز میں سوچنے لگا ہے۔ مجھے دیکھے گا تو سمجھے گا، تمہیں میں لے کر آیا ہوں۔"

تو زین بھی راستے بھر وہی سوچتا آیا تھا، جو وہ سوچتی رہی تھی۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا اور اندر چلی آئی۔ وہ ریسپشن پر آئی۔ اس نے سکندر شہریار کا روم نمبر بتا کر کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اسے انفارم کروایا جائے۔

"سوری میم! وہ تو چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔" ریسپشن پر کھڑی خوش پوش و خوش شکل لڑکی نے اسے معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھا۔

"کب؟" اس کا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ کیا اس نے دیر کر دی تھی؟ کیا اس نے واقعی بہت دیر کر دی تھی؟

"ابھی تھوڑی دیر پہلے۔" ایک ہلکی پیشہ ورانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اسے بتایا۔ اور وہ بغیر کچھ کہے وہاں سے ہٹ گئی تھی، پلٹ گئی تھی۔ وہ واپس باہر جا رہی تھی۔ اس کا دل خوف سے کانپ رہا تھا۔

"اللہ! اسے مجھ سے دور مت کرنا۔ اسے مجھ سے کھونے مت دینا۔ اسے کھو کر میں کیسے جی پاؤں گی؟"

وہ بے آواز اللہ کو پکار رہی تھی، بڑی شدتوں سے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ہوٹل کے اندر پارکنگ ہی میں کھڑا تھا۔ کیب ڈرائیور اس کا سوٹ کیس اور بیگ وغیرہ کیب کی ڈکی میں رکھ رہا تھا۔ وہ خود وہاں خاموشی سے کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی نکل چکا ہوتا، مگر کیب کا ٹائر پنکچر ہو جانے کی وجہ سے اسے یہاں مزید رکنا پڑ گیا تھا۔ ٹائر بدلنے کے بعد اب کیب ڈرائیور اس کا سامان کیب میں رکھ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اور بالکل گم صم سا کھڑا تھا۔ وہ یہاں اکیلا نہیں آیا تھا، پر وہ یہاں سے اکیلا واپس ضرور جا رہا تھا۔

"تم مجھے آج فون کر کے کہتے، لیزا! کسی بھی طرح کل کی فلائٹ سے دوہا آجاؤ۔ پرسوں ہمیں کراچی جانا ہے۔ میں تم سے بغیر کچھ پوچھے چل پڑتی۔ تمہارے سپرد میں نے اپنی پوری زندگی کر دی ہے سکندر!"

کسی کے بڑے یقین سے کہے جملے اس کی سماعتوں میں گونجے۔ اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی۔ وہ کیب میں بیٹھنے کے لیے ایک قدم آگے بڑھا۔

"تمہیں جتنا جاننا میرے لیے ضروری ہے، میں تمہیں اتنا جانتی ہوں سکندر! میں جانتی ہوں کہ میرے ساتھ بیٹھا یہ شخص ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔"

سماعتوں میں گونجتے یہ جملے اس کے اندر تلخیاں ہی تلخیاں بھر رہے تھے۔ محبت کا نام لینا کتنا آسان ہوتا ہے، مگر اسے نبھانا کس قدر دشوار۔ اس نے کیب کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ اندر بیٹھنے کے لیے اپنا قدم اٹھا رہا تھا۔

"سکندر!" اسے یوں لگا، لیزا نے اسے پیچھے سے پکارا تھا۔ یوں جیسے وہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آرہی تھی۔

وہ مڑا نہیں۔ جانتا تھا یہ آواز اس کا واہمہ ہے۔ یہ آواز سچ ہو نہیں سکتی تھی۔ لیزا محمود کو اس کے پاس کبھی بھی نہیں آنا تھا۔

"سکندر! رکو۔" اس بار اسے دور سے پہلے سے زیادہ زور سے چلا کر پکارا گیا تھا۔

اس بار وہ ٹھٹک کر رکنے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے سے خود کو روک نہیں پایا تھا۔ وہ اندھا دھند بھاگتی اس کی طرف آرہی تھی۔ وہ رک گیا تھا۔ تیز بھاگنے سے اس کے کھلے بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے پر آرہے تھے۔ وہ اگلے لمحے اس کے پاس تھی۔ اس کی سانس اتنے بے ہنگم انداز میں بھاگنے کی وجہ سے بری طرح پھولی ہوئی تھی۔

دس از ناٹ فیر (This is not fair) سینور سکندر! تم میرے ساتھ آئے تھے۔ میرے بغیر تم کس طرح واپس جا سکتے ہو؟ ہم ساتھ آئے تھے۔ ہم کو ساتھ جانا تھا۔"

وہ اسی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ غصے سے بولی۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گیا۔ وہ غصے سے اس پر چلا رہی تھی۔

"تم نے خود خود ہی میرے بارے میں سب کچھ سوچ لیا۔ مجھ سے کچھ پوچھنا، بات کرنا تک گوارا نہیں کیا۔ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا سکندر! کہ لیزا بھی تمہاری طرح ایک انسان ہے؟ جیسے تم دکھ، درد اور غم محسوس کر سکتے ہو، وہ بھی کر سکتی ہے۔ جس لڑکی نے تمہاری زندگی برباد کی تھی، وہ لیزا محمود کی سگی بہن ہے اور لیزا اپنی بہن کے بدترین اور بھیانک کردار سے زندگی میں پہلی بار آگاہ ہو رہی ہے۔ وہ شاک میں بھی ہو سکتی ہے۔ وہ درد اور غم بھی محسوس کر سکتی ہے، وہ رو بھی سکتی ہے۔"

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیب ڈرائیور بھی وہاں موجود ہے، اسے ذرا پروا نہیں تھی۔ آس پاس سے گزرتے لوگ اس کے اس طرح زور سے بولنے پر کیا سوچیں گے اسے بالکل پروا نہیں۔ صبح سویرے کا وقت تھا، مگر ہوٹل میں اس وقت بھی چند لوگ تو آجا رہے تھے۔ سکندر بالکل خاموش کھڑا تھا۔ وہ یک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

"ایسی محبت کرتے ہو مجھ سے کہ مجھے ذرا سی بھی رعایت دینے کو تیار نہیں؟ میرے دل کی حالت، میرا غم سمجھنے پر آمادہ نہیں؟ میں تمہارے بغیر کیسے رہ پاؤں گی، سوچا ہے تم نے؟ کیا ام مریم کی بہن ہونا میرا جرم ہے اور تم اس جرم کی سزا میں مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟"

وہ اس سے لڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ لیزا نے اس کے دونوں بازو کہنی کے پاس سے مضبوطی سے تھام لیے۔

"میں تمہیں صرف بیلا لگی تھی، روما کی باقی سب چیزوں کی طرح خوب صورت لگی تھی، مگر انسان نہیں ہے نا سکندر؟"

"ایسی بات نہیں ہے لیزا!" وہ رسانیت سے بولا۔ لیزا کو پروا نہیں تھی، مگر وہ آس پاس سے گزرتے لوگوں کی وجہ سے محتاط ہو رہا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے تو تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بغیر اکیلے واپس جانے کی؟ مجھے فون کر کے یہ کیوں نہیں کہا تم نے کہ لیزا! میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔ تم بھی صبح چھ بجے ایرپورٹ پہنچ جاؤ۔ پھر میں نہ آتی تو تم کہتے۔ مگر تم مجھے کیوں فون کرتے؟ تم کو تو مجھے سزا دینی تھی۔ جو سیم نے تمہارے ساتھ کیا، تم اس کی سزا مجھے دینا چاہتے ہو۔ میں تمہارے دل سے اتر گئی ہوں۔ نکال دیا ہے تم نے مجھے اپنے دل سے، اس لیے کہ میں سیم کی بہن ہوں۔" وہ زار و قطار روتے ہوئے اس سے لڑ رہی تھی۔

"نہیں لیزا! نہیں۔ میں نے تمہیں ام مریم کی بہن کی حیثیت میں ایک بار بھی نہیں سوچا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔

"پھر تم مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہے تھے؟ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ سکندر! مجھے سیم کی بہن ہونے کی سزا مت دو۔" وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو پڑی۔

آس پاس سے گزرتے لوگ بشمول کیب ڈرائیور اس منظر کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"بیلا کیا کر رہی ہو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ یہ لیزا کا روما نہیں، کراچی ہے۔" اس نے جھک کر اس کے کان

میں سرگوشی کی۔ وہ کھسیانی اور شرمندہ سی مسکراہٹ سے آس پاس سے گزرتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

لیزا جذبات کی شدت سے مغلوب تھی۔ صبح سویرے یہاں سے گزرتے لوگوں کی اسے کیا پروا ہوتی اگر یہاں مجمع بھی جمع ہوتا' وہ تب بھی یہی سب کر رہی ہوتی۔ اس نے لیزا کا سر اپنے کندھے پر سے ہٹایا تھا۔

"تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا میں۔ ہم ساتھ جا رہے ہیں۔ ہم ساتھ واپس جا رہے ہیں لیزا۔"

اس لڑکی کی محبت ایسی زور آور تھی کہ پل بھر میں ساری کلفتیں بھول گیا۔ یاد رہا تو اتنا کہ وہ اس لڑکی سے اپنی جان سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ اس کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

"چل سکو گی ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ؟" اس نے دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے جیسے اسے آزمانا چاہا۔

"ہاں! چلو۔" وہ فوراً" بولی۔ وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"مجھے آزمانے چلے ہو سکندر شہریار! میں تم سے تمہاری سوچوں سے بھی زیادہ محبت کرتی ہوں۔ میں بغیر کسی سے ملے ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ جا سکتی ہوں۔" وہ اسے اپنی آزمائش کرتا دیکھ کر خفگی سے بولی۔

"ارے ہاں' میں تو بھول گیا تھا۔ تم میرے لیے کچھ بھی کر سکتی ہو۔ میری خاطر کچھ بھی چھوڑ سکتی ہو۔"

دل کو غیر متوقع خوشی ایسی ملی تھی' محبت کا یقین ایسا ملا تھا کہ وہ بھی لوگوں کی موجودگی فراموش کر بیٹھا تھا۔ لیزا نے ناراضی سے اسے گھورا۔

"ہاں! میں تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں سکندر شہریار!" وہ روتے ہوئے بولی۔

"میری خاطر پینٹنگ چھوڑ سکتی ہو؟" وہ لبوں پر مسکراہٹ روکتا سنجیدگی سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"ہاں!" وہ اس کی شرارت محسوس کر کے روتے روتے ہنس پڑی۔

"رونا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں!"

"رونا اور لڑنا چھوڑ سکتی ہو؟"

"ہاں!" اس نے بے اختیار ہنستے ہوئے اپنی آنکھوں سے گرتے اور رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو صاف کیا تھا۔ وہ ابھی لیزا سے مزید کچھ اور بول نہیں پایا تھا کہ لیزا کے موبائل پر کال آنے لگی۔

"زین کال کر رہا ہے۔" ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھتے ہوئے وہ بولی۔ ایک دم ہی اس کا چہرہ پھر سے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"زین تمہیں یہاں لایا ہے؟"

"میں تمہیں جان سے مار دوں گی سکندر! اگر اب تم مجھ سے بدگمان ہوئے۔ میں زین کے ساتھ یہاں آئی ضرور ہوں مگر اس کے کہنے سے نہیں۔ میں خود اپنی مرضی سے اس کے ساتھ آئی ہوں۔ زین اپنی غلطیوں پر بہت شرمندہ ہے سکندر!"

وہ اسے ناراضی سے گھورتے ہوئے بولی۔ وہ بری طرح شرمندہ ہو گیا تھا۔ نجانے یہ بے اعتباریاں کب اس کا پیچھا چھوڑیں گی۔ اس دوران لیزا' زین کی کال ریسیو کر چکی تھی۔

"ہاں زین! بولو۔" وہ سکندر کو گھورتے ہوئے فون پر بولی۔

"لیزا! سکندر ملا تمہیں؟" زین بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا اور پریشان سا بھی لگ رہا تھا۔

"ہاں! سینور سکندر کی ایئرپورٹ کے لیے نکلنے کی تیاری تھی۔ شکر! میں ٹھیک وقت پر پہنچ گئی۔" وہ ہنوز سکندر کو گھور رہی تھی۔ اس نے زین کے لہجے کی گھبراہٹ پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

"لیزا! سکندر کو بتانا' اموجان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ پاپا انہیں ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔"

زین نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں بولتے ہوئے گاڑی بھی اسٹارٹ کر دی تھی۔ وہ جیسے فوراً" اسپتال پہنچ جانا چاہتا تھا۔ زین نے فوراً" ہی خدا حافظ کر کے فون بند کر دیا تھا۔ لیزا کے چہرے پر بھی پریشانی آ گئی تھی۔

"کیا ہوا؟" سکندر متعجب انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"سکندر! اموجان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔"

☼ ☼ ☼

ہاشم رات سے اسی طرح کمرے میں بند تھا۔ رات وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں' دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ اس نے کمرا اندر سے مقفل کر لیا تھا۔ وہ رات بھر میں کئی بار اس کمرے کے دروازے پر جا چکی تھی۔ ہر بار اسے ناکامی اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ کیا کرے۔

ہاشم کو اس نے سدا اپنی غلامی کرتے دیکھا تھا۔ اس کا یہ سرد مہر رویہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ ہمیشہ وہ روٹھا کرتی تھی' ہاشم اسے منایا کرتا تھا۔

اس کی خوب صورتی پر مرتا ہے ناں ہاشم۔ وہ کمرے میں جا کر بہت اچھی طرح تیار ہوئی۔ کوئی بات نہیں آج وہ منا لے گی اسے۔ اپنی حسین اور کم عمر بیوی کو وہ کتنی دیر نظر انداز کر پائے گا؟

صبح ہو چکی ہے۔ اب تو وہ کمرے سے نکلے گا۔ وہ آج خود کو اس پر نچھاور کر دے گی۔ وہ اسے یہ یقین بھی دلائے گی کہ اب وہ ماں بننا چاہتی ہے۔

وہ تیار ہو کر واپس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ ہاشم کو اس نے سیڑھیاں اتر کر نیچے آتے دیکھا۔ شکر! وہ کمرے سے باہر تو نکلا۔ وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر فوراً" صوفے پر سے اٹھی اور والہانہ انداز اور خود سپردگی سے اس کے گلے لگ گئی۔

"میری جان پر بن گئی تھی ہاشم! اس طرح ناراض کیوں ہو گئے تھے؟ جانتے ہو ناں میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔"

ہاشم نے اسے فوراً" ہی دھکا دے کر دور ہٹایا۔ وہ اس چیز کے لیے قطعاً" تیار نہیں تھی۔ اس نے بمشکل خود کو گرنے سے بچایا تھا۔

"ہاشم!" اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ نگاہوں میں سختی اور نفرت لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی بھی نرمی نہیں تھی۔

"میں لمبی بات نہیں کرنا چاہتا مریم! تمہارا بدترین کردار اور ماضی میرے سامنے پوری طرح عیاں ہو چکا ہے۔ کل دوپہر میں تمہارے پاپا کے گھر پر وہ سارا منظر دیکھ کر ہی حیران پریشان رہ گیا تھا۔ مگر کل رات تمہارے سابقہ منگیتر نے جو کچھ مجھے بتایا۔ اسے جان کر میرا خود کو ختم کر دینے کو دل چاہ رہا ہے۔ ایسا گھناؤنا کردار رکھنے والی لڑکی کو میں پچھلے کئی برسوں سے بیوی بنا کر بیٹھا ہوا تھا؟" وہ اسے سخت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"ہاشم! زین بکواس کر رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اپنے ریجیکٹ کیے جانے کا بدلہ لے رہا ہے وہ مجھ سے منگنی توڑنے کا انتقام لے رہا ہے۔"

"بس مریم! اور جھوٹ نہیں۔" ہاشم نے وارننگ دینے والے انداز میں انگلی اٹھا کر اس کی بات بے حد سختی سے کاٹ دی۔

"میں کل تک اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ تم نے پہلی بار جس مرد کو چاہا' وہ میں تھا۔ میں اس معاملے میں بہت انتہا پسند ہوں مریم۔ میری بیوی جب مجھے ملی تھی تو اس کے دل میں کوئی اور تھا۔ اس کے جذبات ان چھوئے نہ تھے' اس سچائی کو جاننے کے بعد میں تمہارے ساتھ رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتا۔ وہ اور ہوتے ہوں گے بے غیرت مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ دوسرے مردوں کے ساتھ راتیں گزار کر آئی عورت میری بیوی نہیں رہ سکتی۔ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں مریم!"

"نہیں ہاشم! نہیں۔ پلیز ایسا مت کرو۔ تم تو مجھ سے بہت محبت کرتے ہو۔ تمہاری خواہش ہے ناں میں تمہارے بچے کی ماں بنوں۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں ہاشم!" اس نے روتے ہوئے اس

کے بازو جکڑ لیے۔
ہاشم نے اس کے ہاتھ جھٹک کر دور ہٹائے تھے۔

"میں کل رات سے کئی ہزار مرتبہ اس بات کا شکر ادا کر چکا ہوں کہ تم میرے بچے کی ماں نہیں بنیں۔ اگر ہماری کوئی اولاد ہو گئی ہوتی تو آج جو فیصلہ میں کرنے جا رہا ہوں' وہ کرنا میرے لیے بے حد کٹھن ہو جاتا۔" وہ اسے دیکھ کر تنفر سے بول رہا تھا۔ ہاشم کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت اور حقارت تھی۔ جیسے وہ کوئی بدبودار اور غلیظ شے تھی۔

"تو تم کون سا غیر شادی شدہ اور کنوارے تھے؟ تین بچوں کے باپ تھے تم۔ یہ میرا احسان تھا تم پر کہ میں نے تمہیں اپنا ساتھ دیا تھا۔" وہ یکدم ہی ہذیانی انداز میں چلائی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس کی حالت غیر تھی۔ وہ جیسے گہرے سمندر میں ڈوبنے سے پہلے ہاتھ پاؤں چلاتی خود کو بچانے کی آخری کوششیں کر رہی تھی۔

"بہت افسوس ہے مجھے اس بات کا۔ بہت شرمندہ ہوں میں اپنے بیوی اور بچوں سے۔ تمہاری محبت میں پاگل ہو کر میں نے ان کے ساتھ بہت ظلم کیا تھا۔ بہت زیادتی کی تھی۔"

"تو اب مداوا کرو اپنی شرمندگی کا۔ دوبارہ نکاح پڑھوالو اپنی اسی بے چاری بیوی کے ساتھ۔" وہ حلق کے بل چلائی۔ اس کے چلانے کے جواب میں ہاشم بالکل ٹھنڈے پرسکون انداز میں بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" وہ اسے دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "تمہاری سب باتیں احمقوں کی طرح مانتے چلے جانے کے باوجود میں نے ایک بات تمہاری نہیں مانی تھی مریم! میں نے رومانہ کو طلاق نہیں دی تھی۔ تب تم سے اس بات کو چھپانے کی وجہ تمہیں دھوکا دینا نہیں' بلکہ تمہاری ناراضی سے بچنا تھا۔ میں تمہارے عشق میں پاگل ہو کر اسے طلاق دے دینا چاہتا تھا' مگر اس نے رو کر مجھ سے منت کی تھی مجھے میری بیٹیوں کے مستقبل کا خیال دلایا تھا۔ میری بیٹیاں بڑی ہو رہی ہیں۔ کل کو ان کی شادی کا وقت آئے گا تو ان کے رشتے طے کرتے وقت ان کی ماں کی طلاق ان کے لیے سوالیہ نشان بن جائے گی۔ میں نے اپنی بچیوں کی خاطر رومانہ کی بات مان لی تھی۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا مریم۔ رومانہ آج بھی میری بیوی ہے۔ اور آج میں واپس اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ صد ہزار بار شکر! کہ میرے بچوں کی ماں ایک شریف اور باکردار عورت ہے۔ تمہارے ساتھ گزارے وقت کو میں یہ سمجھ کر بھلانے کی کوشش کروں گا کہ میں نے عیاشی کے لیے چند سال ایک بدکردار لڑکی اپنے نکاح میں رکھی تھی۔ جب میرا دل بھر گیا' میں نے اسے طلاق دے دی۔" وہ اس کی تذلیل کر رہا تھا۔ جیسے کل رات خود کو پہنچی ہر تکلیف کا اسے بے عزت کر کے اس سے بدلہ لے رہا تھا۔

وہ ہاشم کی تذلیل پر سکتے میں نہیں تھی۔ وہ اس کے جھوٹ پر سکتے میں تھی۔ رومانہ آج بھی اس کی بیوی تھی؟ ہاشم پچھلے کئی سال سے اس سے جھوٹ بولتا رہا تھا؟ یہ شہ مات تھی۔

وہ چاروں شانے چت تھی۔ وہ ہاشم سے لڑنا' اس پر چلانا' ہذیان بکنا سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ حیرت سے گم صم' کھڑی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ساری زندگی وہ لوگوں سے جھوٹ بولتی' انہیں دھوکے دیتی آئی تھی۔ کیا کوئی اسے بھی دھوکا دے سکتا تھا۔

"میں رومانہ اور اپنے بچوں کے پاس واپس جا رہا ہوں مریم! تمہیں طلاق کے کاغذات آج شام تک میرا وکیل پہنچادے گا۔ میں تمہیں پندرہ دن کا نوٹس دے رہا ہوں۔ اگلے پندرہ دن میں میرا یہ گھر خالی کر دو۔ تمہاری وجہ سے اپنے بچوں کو میں نے یہاں سے نکالا تھا۔ اب انہیں پورے عزت اور احترام سے واپس ان کے گھر لاؤں گا۔" ہاشم سرد سے لہجے میں بول رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری اور سختی کے سوا کچھ نہ تھا۔

"رہ گئیں تم تو۔ ویسے یہ میرا دردسر نہیں کہ تم کہاں جاؤ گی۔ مگر پھر بھی اگر تمہیں یاد ہو' اس چند سالہ شادی کے دوران تم نے بہت کچھ مجھ سے تحفے میں وصول کیا تھا۔ میں نے منہ دکھائی میں اپنا ڈیفنس والا بنگلہ تمہارے نام کر دیا تھا۔ تم وہاں جا سکتی ہو۔ نہ جانا چاہو تو مت جانا۔ ویسے بھی تمہارے لیے کوئی نیا شکار پھنسا لینا کون سا مشکل کام ہے۔ پھنسا لینا کوئی میرا جیسا احمق۔ بہرحال پندرہ دن بعد میں رومانہ اور بچوں کو یہاں لے آؤں گا۔ آج کے بعد میں کبھی تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔" استہزائیہ انداز میں حقارت سے بات شروع کرنے کے بعد آخر میں اس کا لہجہ بالکل سرد و سپاٹ ہو گیا۔

اس نے اب غور کیا' ہاشم کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھی۔ وہ تیار نظر آرہا تھا۔ پیچھے سے ملازم بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہاشم کا سوٹ کیس تھا۔ ہاشم سنجیدگی سے اس سے بولا۔

"سوٹ کیس گاڑی میں رکھو۔ میں آرہا ہوں۔"

ملازم سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

ہاشم نے ایک سرد' کاٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔ وہ دونوں ہاتھ لٹکائے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

ہاشم بغیر کچھ کہے لمبے لمبے ڈگ بھرتا لاؤنج سے نکل گیا۔

"ہاشم!" وہ چلائی۔ "رکو ہاشم! میری بات سنو۔" وہ اس کے پیچھے بھاگ کر باہر آئی۔ ہاشم گاڑی گیٹ سے باہر نکال رہا تھا۔ اس کا شوہر اسے دھتکار کر جا رہا ہے۔ وہ اسے طلاق دینے والا ہے۔ نہیں! وہ یہ تذلیل نہیں سہہ سکتی۔ وہ ساری زندگی سر اٹھا کر زندہ رہی ہے۔ اسے کبھی کسی نے نہیں ٹھکرایا۔ اس نے لوگوں کو ٹھکرایا ہے۔

وہ لوگوں کا سامنا کیسے کرے گی؟ وہ اپنے پاپا کا سامنا کیسے کرے گی۔ اسے کچھ تو کرنا چاہیے۔ اسے ہاشم کو طلاق دینے سے روکنا چاہیے۔ وہ بھاگ کر اندر گئی۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی۔ وہ بھاگ کر ہی واپس باہر آئی۔ اس نے طوفانی رفتار سے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"نہیں! ام مریم نہیں ہار سکتی۔ ام مریم کو خدا نے جیتنے کے لیے تخلیق کیا ہے۔ ام مریم کو کوئی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا شوہر اسے بدکرداری کا الزام لگا کر طلاق نہیں دے سکتا۔"

اسے روڈ پر اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی اسپیڈ خطرناک حد تک تیز تھی۔ وہ جنونی انداز میں گاڑی چلا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ ہاشم طلاق کے کاغذات اپنے وکیل سے بنوائے' وہ اپنے پاپا کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ وہ روک سکتے ہیں ہاشم کو ایسا کرنے سے۔ وہ روک لیں گے ہاشم کو اسے طلاق دینے سے۔

جتنی اسپیڈ وہ بڑھا رہی تھی' اتنا ہی اسے لگ رہا تھا' وہ دیر کر رہی ہے۔ وہ پاپا کے پاس پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے ایکسیلیٹر پوری قوت سے دبایا۔ اسے سامنے پاپا نظر آرہے تھے۔

وہ ان کے جتنا نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اسے نفرت سے دیکھتے اتنا ہی اس سے دور جاتے جا رہے تھے۔ اس نے بہت خطرناک موڑ کاٹا۔ وہ غلط طرف مڑی تھی۔

سامنے سے آتے ٹرک کے ڈرائیور نے بریک فوراً" لگانے کی کوشش کی تھی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہت زوردار دھماکا ہوا تھا۔ بہت بلند چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آمنہ آئی سی یو میں تھیں۔ ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ وہ تینوں اسپتال میں موجود تھے۔ شہریار خان بہت پریشان تھے۔ وہ دونوں بھائی اپنی ماں کے لیے بہت پریشان تھے۔

دوپہر تک لیزا بھی ان کے ساتھ وہاں رہی تھی۔ پھر اس کے پاپا کا اس کے پاس فون آگیا تھا۔ انہوں نے اسے گھر بلایا تھا۔ لیزا فوراً" ہی چلی گئی تھی۔ وہ ماں کی وجہ سے اتنا پریشان تھا کہ اسے لیزا سے یہ پوچھنے کا بھی دھیان نہیں آیا تھا کہ اس کے پاپا نے اسے اتنی ایمرجنسی میں گھر کیوں بلایا تھا؟

شہریار خان نے آمنہ کے مستقل معالج کو بھی وہاں بلوالیا تھا۔ شہر کے بہترین ہسپتال میں بہترین ڈاکٹرز کی

زیر نگرانی آمنہ کا علاج ہو رہا تھا۔

دوپہر سے شام اور شام سے رات ہونے لگی تھی۔ آمنہ کو انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ انجائنا کے اٹیک کے بعد فوری بہترین طبی سہولیات ملنے کے باعث خطرہ ٹل گیا تھا، مگر ان کے مستقل معالج کے چہرے پر وہ تینوں کچھ فکر سی دیکھ رہے تھے۔

آمنہ ہوش میں تھیں۔ انہیں آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ باری باری وہ تینوں تھوڑی دیر کے لیے ان کے پاس آئی سی یو میں جا رہے تھے۔

آمنہ، سکندر کو دیکھتے ہی رونے لگی تھیں۔ وہ ان کی حالت بگڑنے سے ڈر رہا تھا۔ دوپہر کے بعد سے آمنہ کے مستقل معالج نے ان کے مختلف ٹیسٹ کروانے شروع کر رکھے تھے۔ انجائنا کے اٹیک کے ساتھ ان ٹیسٹوں کا کیا تعلق تھا؟

وہ اندر ہی اندر ایک عجیب سا خوف محسوس کر رہا تھا۔ گھر پر نویرہ اور علی تھے۔ وہ تینوں اسپتال میں موجود تھے۔ زین نے شہریار خان سے رات میں گھر چلے جانے کو کہا۔ مگر وہ آمنہ کے پاس سے جانے کو آمادہ نہیں تھے۔ دو ہی افراد وہاں رک سکتے تھے، اس لیے مجبوراً" زین کو گھر جانا پڑا تھا۔

وہ تینوں آپس میں آمنہ کی طبیعت کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ ساری رات وہ اور شہریار خان اسپتال میں ساتھ رہے تھے۔ شہریار خان اسے اداسی سے دیکھ رہے تھے، مگر ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

آمنہ خواب آور ادویہ کے زیر اثر ساری رات پرسکون نیند سوتی رہی تھیں۔ بظاہر اب ان کی حالت سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ مگر اگلی صبح ڈاکٹرز انہیں بتا رہے تھے کہ جیسا وہ لوگ سمجھ رہے ہیں، ویسا نہیں ہے۔

یہ اسپتال کا کانفرنس روم کی طرز کا کمرا تھا۔ یہاں آمنہ کے خصوصی معالج کے ساتھ اس اسپتال کے چند اور قابل ڈاکٹرز بھی موجود تھے۔ سکندر اور شہریار خان ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ آمنہ کے کل ہوئے تمام ٹیسٹوں کی رپورٹس ڈاکٹرز کے سامنے رکھی تھیں۔ آمنہ کے مستقل معالج انہیں بہت دل دہلا دینے والی بات بتا رہے تھے۔

"آپ کی مسز کی رپورٹس ٹھیک نہیں آئی ہیں شہریار صاحب! کینسر دوبارہ پھیل رہا ہے اور بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ میں نے احتیاطاً" بلڈ اور یورین ٹیسٹ کروایا تھا۔ مجھے ان کی رپورٹس میں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تو میں نے مناسب سمجھا، تمام ٹیسٹ کروالوں تاکہ ذہن کلیئر ہو سکے۔"

وہ سکتے کی سی کیفیت میں خوف زدہ سا ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا۔

"ڈاکٹر فاروقی! ایسا کس طرح ہو سکتا ہے؟ ابھی چار ماہ پہلے آمنہ کے تمام ٹیسٹ روٹین کے مطابق ہوئے تھے اور ان کی رپورٹس ٹھیک آئی تھیں۔"

جواباً" ڈاکٹر فاروقی نے انہیں ملامت کرتی اور ان کا درد سمجھتی نظروں سے یوں دیکھا تھا، جیسے کہنا چاہتے ہوں بیماری اور شفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ کون جانے چار ماہ پہلے بھی بیماری اندر ہی اندر پھر پھیل رہی تھی، مگر چونکہ اس وقت انہیں پتا چلنا خدا کی منشا نہ تھی چنانچہ ٹیسٹوں کی رپورٹوں میں انہیں کچھ پتا نہ چل سکا تھا۔

"پھر کوئی علاج؟ اب کیا ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب!" وہ باپ کا خوف اور پریشانی پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

"میجر سرجری ہو گی دوبارہ، مگر اس میں رسک بہت ہو گا۔" ڈاکٹر فاروقی پیشہ ورانہ انداز میں بولے۔

وہ دونوں ڈاکٹرز کے دل دہلا دینے والے انکشافات سن کر باہر نکل آئے تھے۔ شہریار خان اس سے ایک قدم آگے تھے۔ وہ سست روی سے پیچھے چل رہے تھے۔ شہریار خان کو جیسے چکر سا آیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے لگے۔

"پاپا!" اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا۔ وہ انہیں پکڑ کر بینچ پر بٹھا دینا چاہتا تھا، مگر شہریار خان یکدم ہی اس کے گلے لگ کر رو پڑے تھے۔

"سکندر! اپنی ماں کو بچالو۔ میں نے اس پر بہت ظلم کیے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہوا میں خود کو کیسے معاف کر پاؤں گا؟"

وہ خود اس لمحہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ باپ سے ناراضی، باپ کا خود پر کیا کوئی بھی ظلم اسے اس پل یاد نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بازو ان کے گرد پھیلا دیے۔ وہ انہیں سنبھال رہا تھا۔

"امو جان کو کچھ نہیں ہوگا پاپا! میں انہیں علاج کے لیے امریکا لے کر جاؤں گا۔ بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے ان کا علاج کرواؤں گا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ شہریار خان نے روتے ہوئے اپنا سر اس کے کندھے پر سے اٹھایا۔

"سکندر! لیزا سے شادی کرلو... جلد از جلد... آمنہ کو بہت ارمان ہے تمہاری شادی کا۔ جس طرح وہ چاہتی ہے، اسی طرح دھوم دھام سے لیزا سے شادی کر لو۔ اس کا جسم تمہارے ہی غم میں گھائل ہے۔ تمہیں خوش دیکھے گی تو شاید اس کے اندر زندہ رہنے کی امنگ پیدا ہو سکے، پھر شاید وہ اپنی بیماری سے لڑ سکے۔" وہ روتے ہوئے اس سے بول رہے تھے۔

"میں لیزا سے اسی طرح شادی کروں گا پاپا! جس طرح امو جان چاہیں گی۔"

وہ دونوں برسوں بعد ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع تھے۔ شہریار خان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ انہوں نے روتے روتے بے اختیار اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

"سکندر! مجھے معاف کر دو بیٹا۔ میں دنیا کا بدترین باپ ہوں۔ میں نے تمہاری زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں مجرم ہوں تمہارا بھی، تمہاری ماں کا بھی۔ آج آمنہ اس حال تک پہنچی ہے تو میری وجہ سے۔"

"پاپا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ پلیز! ایسا مت کریں۔"

اس نے اپنے سامنے بندھے ان کے ہاتھوں کو کھولا۔ باپ سے معافی منگوانا تو اس کی منشا کبھی نہ تھی۔ اس کے غم میں اس کی ماں اس حال کو پہنچ گئی ہے۔ اس کا باپ بہت کمزور اور بوڑھا ہو گیا ہے۔ کبھی جس کی طاقت اور حیثیت کو ایک دنیا تسلیم کرتی تھی، آج وہ اس طرح ٹوٹ کر، بالکل بکھر کر رہ گیا ہے۔ والدین بھی تو اولاد کی بڑی سے بڑی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں، پھر وہ اپنے باپ کے لیے دل کو گداز کیوں نہیں کر سکتا؟

وہ برسوں سے کسی کے سامنے نہیں رویا تھا۔ اس وقت وہ باپ کے سامنے رو پڑا۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ ان کے ہاتھوں کو روتے ہوئے چومنے لگا۔

"مجھے آپ کی اور امو جان کی بہت ضرورت ہے پاپا! مجھے آپ کی اور امو جان کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔" وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے آواز آنسو بہا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

آمنہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ آج شام میں ان کی چھٹی ہو جانی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق فی الحال وہ گھر جا سکتی تھیں۔ ہاں! ان کے کینسر کے علاج میں بہت جلدی کیے جانے کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے کل آمنہ کے معالجین سے میٹنگ کے بعد ہی امریکا میں چند بڑے اسپتالوں سے انٹرنیٹ کے ذریعے رابطہ کیا تھا اور وہاں سے ملی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس نے آج صبح سویرے ہی آمنہ کی تمام رپورٹس وہاں انٹرنیٹ کے ذریعے ارسال کر دی تھیں۔

اس وقت وہ تینوں آمنہ کے پاس کمرے میں موجود تھے۔ آمنہ جاگی ہوئی تھیں۔ ان کے ایک طرف وہ بیٹھا تھا، دوسری طرف زین بیٹھا تھا۔ آمنہ باری باری ان دونوں کے چہروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ بہت کمزور اور بہت بیمار نظر آ رہی تھیں۔

"امو جان! آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ میں لیزا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے آپ چاہیں گی بالکل اسی طرح۔ آپ جس جس فنکشن کے لیے کہیں گی میں وہ فنکشن رکھوں گا شادی پر۔" وہ مسکرا کر انہیں یقین دلا رہا تھا۔

آمنہ نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"لیزا اور محمود صاحب راضی ہیں شادی کے لیے سکندر؟" انہوں نے نقاہت بھری آواز میں بے یقینی سے پوچھا۔

"سب راضی ہیں امو جان! بس آپ کا انتظار ہے۔ آپ جلدی سے طبیعت ٹھیک کر لیں تاکہ جلد سے جلد یہ شادی ہو سکے۔"

اس مرتبہ آمنہ کو یہ جواب زین نے دیا تھا۔

آمنہ نے پہلے زین کے مسکراتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اسے دیکھا تھا۔ وہ زین کی بات کی تصدیق کے لیے سر اثبات میں ہلا کر مسکرا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
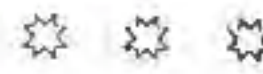
وہ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے پورچ میں آیا۔ اب تک اسے راستے یاد ہو گئے تھے اس لیے وہ گاڑی خود چلا کر جانا چاہتا تھا۔

وہ باہر نکلا تو اسے پورچ میں زین گھر کے چند ملازمین کے ساتھ سیاہ گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ علی بھی وہیں کھڑا تھا۔ پاس ٹوکرے میں پھول رکھے ہوئے تھے بہت خوب صورت اور تازہ پھول۔ زین ملازمین کو ساتھ لگائے دولہا کی گاڑی سجا رہا تھا۔ وہ دوسری گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ زین نے اسے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"کیسی لگ رہی ہے گاڑی؟"

گاڑی کا ایک حصہ پھولوں سے سج چکا تھا۔ زین اسی کو دکھا سکندر سے پوچھ رہا تھا۔

"بہت خوب صورت۔" وہ زین کے پاس آکر رک گیا۔ اس نے مسکرا کر تعریف کی۔

"سکندر پاپا! آج آپ کی شادی ہے ناں لیزا آنٹی کے ساتھ؟" علی کے معصومانہ سے انداز میں بولنے پر وہ ہنس پڑا۔

"ہاں علی! آج تمہارے سکندر پاپا اور لیزا آنٹی کی شادی ہے۔" اس کے بجائے علی کو زین نے جواب دیا تھا۔

امو جان کو اسپتال سے آئے پانچ دن ہو چکے تھے۔ وہ فی الحال مکمل بیڈ ریسٹ پر تھیں۔ ان کے اسپتال سے آتے ہی شہریار خان نے محمود خالد سے مل کر آنا "فانا" شادی اور ولیمہ کا دن طے کر لیا تھا۔

آمنہ کی اسپتال سے گھر واپسی کے موقع پر وہ شہریار خان اور زین کے ساتھ اپنے گھر واپس آگیا تھا۔ پورے بارہ سال بعد۔ اس کی خودداری، خود پسندی اور انا سے کہیں زیادہ قیمتی اس کی ماں کی زندگی تھی۔ اسے گھر میں قدم رکھتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی یاد نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں کبھی نہیں آنا چاہتا تھا۔

شادی کی تیاریاں بھاگ دوڑ کر شہریار خان اور زین نے کی تھیں۔ اس نے تو ان پانچ دنوں میں آمنہ کو جلد از جلد علاج کے لیے امریکا لے جانے کے سلسلے میں کوششیں کی تھیں۔ نکولس کا بڑا بھائی سان فرانسسکو میں ایک جانا مانا اور قابل سرجن تھا۔ اسی نے کسی بہت اچھے اور قابل سرجن کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ جس کے علاج سے کینسر کے کئی مریض صحت یاب ہو چکے تھے۔ رپورٹس یہاں سے اس نے بھیجی تھیں۔ وہاں اس قابل ڈاکٹر تک رسائی نکولس کے بھائی کی وجہ سے آسان ہوئی تھی۔

آمنہ کی رپورٹس دیکھنے کے بعد اس ڈاکٹر نے خاصی امید دلائی تھی کہ ان کا علاج ابھی بھی ممکن ہے اور وہ ایک مرتبہ پھر اس موذی مرض سے صحت یاب ہو سکتی ہیں۔ آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد اسے آمنہ کو سان فرانسسکو لے جانا تھا۔ شہریار خان بھی ان لوگوں کے ساتھ جا رہے تھے۔

کل رات ہی یہ سب کنفرم ہوا تھا اور رات جب اس نے شہریار خان اور زین کو یہ بات بتائی تھی تو ان دونوں کے مایوس چہروں پر امید جگمگانے لگی تھی۔

"امو جان ٹھیک ہو جائیں گی ناں سکندر؟" زین

نے رندھی آواز میں اس سے پوچھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

"ہاں زین! ان شاء اللہ امو جان بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ ان کی آدھی بیماری تو کل مجھے اور لیزا کو شادی کرتے دیکھ کر دور ہو جائے گی اور باقی بیماری اللہ ڈاکٹر کے ذریعے ٹھیک کرا دے گا۔" وہ نرم لہجے میں زین سے بولا۔ وہ زین کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے تسلی دینے کے لیے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ان شاء اللہ۔" زین اس کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

زین کے اور اس کے بیچ گزرے ماہ و سال کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بات ہوتی تھی تو صرف ماں کے متعلق۔ ان کی ماں وہ مرکز تھی جس کے گرد وہ دونوں بھائی ایک ہی امید اور دعا کے ساتھ جمع تھے کہ ماں صحت یاب ہو جائے، ماں کے جسم سے ساری بیماری دور ہو جائے، ماں کے دل کا سارا غم مٹ جائے۔ ماں جو برسوں سے روتی رہی ہے، اب اس کے لبوں پر صرف مسکراہٹیں ہوں اور دل میں فقط خوشیاں۔

"تم کہیں جا رہے ہو؟" زین نے اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں! امو جان کی ایک دوا ختم ہو گئی ہے۔ وہ لینے جا رہا ہوں۔" سکندر قدرے سنجیدگی سے بولا۔ دوسری گاڑی کی طرف جانے کے لیے اس نے قدم اٹھائے تھے کہ علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا۔

"سکندر پاپا! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟"

سکندر رک گیا۔ اس نے مسکرا کر علی کو دیکھا تھا۔

"آ جاؤ علی!"

سکندر کے چہرے پر بھتیجے کے لیے والہانہ چاہت تھی۔ علی بھاگتا ہوا سکندر کے پاس گیا۔ سکندر نے بے ساختہ اسے گود میں اٹھا لیا اور اس کے گالوں پر پیار کیا۔

وہ خاموشی سے بھائی اور بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ ان چند دنوں میں علی، سکندر سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ سکندر کی زین سے ماں کی بیماری سے ہٹ کر کچھ زیادہ بات ہوتی تھی۔ نہ نوریہ سے سلام دعا سے زیادہ کچھ بے تکلف گفتگو، مگر علی سے جیسے اس کی پکی دوستی ہو گئی تھی۔

"آئس کریم کھلائیں گے سکندر پاپا؟"

"میں اپنے علی کو آئس کریم کھلاؤں گا۔" سکندر نے اسے گود میں لیے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ دونوں تایا، بھتیجے میں سالوں پرانی دوستی اور بے تکلفی نظر آ رہی تھی۔

"اور چاکلیٹ بھی دلائیں گے؟" علی کی معصومانہ فرمائشیں جاری تھیں۔

"چاکلیٹ بھی دلاؤں گا۔" سکندر نے اسے آگے اپنی برابر والی سیٹ پر بٹھا لیا۔

وہ بھائی اور بیٹے کو گاڑی میں ساتھ بیٹھ کر جاتا محبت سے دیکھ رہا تھا۔

وہ سکندر سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ علی کو زیادہ سے زیادہ وقت اپنے ساتھ رکھا کرے۔ اس کی خواہش تھی، اس کی دعا تھی کہ علی بڑا ہو کر سکندر جیسا بنے۔ محبت کرنے والا، درگزر کر دینے والا، معاف کر دینے والا، اعلا ظرف رکھنے والا۔

اسے علی میں نہ تو ایک اور شہریار خان چاہیے تھا، نہ ہی ایک اور زین شہریار۔ ان کے دادا جی، ان کے پاپا اور وہ خود انتہا پسند لوگ تھے۔ جنونی اور پاگل لوگ تھے۔ نسل در نسل ان کے خاندان میں چلتا یہ پاگل پن اب ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ جیسے سکندر نے ان کے خاندان میں چلی آتی انتہا پسندی و خود پرستی نہیں لی، وہ چاہتا تھا علی بھی نہ لے۔

برسوں کی دوریاں اور فاصلے تھے۔ سب کچھ دوبارہ پہلے جیسا ہونے میں بہت وقت لگنا تھا۔ سکندر اسے گلے لگا سکے، وہ سکندر سے اپنے دل میں آئی یہ تمام باتیں کہہ سکے، یہ سب ممکن ہو پانے میں ابھی بہت وقت لگنا تھا۔ صدیوں کے فاصلے پل بھر میں تو نہیں سمٹ سکتے تھے۔

علی سے باتیں کرتے ہوئے، اس کی معصومانہ باتوں پر مسکراتے ہوئے سکندر نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال لی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھے جا رہا

تھا۔

سکندر سے دوری اور فاصلے کے سبب وہ بہت کچھ جو وہ کہنا چاہتا ہے، نہیں کہہ پا رہا تھا۔ مگر نوریہ سے تو وہ کچھ کہہ سکتا ہے، جو وہ اس سے سننے کی منتظر ہے۔ گزشتہ کئی دن پہلے سکندر کی پریشانی اور پھر ماں کی بیماری کی بھاگ دوڑ میں گزرے تھے۔ اسے سکون سے بیٹھ کر نوریہ سے بات کرنے کی مہلت نہ ملی تھی، مگر اس پریشانی اور بھاگ دوڑ میں بھی اسے نظر آ رہا تھا کہ بظاہر امو جان اور گھر کے تمام افراد کا پہلے کی طرح خیال رکھتی نوریہ اس سے دور ہو گئی تھی۔ اس سے فاصلے پر چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر لمحہ ایک شکایت ہوتی تھی۔

اسے شادی کے ان گزرے برسوں میں بھی اس نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ اس کی کبھی کسی سے منگنی ہوئی تھی۔ ام مریم کے ان کی زندگیوں میں کسی طوفان کی طرح واپس آ جانے نے ماضی کی ساری راکھ ہی کرید ڈالی تھی۔ جس شوہر کو وہ بلا شرکت غیرے اپنا سمجھتی تھی، کیا وہ ماضی میں کسی کی محبت میں بھی مبتلا رہ چکا تھا؟ اور وہ محبت اتنی زور آور تھی کہ اس نے اپنے سگے بھائی تک کو پورے بارہ سال چھوڑے رکھا تھا؟

اسے نوریہ کے دل کی بدگمانیاں اور ناراضیاں دور کرنی تھیں۔ محبت تو وہ اس سے کرتا ہے ناں! تو کیا حرج ہے، اگر وہ نوریہ کے دل سے بدگمانی مٹانے کو یہ کہہ دے کہ بارہ سال پہلے اسے محبت اور پسندیدگی میں فرق کرنا نہیں آیا تھا۔ ام مریم اپنی غیر معمولی ذہانت اور بے تحاشا حسن کی وجہ سے اسے پسند آ گئی تھی۔ تب وہ پسندیدگی کو محبت سمجھ بیٹھا تھا۔ اگر اس کا یہ جھوٹ نوریہ کے دل کو خوشی دے دیتا ہے، اسے پھر سے اس کے نزدیک لے آتا ہے تو وہ اس جھوٹ کو جائز سمجھتا تھا۔

سکندر کی شادی کے دن، جبکہ ان کے گھر میں خوشیاں بکھری ہوئی تھیں، اس سے اچھا موقع اور کون سا ہو سکتا تھا، نوریہ سے یہ سب کہنے کے لیے۔ اس نے گاڑی کی سجاوٹ کا بقیہ کام نوکروں کو سمجھایا اور خود گھر کے اندر جانے کے لیے مڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

یہ سکندر اور لیزا کے ولیمہ کی رات تھی۔ کل بہت دھوم دھام سے ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی ماں کی خواہش کے مطابق اس کی بارات باپ کے گھر سے گئی تھی۔

آمنہ دولہا کی گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ علی شہ بالا بنا تھا۔ گاڑی زین نے چلائی تھی۔ نوریہ بھی دولہا کی گاڑی میں ان لوگوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔

آمنہ نے شادی کے دن وہی ساڑھی پہنی تھی، جو لیزا کے لیے عروسی ملبوسات کی خریداری کے موقع پر اس نے انہیں دلوائی تھی۔ آمنہ بے تحاشا خوش تھیں۔ وہ کسی پل خوشی سے رو پڑتیں اور اگلے ہی پل کھلکھلا کر ہنسنے لگتیں۔

انہوں نے شادی اور ولیمہ کی تقریبات میں وہیل چیئر پر بیٹھ کر شرکت کی تھی۔ برسوں کی آبلہ پائی کے بعد یہ خوشی اللہ نے انہیں دکھائی تھی۔ ان کی فیملی اکٹھا تھی۔ وہ سب ایک ساتھ تھے۔ ان کا ایک بیٹا ان کے دائیں طرف تھا، دوسرا بائیں طرف۔ وہ اپنے بچوں کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر جیسے پھر سے جی اٹھی تھیں۔

بیماری تو اللہ کے حکم سے آپریشن، علاج اور دواؤں کے ذریعے ہی ان کے جسم سے باہر نکلنی تھی، مگر اتنا اب اسے یقین تھا کہ اس کی امو جان اب اپنی بیماری سے لڑیں گی۔ ان کے اندر زندہ رہنے کی امنگ پھر سے پیدا ہو گئی ہے اور زندہ رہنے کی یہ امنگ ہی انہیں اپنی بیماری سے لڑنے میں مدد دے گی۔

شادی کے تحفے کے طور پر آمنہ نے اسے اور لیزا کو ہنی مون کے لیے اٹلی کا ریٹرن ٹکٹ دیا تھا۔ ماں کی بیماری کے اس مشکل موقع پر نہ اس کا دل تھا ہنی مون کا اور نہ ہی لیزا کا۔ مگر آمنہ کا اصرار تھا کہ وہ دونوں جائیں۔ ابھی ان لوگوں کے امریکا جانے میں دو ہفتے باقی

ہیں تو کیا حرج ہے' اگر اگلا ایک ہفتہ وہ اور لیزا اٹلی میں گزار آئیں۔

وہ جانتا تھا' اس کی ماں اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھرا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔ ماں کے دل کو خوشی دینے ہی کے لیے اس نے لیزا کے ساتھ اٹلی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ولیمہ والی رات ہی ان لوگوں کی فلائٹ تھی۔ نینی بھی ان کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بطور خاص پاکستان آئی ہوئی تھیں۔ شادی کی تقریبات میں شرکت کر کے آج رات انہیں بھی ان دونوں کے ساتھ ہی روم واپس چلے جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

سب لوگ انہیں ایرپورٹ چھوڑنے آئے ہوئے تھے۔ شہریار خان' آمنہ' زین' نویرہ' علی' محمود خالد اور عائشہ۔ آمنہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھیں۔ لیزا کے دونوں ہاتھوں پر مہندی رچی تھی۔ وہ اسٹائلش مگر سادہ لباس میں تھی۔ لیکن اس سادگی میں بھی اس کے نئی نئی دلہن ہونے کا پتا چل رہا تھا۔ لیزا شہریار خان' آمنہ اور نویرہ سے مل رہی تھی۔ شہریار خان نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعائیں دیں' آمنہ نے پیار سے اس کی پیشانی چومی' نویرہ نے پیار سے گلے لگا لیا تھا۔ علی سکندر کی گود میں چڑھا ہوا تھا۔ اس کی سکندر سے بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز میں باتیں ہو رہی تھیں۔

زین خاموشی سے سکندر کو دیکھے جا رہا تھا۔ جب سکندر کی بارات لے کر وہ لوگ گھر سے نکل رہے تھے اس کا دل چاہا تھا' وہ بھائی کے گلے لگ جائے' اسے مبارک باد دے۔ جب سکندر اور لیزا کا نکاح ہوا' اس پل سب کو سکندر سے گلے ملتے اس نے دور سے اور حسرت سے دیکھا تھا۔ اس کا بھی دل چاہا تھا' وہ اس کے پاس جائے' اسے گلے لگا کر خوشیوں کی دعائیں دے مگر ایک جھجک تھی' جو اسے سکندر کے پاس جانے سے روک رہی تھی۔ نجانے سکندر اس کے گلے لگنا چاہے گا بھی یا نہیں؟ سب سے ملنے کے بعد اب لیزا' محمود خالد سے مل رہی تھی۔ وہ اسے خوش دیکھ کر بہت خوش تھے' مگر پھر بھی ان کی آنکھوں میں ایک دکھ جھلک رہا تھا۔ اس دکھ کی وجہ وہ جانتی تھی۔ وہ باپ کے گلے لگ گئی۔

"خوش رہو' بیٹا!" اسے گلے لگا کر پیار کرتے ہوئے انہوں نے دعا دی تھی۔

"اپنا خیال رکھیے گا پاپا۔" باپ کا دکھ محسوس کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم نے مریم کو فون کیا تھا؟" چند لمحوں بعد بہت دھیمی آواز میں انہوں نے اس سے پوچھا۔ اب وہ باپ کے ہاتھ تھامے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جواباً" نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے بہت کوشش کی پاپا! مگر ابھی خود میں اتنا ظرف پیدا نہیں کر سکی کہ اس سے مل سکوں' اس سے بات کر سکوں۔ اگلی بار پاکستان آؤں گی تو اس سے ضرور ملوں گی۔ ہے تو وہ میری بہن ناں پاپا! اسے زندگی بھر کے لیے چھوڑ تو نہیں سکوں گی۔ محبت نہیں رہی مگر خون کا رشتہ تو ہے ناں پاپا۔" بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

سیم کے ایکسیڈنٹ کی اطلاع پا کر محمود خالد نے اسے بلایا تھا۔ وہ اور محمود خالد اسپتال میں سیم کے پاس موجود رہے تھے۔ جب تک سیم ہوش میں نہیں آئی تھی' وہ وہاں موجود رہی تھی' مگر اس کے ہوش میں آتے ہی وہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

اس کے ہوش میں آنے کے بعد وہ اس سے نہیں ملی تھی۔ ان کی فلائٹ کا وقت ہو رہا تھا۔ اب انہیں اندر چلے جانا تھا۔ نینی نے اس کے کندھے کے گرد ہاتھ رکھ کر جیسے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔ وہ لیزا اور محمود خالد کا دکھ محسوس کر رہی تھیں۔

"چلو لیزا! دیر ہو رہی ہے۔" وہ اس سے بولیں۔

سکندر بھی اب ماں' باپ' نویرہ' محمود خالد اور عائشہ سے مل رہا تھا۔

"پاپا! اموجان کی ساری تیاری کروا دیجیے گا۔ میں اگلے ہفتے واپس آجاؤں گا۔"

"فکر مت کرو بیٹا! ساری تیاری ہو جائے گی۔ تم

اور لیزا بس دل بھر کر گھومو پھرو اور انجوائے کر کے آؤ۔" شہریار خان شفقت اور محبت سے بولے۔

اس نے زین کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ زین کے سامنے کھڑا تھا۔

"اپنا خیال رکھنا سکندر!" زین مسکرا کر بولا۔

وہ اب بھی بھائی کے گلے نہیں لگ سکا تھا۔ سکندر نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اسے گلے لگا لیا۔ جیسے اس کے دل کی بات وہ اس کے کہنے بنا ہی جان گیا تھا۔

"تم بھی اپنا خیال رکھنا زین!" وہ اسے گلے لگائے لگائے بولا۔

اور زین شہریار نے زندگی میں پہلی بار اپنے بڑے بھائی پر فخر کیا تھا۔ رشک کیا تھا۔ کسی نفرت یا حسد میں مبتلا ہو کر نہیں' مگر اسے رشک سے دیکھتے یہ سوچا تھا کہ کاش! وہ بھی سکندر جیسا ہوتا۔ اس کی طرح اعلا ظرف اور درگزر کا حوصلہ رکھنے والا۔ اسی کی طرح محبتوں کو بنا لفظوں کے سمجھ لینے والا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے فلیٹ میں تنہا تھی۔ ساحل سمندر سے نزدیک یہ فلیٹ کئی برس پہلے اس نے اس وقت خریدا تھا' جب محمود خالد نے اپنی کچھ پراپرٹی ان دونوں بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی تھی۔ تب لیزا نے روم میں اور اس نے کراچی میں اپنے لیے فلیٹ خریدا تھا۔ اس کے فلیٹ کے لیونگ روم کی بڑی بڑی فرنچ ونڈوز سے سمندر کا خوب صورت منظر نظر آتا تھا۔ تب اس منظر کی دلکشی سے مسحور ہو کر اس نے یہ فلیٹ خریدا تھا۔

اب یہ منظر اس کے چوبیس گھنٹوں کا ساتھی تھا۔ وہ دن کے چوبیس گھنٹے یہاں ان کھڑکیوں کے سامنے وہیل چیئر پر بیٹھ کر سمندر کو دیکھتے ہوئے گزار دیا کرتی تھی۔ اس خوفناک ایکسیڈنٹ میں اس کی جان بچ گئی تھی۔ کاش! نہ بچی ہوتی۔ مگر اس کی قسمت میں بچ جانا اور معذور اور اپاہج ہو کر وہیل چیئر آجانا لکھا تھا۔ ہاشم کے کسی پیسے کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ اس کے تحفے میں دیے گھر میں بھی نہیں گئی تھی۔ طلاق کے بعد اب اس کا اس کی کسی بھی چیز پر کیا حق تھا۔ اس کے پاپا نے بہت کوشش کی تھی کہ وہ اسپتال سے آنے کے بعد ان کے ساتھ ان کے گھر چلی جائے' مگر باپ کی نظروں سے گر کر' معذور اور اپاہج ہو کر' ایک بوجھ بن کر وہ ان کے گھر پر کیسے جا سکتی تھی؟

ام مریم ساری زندگی سر اٹھا کر زندہ رہی تھی۔ اسے وہیل چیئر سے اٹھنے بیٹھنے' لیٹنے' باتھ روم جانے ہر چیز کے لیے مدد درکار ہوتی تھی۔ سو اس کام کے لیے اس نے ایک کل وقتی میڈ رکھ لی تھی۔

محمود خالد روز شام میں اس کے پاس آتے تھے۔ وہ چند گھنٹے اس کے پاس گزارتے تھے۔ اس دوران وہ دونوں ہی خاموش رہتے تھے۔ بہت بولنے' بہت چہکنے' بہت تیز تیز زندگی کی دوڑ میں شامل ام مریم بولنا ہی بھول گئی تھی۔ اس کے پاس لفظ گم ہو چکے تھے۔ اس کے اور اس کے باپ کے درمیان چند مختصر جملوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ جیسے آج اسے ان سے پتا چلا تھا کہ لیزا اور سکندر ہنی مون کے لیے اٹلی گئے ہوئے تھے۔

"لیزا بہت خوش ہو گی؟" اس نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں باپ سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ باپ کی نظروں میں اپنے لیے دکھ اور مایوسی نہیں دیکھ پاتی تھی' اس لیے ان سے نظریں نہیں ملایا کرتی تھی۔

"یہاں سارا دن اکیلے رہ کر پتا نہیں کیا کیا سوچتی رہتی ہو بیٹا! میرے ساتھ گھر چلو۔" آج پھر جانے سے پہلے انہوں نے اسے سمجھایا تھا اور روزانہ کی طرح اس نے پھر انکار کیا تھا۔

"پاپا! مجھے اس قید تنہائی میں رہنے دیں۔ میں دنیا کا اور لوگوں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔"

روزانہ کی طرح اسے سمجھانے میں ناکام ہو کر محمود خالد مایوس اپنے گھر لوٹ گئے تھے۔

ماں' باپ کیا ہوتے ہیں۔ باپ کا دل دکھانے میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' مگر آج جو بلاناغہ

روز اس کے پاس آتا تھا' اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا تھا' اس کے لیے سب سے زیادہ مضطرب رہا کرتا تھا اور جو اسے معذور و لاچار دیکھ کر پہروں رویا کرتا تھا' وہ اس کا باپ ہی تھا۔ وہ ان کی نظروں سے گر چکی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ مگر باپ کی نظروں سے گر کر اس کے لیے جینا بہت دشوار ہو گیا تھا۔

ساری زندگی کبھی رک کر کچھ سوچا نہیں تھا کہ زندگی کے ہنگامے فرصت نہیں لینے دیتے تھے۔ آج سوچنے کے لیے فرصتیں ہی فرصتیں تھیں۔ سچا دوست زندگی میں کوئی بنایا نہیں تھا' جو ماسک لگے چہرے اور مصنوعی محبتیں اس نے اپنے گرد جمع کر رکھی تھیں' وہ اس کے وہیل چیئر پر آتے ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ پارٹیز' ورک شاپس' کانفرنسز' سیمینارز' چیریٹی شوز' فنڈ ریزنگ کمپین... اب اس کے کسی بھی دوست کو ایسے کسی بھی موقع پر اس کی یاد نہیں آئی تھی۔ یہ سب کچھ ایک دم ہی اس کی زندگی سے باہر نکل گیا تھا۔

حاصل زندگی یہ تھا کہ اس کے پاس صرف ایک رشتہ۔

اس کا باپ۔

جو مجبور تھا آج بھی اس سے محبت کرنے پر۔

زندگی اسی طور گزر رہی تھی کہ صبح سے شام اور شام سے رات یونہی خاموشی سے سمندر کو دیکھتے تمام ہو جایا کرتی تھی۔ وہ ہر روز سکندر کو بھی سوچتی تھی اور لیزا کو بھی۔ سکندر کا خیال اسے پہروں بے چین رکھتا تھا۔ وہ شخص' جسے اس نے چاہا تھا۔ وہ شخص جس نے اسے ٹھکرایا تھا اور جس سے اپنے ٹھکرائے جانے کا بدلہ اس نے اسے اس کے گھر والوں کی نظروں سے گرا کر اور اس کے گھر سے نکلوا کر لیا تھا۔ جو اس نے بارہ سال قبل سکندر کے ساتھ کیا تھا' آج وہی سب کچھ اس کے ساتھ ہو گیا تھا۔

سمندر اس سے باتیں کرتا تھا۔ سمندر اسے بعض دفعہ بہت سچی اور کڑوی باتیں کہہ جاتا تھا۔ سمندر اسے کہتا تھا کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا' وہ خدا کا انصاف ہے۔ وہ اپنے باپ کی نظروں سے گر گئی تھی۔ اس کی بہن اسے عمر بھر کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ اس کے شوہر نے اسے ذلتوں کے ساتھ اپنے گھر سے اور اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔

سمندر کہتا تھا' اسے سکندر کی آہ لگی تھی۔ سکندر نے قبولیت کے کسی لمحے میں بڑے سچے دل سے اسے بددعا دی ہو گی۔ تب ہی تو اس کے مقدر میں اللہ نے موت نہیں' یہ معذوری والی زندگی لکھ دی.... کسی کو اپنے آگے خاطر میں نہ لانے والی ام مریم کے ارد گرد سے اس کے تمام چاہنے والے' اس پر نثار ہونے والے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ تنہا رہ گئی تھی۔ صبح سے رات تک اس کے پاس سوچیں ہی سوچیں ہوتی تھیں۔ کسی کسی پل پچھتاوے بھی ہوتے تھے۔ کاش! وقت ایک بار پھر پیچھے کی طرف چلا جائے کاش! اب کی بار وہ' وہ سب کچھ کرے گی' جو پاپا اس سے چاہتے ہیں۔

وہ ممی کا گھر خراب نہیں کروائے گی۔ وہ ممی کے شوہر کو اپنی طرف مائل نہیں کروائے گی۔ وہ پاپا کے پاس لندن چلی جائے گی۔ وہ اپنے اندر وہ سب خوبیاں پیدا کرے گی' جو لیزا میں ہیں۔

وہ لیزا سے کہے گی' وہ اس کی ذہانت لے لے' اس کا حسن لے لے۔ بدلے میں اپنا بہت عام اور معمولی ہونا اسے دے دے۔ اپنا بے وقوف ہونا اسے دے دے۔ کوئی اسے بے وقوف بنائے' اسے استعمال کرے تو اسے پتا بھی نہ چلے۔ اپنا ایسا احمق اور سادہ ہونا اسے دے دے۔

اسے اس کے حسن اور ذہانت کے عوض محمود خالد اور سکندر شہریار دے دے۔ جب وہ لیزا جیسی ہو گی تو ملیں گے ناں' اسے محمود خالد اور سکندر شہریار؟ ملیں گی ناں' اسے ان دونوں کی محبتیں اور ان دونوں کا ساتھ؟

کاش! وہ مریم نہ ہوتی۔ کاش! وہ لیزا ہوتی۔ اسے حسن نہیں چاہیے۔ اسے ذہانت نہیں چاہیے۔ اسے لیزا جیسا دل چاہیے۔ وہ لیزا کیوں نہیں؟ وہ لیزا جیسی کیوں نہیں؟

☆ ☆ ☆

یہ اٹلی میں ان کا آخری دن تھا۔ ان آٹھ دنوں میں وہ دونوں نیپلز' فلورنس' Tivoli سب جگہ گئے تھے جیسے تمام یادوں کو تازہ کر رہے ہوں۔ انہوں نے پہلے ساتھ گئی کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔ تب روم میں جو جگہیں وہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ لیزا نے اب اسے دکھا دی تھیں۔

وہ لیزا کے فلیٹ پر ہی ٹھہرے ہوئے تھے' جہاں نیتی انہیں مزے مزے کے کھانے پکا پکا کر کھلایا کرتی تھیں۔ روبرٹو نے ان دونوں کی اپنے گھر پر دعوت کی تھی۔ وہ ان دونوں کی شادی پر بہت خوش تھا۔

"مجھے تب ہی لگتا تھا' کوئی چکر ہے تم دونوں کے بیچ۔ لیزا جس طرح تمہارے ایکسیڈنٹ پر پریشان ہوئی تھی' تمہیں اپنے گھر لے گئی تھی' میں تب ہی سمجھ گیا تھا' معاملہ گڑبڑ ہے۔" وہ ہنستے ہوئے ان دونوں سے بولا اور جواباً" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

آج روم میں اس آخری دن وہ دونوں ٹریوی فاؤنٹین آئے ہوئے تھے۔ لیزا بڑے اہتمام سے پینٹنگ کا سامان ساتھ لائی تھی۔ وہ آج ٹریوی کو پس منظر میں رکھتے ہوئے اس کی پینٹنگ بنانا چاہتی تھی۔

"پھر پانی؟" اس نے مسکرا کر لیزا سے پوچھا۔

"ہاں! پھر پانی سینور سکندر۔" وہ شرارتی انداز میں ہنسی۔

"ہاں میں بھول گیا تھا' تمہیں پانی اور مجھ میں بہت کچھ ایک جیسا لگتا ہے۔" وہ دونوں فاؤنٹین کے نزدیک کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح وہاں سیاحوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

"میں سکہ اچھالوں؟" سکندر نے اس سے پوچھا۔ لیزا ایک طرف اپنا پورٹیبل ایزل سیٹ کر رہی تھی۔

"اچھالو۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ٹھیک ہے! میں سکہ اچھالتا ہوں۔ تم میری تصویر کھینچو۔" اس نے جیب سے والٹ نکال کر ایک سکہ نکالا۔ کسی ٹورسٹ کی طرح کیمرا اس کے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔ اس نے وہ لیزا کو پکڑا دیا۔ وہ بالکل صحیح انداز سے سکہ پکڑ کر کھڑا تھا۔ اس کی پشت فاؤنٹین کی طرف تھی ہاتھ کندھے سے اونچا تھا اور اس میں اس نے مضبوطی سے سکہ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے سکہ پانی میں اچھالا۔ لیزا نے اس کی کئی تصاویر لی تھیں۔ تصاویر لینے کے بعد وہ اس کے پاس آ گئی۔

"تم نے کیا خواہش کی؟"

"بتا دوں؟"

"ہاں! بتاؤ ناں۔"

"تم پینٹنگ' روما اور مجھے کبھی بھی نہ چھوڑو۔ یہ دعا کی ہے میں نے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں چاہتوں کے ہزار رنگ جھلملا رہے تھے۔ لیزا کھلکھلا کر ہنسی۔

"جانتی ہو لیزا! تمہارا روما مجھے کیوں پیارا ہے؟" اس نے لیزا کا ہاتھ تھاما۔

"کیوں؟"

"اس لیے کہ لیزا کو اپنا روما بہت پیارا ہے۔ میں تمہارے ساتھ یہاں بار بار آنا چاہتا ہوں لیزا!"

اور لیزا اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبتیں ہی محبتیں پا رہی تھی۔

☆

نگہت سیما

ایک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشیلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام "حور عین" دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"الریان" کے سربراہ عبدالرحمٰن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

"مراد پیلس" کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمٰن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (مومی) "الریان" آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ فلک شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ زریں جائیداد کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن شاہ کی بہن مروہ کی سسرالی رشتے دار مائرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن، فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کر دیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ"

مکمل ناول

الریان" والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرکے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایبک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مائرہ اور بیٹی رانیل کے علاوہ سب ایبک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ عمر احسان ایبک کا فین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی اریب فاطمہ جوکہ مروہ پھپھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے ایبک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت تڑپتے ہیں۔ عمارہ کو انجائنا اٹیک ہوتا ہے تو عبدالرحمن شاہ بھی بیمار ہوجاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا' حسن رضا اور زبیدہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہینڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی' کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملواتا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔

عمارہ کی طبیعت بہتر ہوتے ہی ایبک انہیں بابا جان عبدالرحمن شاہ کی بیماری کا بتاتا ہے۔ عمارہ یہ سنتے ہی بابا جان سے ملنے کے لیے بے چین ہوجاتی ہیں۔

احسان شاہ' فلک شاہ کو مائرہ سے اپنی محبت کا احوال سناتا ہے تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ کیونکہ مائرہ نے اس سے کھل کر اظہار محبت کردیا ہے جوکہ اس کا رشتہ عمارہ سے طے ہوچکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتا ہے۔

احمد رضا کو پولیس گرفتار کرکے لے جاتی ہے۔ اس پر الزام ہے کہ ایک شخص اسماعیل جو خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے' لوگوں کو بہکا رہا ہے۔ احمد رضا' اسماعیل سے ملتا ہے۔ احمد رضا کو اس کے والد گھر لے آتے ہیں۔

الوینا جو اسماعیل کے ہاں احمد رضا کو ملی تھی۔ وہ اسے فون کرکے بلاتی ہے۔ وہ وہاں جاتا ہے تو اس کی ملاقات اسماعیل سے ہوتی ہے۔ اسماعیل' احمد رضا سے کہتا ہے کہ احمد رضا کو دولت' عزت اور شہرت ملنے والی ہے۔ احمد رضا مسحور ہوجاتا ہے۔ ہمدان کو عمارہ پھوپھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی' لیکن گھر والوں کے شدید ردعمل نے اسے مایوس کردیا۔ نئی نسل میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پھوپھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

اریب فاطمہ مروہ پھوپھو کی سسرالی رشتہ دار ہے' جسے مروہ پھوپھو پڑھنے کے لیے الریان لے آئی ہیں' یہ بات مائرہ بھابھی کو پسند نہیں ہے۔ ایبک' عمارہ کو لے کر بابا جان کے پاس آیا تو اتنے عرصہ بعد انہیں دیکھ کر بابا جان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔

۳
تیسری قسط

فلک شاہ نے اپنی وہیل چیر کھڑکی کے قریب کرکے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ یک دم ہی کمرے میں خنکی کی لہر سی آئی اور ٹھنڈی ہوا ان کے چہرے سے ٹکرائی لیکن یہ خنکی اور ٹھنڈک انہیں بری نہیں لگ رہی تھی۔ انہوں نے کھڑکی سے سامنے نظر آتے آسمان کو دیکھا۔ آسمان بالکل شفاف تھا اور ستارے پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ سیاہ آسمان پر جگمگاتے ستارے دیکھتے رہے۔ یہ منظر انہیں بہت حسین اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

سینکڑوں بار انہوں نے اس کھڑکی سے آسمان پر جگمگاتے تاروں اور چاند کو دیکھا تھا۔ لیکن آج آسمان پر یہ جگمگ جگمگ تارے جتنے اچھے لگ رہے تھے' اس سے قبل اتنے اچھے کبھی نہیں لگے تھے۔ آج ان کی عمو چھبیس سال بعد اپنے بابا جان سے ملی ہوگی۔ وہ منظر کتنا حسین ہوگا۔ جب چھبیس سال بعد بابا جان نے اپنی عمو کو سینے سے لگایا ہوگا۔ کاش وہ بھی اس حسین منظر کا حصہ بن سکتے۔ ایبک نے تو کہا بھی تھا۔ "بابا جان! آپ بھی چلیں۔"

لیکن وہ خود میں ان سب کا سامنا کرنے کی ہمت

نہیں پا رہے تھے۔ کہیں ان کی وجہ سے کوئی بد مزگی نہ ہوجائے۔ کہیں چھبیس سال بعد عمارہ کو محض ان کی وجہ سے مایوسی نہ ہو۔ وہ تو ان کی اپنی ہے۔ اپنا خون نہیں! مجھے نہیں جانا چاہیے۔ انہوں نے فیصلہ کیا تھا۔

عمارہ حیران تھیں۔ "یہ اچانک کیوں' بابا جان تو ٹھیک ہیں نا؟" عمارہ نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ پلیز ایسا کچھ مت سوچیں بس وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس عمر میں ان کے لیے سفر کرنا آسان نہیں ہے تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کو لے آؤں۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو نا ایبک! بابا جان نے ایسا کہا۔ انہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش کی؟" عمارہ کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ایبک نے نظریں چرالیں۔

عمارہ کی خوشی ان کے چہرے' ان کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ فلک شاہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ کتنے سالوں بعد انہوں نے عمارہ کی آنکھوں میں خوشی کی یہ چمک دیکھی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ان کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی۔

"لیکن آپ! میں "الریان" تو نہیں جاسکتی' پھر۔"

"تو کیا ہوا ماما جان!" ایبک نے بہت محبت سے ان کے ہاتھ تھامے۔ "اس ناچیز کا بھی تو ایک ٹھکانا ہے وہاں۔ بابا جان وہاں آجائیں گے۔"

اور عمارہ کی آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی۔ ایبک کا خیال تھا کہ وہ راستے میں آرام سے انہیں بابا جان کی بیماری کا بتائے گا۔ ابھی تو وہ خود ایک اٹیک بھگت چکی تھیں۔

"آپ بھی ساتھ چلتے تو۔" عمارہ کے اٹھتے قدم رک سے گئے تھے۔

"تم جاؤ عمو! بابا جان سے میری طرف سے معافی مانگنا۔ میری سفارش کرنا۔ تو میں پھر آجاؤں گا اور تمہارا جتنے دن دل چاہے وہاں رہنا' ایبک کے پاس روز بابا جان سے ملنا بلکہ بابا جان کو اتنے دن وہاں ہی رکھ لینا اور اگر وہ مان جائیں تو انہیں ساتھ لے آنا یہاں۔ میری بالکل فکر نہ کرنا۔ انجی ہے نا میرے پاس۔"

بہت سارے خواب عمارہ کے آنچل میں باندھ کر انہوں نے انہیں روانہ کردیا تھا۔ باہر آسمان پر نظر جماتے ہوئے ایک بار پھر ان کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آگیا تھا۔

عمارہ کے جانے کے بعد ہسپتال کا وہ کمرا "الریان" کے باسیوں سے بھر گیا ہوگا۔ عمو بابا جان سے جڑی بیٹھی ہوگی اور اس کی آنکھیں نیر بہا رہی ہوں گی۔ اور وہاں سب ہوں گے۔

مصطفیٰ بھائی' ثنا بھابھی' ان کے بچے۔

احسان شاہ۔ مائرہ

اور مائرہ کا تصور آتے ہی وہ چونکے۔ کئی تلخ یادوں نے ان پر یلغار کردی تھی۔

کیسی عورت تھی یہ مائرہ بھی۔ ان کے اندر تلخی بھر گئی۔

جسے نہ اپنی عزت نفس عزیز تھی نہ دوسروں کی ۔۔۔ عمارہ کے ساتھ منگنی کے بعد وہ بابا جان کی ہدایت پر ہاسٹل منتقل ہوگئے تھے۔ لیکن ان کا دل تو "الریان" میں دھڑکتا تھا اور وہ خود "الریان" کے سب باسیوں کے دلوں میں دھڑکتے تھے۔ ہفتے میں تین بار وہاں جانے کے باوجود انہیں لگتا تھا جیسے ان میں اور "الریان" میں بڑی دوریاں ہوگئی ہیں۔ ان کا بس چلتا تو وہ پورے "الریان" کو اٹھا کر ہاسٹل کے کمرے میں لے جاتے۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ بابا جان نے اگر انہیں ہاسٹل میں رہنے کو کہا تھا تو یقیناً "کوئی مصلحت ہوگی۔ احسان ان سے زیادہ بے تاب رہتا تھا ان سے ملنے کو اور وہ نہ جاتے تو وہ آجاتا ہاسٹل اور اکثر تو وہ ان کے پاس ہی سو جاتا تھا۔

"یار! میں مائرہ سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس رات وہ

ہاسٹل میں ہی تھا اور ان کا روم میٹ جو گھر گیا ہوا تھا' اس کے بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

"تو مل لو نا کسی روز کالج آ کر۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

"لیکن وہاں کالج میں اس سے حال دل کیسے کہوں۔ کہیں باہر ملنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن کہاں؟" وہ پریشان ہوئے۔ "اور کیا یہ مناسب ہے شانی! پھر وہ مروہ پھپھو کی نند کی بیٹی ہے۔"

"تو کیا کروں؟ کیسے اس تک حال دل پہنچاؤں؟"

"تو پہنچا تو دیا تھا تمہارا حال دل اس تک۔"

"لیکن اس نے کوئی رسپانس بھی تو نہیں دیا۔"

"کیسا رسپانس یار! کیا اب وہ تمہیں لو لیٹر لکھے؟" وہ جھنجلائے۔ "تمہاری خواہش اس نے جان لی۔ اب سیدھے سبھاؤ اسے رشتہ بھجوا دو۔"

"لیکن موی یار! وہ پہلے مصطفیٰ بھائی اور عثمان بھائی ـــــ"

"دیکھو شانی! تم اماں جان سے بات کرو۔ مروہ پھپھو کا ووٹ اپنے حق میں کرو اور فی الحال صرف بات طے ہو جائے۔ شادی وغیرہ عثمان بھائی اور مصطفیٰ بھائی کی شادی کے بعد سہی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس ویک اینڈ پر رحیم یار خان جا کر پھپھو سے بات کرتا ہوں۔ وہی اماں جان سے بھی بات کریں گی۔"

احسان مطمئن ہوا تھا لیکن وہ مطمئن نہیں تھے۔ مائرہ ان کے ڈپارٹمنٹ میں آجاتی تھی۔ انہیں مجبوراً" بات کرنا پڑتی۔ وہاں وہ تماشا نہیں بنانا چاہتے تھے۔ کھردرے انداز میں رسمی سی بات کرتے پھر بھی چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

ایم اے فائنل ایر کی مائرہ اور تھرڈ ایر کا فلک شاہ۔

نہیں! یہ بہت غلط ہو رہا تھا۔ یہ افواہیں کون پھیلا رہا تھا؟ یقیناً" مائرہ ہی تھی جو جان بوجھ کر ایسا کر رہی تھی ان کے ادھر صرف چند ماہ رہ گئے تھے لیکن ان چند ماہ میں اس نے انہیں زچ کر کے رکھ دیا تھا۔ اگر وہ مروہ پھپھو کی نند کی بیٹی نہ ہوتی اور اگر احسان شاہ بیچ میں نہ ہوتے تو وہ اس کو سبق سکھا سکتے تھے' لیکن اب وہ تنگ آگئے تھے۔ تب ایک روز انہوں نے اسے روک لیا۔

"سنیے مائرہ! آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟"

"کیا تم نہیں جانتے موی! کہ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں؟" الریان کے باسیوں کی طرح وہ بھی اسے موی کہہ کر بلانے لگی تھی۔

"اس میں آپ کی ہی بدنامی ہے مائرہ! میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"تمہارا کیسے کچھ نہیں بگڑے گا؟" وہ پراسرار انداز میں مسکرائی تھی۔ "جب "الریان" میں تمہارے اور میرے "افیر" کی اطلاع پہنچے گی تو تمہاری وہ نام نہاد منگنی خود بخود ٹوٹ جائے گی۔"

"تو آپ کیا سمجھتی ہیں کہ پھر میں آپ سے شادی کرلوں گا۔ لعنت بھیجتا ہوں میں آپ پر اور آپ جیسی لڑکیوں پر۔"

"میں تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کردوں گی فلک شاہ!"

وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ انہوں نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا تھا اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے کالج سے باہر نکل آئے۔ ان کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس کے منہ پر ایک تھپڑ ماریں اور اسے گھسیٹتے ہوئے اس کے ماں باپ کے سامنے لے جائیں لیکن ـــــ

انہوں نے مٹھیاں بھینچیں اور اپنے غصے پر قابو پانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ ان کی اچھی بھلی زندگی میں یہ لڑکی کہاں سے آگئی تھی فساد پھیلانے۔

اور کیا یہ احسان شاہ جیسے لڑکے کے لائق تھی۔ ہرگز نہیں۔ چاہے احسان کچھ بھی کہے وہ ایک بار تو احسان کو ضرور مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے دل کو سمجھالے اور اس لڑکی کی محبت سے دستبردار ہو جائے۔ ایسے کھوٹے دل اور سازشی ذہن کی لڑکی الریان کے سچے کھرے اور سادہ دل باسیوں میں رہنے کے قابل ہرگز نہیں ہے۔

وہ پتا نہیں کب سے سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے

تھے۔ اس وقت چونکے' جب ایک گاڑی کے بریک ان کے قریب چرچرائے تھے اور شیر دل نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"انی پرابلم (کوئی مسئلہ) فلک شاہ!"

"نہیں۔" شیر دل کو دیکھ کر انہوں نے خود کو کمپوز کیا۔

"تو کیا یہاں خودکشی کے ارادے سے کھڑے ہو۔" شیر دل نے خوش گوار لہجے میں کہتے ہوئے فرنٹ ڈور کھولا۔ وہ یونہی بے دھیانی میں پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئے کہ ایک ساتھ پیچھے کئی گاڑیوں کے ہارن بجے تھے۔

ان کا ذہن اس وقت کام نہیں کر رہا تھا۔

"آج کالج نہیں گئے؟" شیر دل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"گیا تو تھا لیکن رستے سے ہی پلٹ آیا۔"

"تم نے حق نواز کے متعلق سنا۔" شیر دل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"نہیں تو۔ کیا ہوا۔"

"حق نواز کا کل مخالف جماعت کے ایک گروہ سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ جھگڑے میں اگرچہ حق نواز بھی زخمی ہوا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے حق نواز کے خلاف پرچا کٹوا دیا تھا اور پولیس حق نواز کو پکڑ کر لے گئی۔"

"اوہ نو!" فلک شاہ پریشان ہوئے۔ "آنٹی اور انکل تو بہت اپ سیٹ ہوں گے۔"

"ہاں! بہت زیادہ کل سے ضمانت کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں' لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ خیر! تمہیں کہاں جانا تھا۔"

"جانا تو مجھے ہاسٹل ہی تھا' لیکن اب میں حق نواز کے گھر جاؤں گا' آنٹی اور انکل کے پاس۔ آپ مجھے کہیں نزدیک ڈراپ کر دیجیے گا۔"

"میں بھی ماموں جان کی طرف ہی جا رہا ہوں۔" شیر دل نے بتایا۔

"تم کچھ پریشان لگ رہے تھے فلک شاہ؟" شیر دل نے کچھ آگے جا کر پوچھا۔ "کچھ حرج نہ ہو تو تم مجھ سے اپنا مسئلہ ڈسکس کر سکتے ہو۔ تم مجھے اچھا دوست پاؤ گے۔"

وہ دل ہی دل میں شیر دل کے خلوص کا قائل ہوئے تھے لیکن وہ اپنی ـــــ کم از کم یہ پریشانی اس سے شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ شیر دل انہیں پہلی ہی ملاقات میں پسند آیا تھا۔ اور دوسری ملاقات میں تو وہ انہیں اور بھی دل کے قریب محسوس ہوا تھا' یہ ان کی اس سے تیسری ملاقات تھی لیکن وہ شیر دل کو نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ایک لڑکی کے ہاتھوں پریشان ہو رہے ہیں۔

"نہیں ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے شیر دل!" اور شیر دل نے ان سے پھر اصرار نہیں کیا تھا۔

"تمہارے پاس تو تمہاری اپنی گاڑی بھی تھی۔" شیر دل کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔

"ہاں! وہ "الریان" میں کھڑی ہے اور میں آج کل ہاسٹل میں رہ رہا ہوں۔ دراصل میں عام لڑکوں کی طرح ہاسٹل میں رہ کر زندگی انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ بس میں ڈنڈا پکڑ کر دروازے میں ذرا سا پاؤں اٹکا کر یونہی لٹک کر جانے میں بھی اپنا ہی لطف تھا۔"

حق نواز کے ابا اس کی ضمانت کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور اماں کا حال برا تھا۔ وہ انہیں تسلی دے کر ہاسٹل آگئے۔ دو دن بعد کہیں جا کر اس کی

ضمانت ہوئی تھی۔ دوسری جماعت کا تعلق برسر اقتدار پارٹی سے تھا۔ سو ضمانت میں مشکل ہوئی تھی۔ وہ اگلے دو تین دن تک مسلسل حق نواز کے پاس جاتے رہے اور وہاں اس کی پارٹی کے کئی کارکنوں سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سب انہیں محب وطن اور دل میں قوم کا درد رکھنے والے لوگ لگے تھے۔ انہوں نے دل ہی دل میں ان کے جذبوں کو سراہا تھا۔

"ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں شاید جو قوموں اور ملکوں کی تاریخ بدلتے ہیں۔"

حق نواز کے پاس آنے والوں میں سے سب سے زیادہ وہ سر الطاف سے متاثر ہوئے تھے۔ وہ کسی مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ گفتگو کرتے تو جی چاہتا' بندہ سنتا ہی رہے۔ وطن کے حوالے سے بات کرتے تو رقت طاری ہو جاتی تھی۔ "یہ پاکستان یوں ہی نہیں بنا تھا۔ لاکھوں انسانوں کا لہو ہے اس کی بنیادوں میں۔ تم جیسے جوان ہی تھے جنہوں نے اسے بنانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اور اب تم جیسے جوانوں نے ہی اس کٹے پھٹے پاکستان کو بچانا ہے۔

ابھی تو ہمارے زخم ہرے ہیں۔

ابھی تو ان سے خون رستا ہے۔

ابھی تو ترانوے ہزار فوجیوں کے ہتھیار ڈالنے کا دکھ کچوکے لگاتا ہے ہمیں۔ لیکن ہم بھول گئے۔ ہم نے صرف دو سال میں سب بھلا دیا۔ اور اپنی رنگ رلیوں میں پڑ گئے۔"

بات مشرقی پاکستان کے حوالے سے شروع ہوئی تھی اور سر الطاف جذباتی ہو گئے تھے۔

وہ مبہوت سے ان کی گفتگو سنے گئے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا دکھ کسے نہیں ہوا تھا۔

وہ ان دنوں یو۔ اے۔ ٹی میں تھے اور "الریان" میں کتنے ہی دن تک سوگ کی فضا طاری رہی تھی۔ عبدالرحمٰن شاہ کو تو انہوں نے دھاڑیں مار مار کر آنسوؤں سے روتے دیکھا تھا۔ لیکن اب زندگی معمول پر آگئی تھی۔ صحیح تو کہہ رہے تھے سر الطاف کہ ہم بڑی بھلکڑ قوم ہیں۔ بڑی جلدی بھول جانے کا مرض ہے ہمیں۔

حق نواز کی وجہ سے انہیں سیاست سے دلچسپی تو تھوڑی بہت تھی ہی' لیکن آج جب وہ حق نواز کے پاس سے اٹھے تو ان کی جیب میں اس کی پارٹی کی رکنیت کا فارم تھا۔

اور یہ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ آج چھ دنوں بعد وہ "الریان" جا رہے تھے۔

انہیں دیکھتے ہی "الریان" میں شور مچ گیا تھا۔

"کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کدھر تھے' نہ کالج جا رہے تھے اور نہ ہی ہاسٹل میں ملتے تھے' دو دفعہ شانی گیا تمہارے ہاسٹل' ایک بار مصطفیٰ۔" مختلف آوازیں ایک ساتھ ان کے کانوں میں پڑی تھیں۔

"میں کالج نہیں گیا' کیونکہ موڈ نہیں تھا۔" انہوں نے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"اور ہاسٹل میں اس لیے نہیں ملتا تھا کہ میں حق نواز کے پاس چلا جاتا تھا اسپتال۔"

"حق نواز وہی نا جو ایک پارٹی کارکن ہے؟" مصطفیٰ نے پوچھا۔

"جی! لیکن وہ ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا' سو میں اس کی مزاج پرسی کے لیے جاتا رہا۔ پہلے ہسپتال اور پھر گھر۔"

انہوں نے عمارہ کو دیکھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اور اس کی خفگی محسوس کر کے مسکرا دیے۔

"سوری!" مصطفیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم جانتے ہو نا یہ سیاست وغیرہ میں پڑ کر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ تم اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔"

"لیکن مصطفیٰ بھائی میں تو محض اس کی مزاج پرسی کے لیے جاتا تھا۔

وہ مصطفیٰ کو یہ نہیں کہہ سکے تھے کہ اگر 1947ء میں نوجوانوں نے مسلم لیگ میں شامل ہو کر تحریک پاکستان کے لیے کام نہ کیا ہوتا تو آج ہم آزاد ملک کے باسی نہ ہوتے۔

"ہمارے ہاں مثبت سیاست نہیں ہے موی! یہاں ہر پارٹی لیڈر اپنے مفاد کے لیے کام کرتا اور حق نواز جیسے نوجوانوں کو استعمال کرتا ہے۔" مصطفیٰ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور انہوں نے سر ہلا دیا تھا۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی بینا چچی نے مروہ پھپھو کی آمد کی خوش خبری دی تھی اور عمارہ کو ساتھ لے کر کچن میں گھس گئیں اور وہاں کچن ہی سے آواز دی تھی۔

"موی! تم بھاگ مت جانا۔ کھانا کھا کر جانا۔ ارے! پتا نہیں ہاسٹل میں کیسا کھانا ملتا ہو گا۔"

"کیا کچھ خاص پک رہا ہے بینا چچی؟" کچھ دیر بعد وہ کچن کے دروازے کے باہر کھڑے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"پلاؤ' بروسٹ' تمہاری پسندیدہ بادام کی کھیر اور بہت کچھ ہے لیکن...... موی! تم از کم فون تو کر دیتے کہیں سے۔ بھائی جان تو صبح کافی پریشان ہو گئے تھے۔ وہ تو شانی نے انہیں تسلی دی کہ تم خیریت سے ہو ورنہ وہ تو مراد چچا کو فون کرنے والے تھے۔"

"اوہ!" انہوں نے کان کھجائے۔ "دراصل چچی جان! وہ جو حق نواز ہے نا' اس کا کوئی بھائی وغیرہ تو ہے نہیں اور اس کے والد بے چارے بہت اپ سیٹ تھے۔ اکیلے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔" انہوں نے کن اکھیوں سے عمارہ کو دیکھا۔

"خیر! کسی کی مدد کرنا اچھی بات ہے۔" بینا چچی نے انہیں سراہا۔ "بہر حال تمہیں فون کر دینا چاہیے تھا۔"

"سوری! چچی جان۔" انہوں نے کان پکڑے۔

بینا چچی ہنستی ہوئی کچن سے باہر نکلیں تو انہوں نے عمارہ کو مخاطب کیا۔

"ناراض ہو؟"

"نہیں تو......" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"اور ناراض ہونا بھی مت۔ فلک شاہ تمہاری ناراضی برداشت نہیں کر سکے گا۔" وہ یکدم سنجیدہ ہو گئے۔ انہیں مائرہ کا خیال آیا۔ اس کی دھمکیاں یاد آئیں۔ اتنے سارے دنوں سے وہ حق نواز کے معاملے میں الجھ کر اسے بھولے ہوئے تھے۔ لیکن اب یکایک انہیں خیال آیا تھا کہ کہیں......

"اور کبھی مجھ سے بدگمان بھی مت ہونا عمارہ! دنیا کی کوئی لڑکی فلک مراد شاہ کے لیے عمارہ عبدالرحمٰن نہیں ہو سکتی۔ اور یہ یاد رکھنا عمو! کہ اگر کبھی اسے لگا کہ عمارہ اس سے ناراض یا بدگمان ہے تو وہ دوسرا سانس بھی نہیں لے سکے گا۔" عمارہ کی ناراضی کا خول یکدم چٹخا تھا۔

"آپ بھی موی! ہم بس اداس تھے' پریشان تھے کہ آپ اتنے دنوں سے "الریان" کیوں نہیں آ رہے۔" تب ہی بینا چچی ہنستی ہوئی اندر آئیں۔

"اتنا شور' اتنا ہنگامہ ہوا "الریان" میں اور وہ تمہارا سایہ گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہا ہے۔ اب اٹھا کر آئی ہوں اسے۔"

اور تب احساس ہوا تھا انہیں کہ شانی تو ان سب میں تھا ہی نہیں۔

"کہاں غائب تھے موی؟" آنکھیں ملتا ہوا احسان بینا چچی کے پیچھے ہی چلا آ رہا تھا۔

"تمہیں پتا تو ہے یار! وہ حق نواز......"

"ہاں! تمہارے روم میٹ نے بتایا تھا۔ میں دو بار تمہارے ہاسٹل گیا۔ یار! یہ حق نواز جیسے بندوں سے دور ہی رہا کرو۔"

"ہاں! بس وہ زخمی تھا تو چلا گیا تھا۔ ایک جونیئر مجھے اتفاقاً" ہی شیر دل مل گیا تھا تو اس نے بتایا۔"

"اچھا وہ اس کا کزن جو آرمی میں ہے۔"

فلک نے احسان کو اس کے متعلق بتا رکھا تھا۔ آج سے پہلے انہوں نے احسان سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی تھی' لیکن اب چھپا رہے تھے۔ مائرہ کی بات اور اپنی حق نواز کی پارٹی میں شمولیت کی بات۔

وہ احسان کے ساتھ چلتے ہوئے پھر لاؤنج میں آ گئے۔ جہاں اب صرف زارا تھی جو ٹی وی دیکھ رہی تھی اور عثمان تھا جو ایک صوفے پر نیم دراز اخبار دیکھ رہا تھا۔ عثمان اپنی پڑھائی میں اس قدر مصروف رہتا تھا کہ شام کا وقت ہوتا تھا' جب وہ ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھتے یا چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھتا تھا۔ پڑھتا کیا' بلکہ سرسری سا دیکھتا تھا۔ وہ احسان کے ساتھ گونے والے

صوفے پر بیٹھ گئے۔
"میں کالج گیا تھا اور مائرہ سے ملا تھا۔"
"پھر؟" فلک شاہ کا دل زور سے دھڑکا "کچھ نہیں۔۔۔ وہ جلدی میں تھی۔ اسے رحیم یار خان جانا تھا۔ وہ ہاسٹل جا رہی تھی واپس۔
ایک ہفتے کی چھٹی لے کر گھر جا رہی تھی۔" فلک شاہ نے اطمینان کا سانس لیا۔
کم از کم یہ ہفتہ وہ سکون سے کالج جا سکتے تھے اور پھر اگلے مہینے تو فائنل والے فری ہو ہی رہے تھے۔
"میں نے اسے ہاسٹل تک چھوڑنے کی آفر کی تھی' لیکن اس نے منع کر دیا۔ میں نے سوچا تھا' راستے میں بات کر لوں گا' لیکن پتا نہیں کیوں اس کا موڈ آف تھا۔ تم سے تو کوئی بات نہیں ہوئی اس کی؟" احسان اچھا خاصا اپ سیٹ تھا۔
"نہیں یار! مجھ سے تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ تمہیں پتا تو ہے میں کچھ دنوں سے کالج نہیں جا رہا تھا۔
تب ہی مروہ پھپھو کی آمد کا غلغلہ مچا تھا۔ زارا ٹی وی بند کر کے باہر بھاگی۔ مروہ پھپھو کے بچوں سے اس کی بہت بنتی تھی۔
یہ پہلی بار تھا کہ ان کا دل "الریان" میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ وہ سب کے درمیان بیٹھے ہوئے بھی بار بار کھو جاتے تھے۔ کہیں کچھ غلط ہونے والا تھا ——— اور وہ اس غلط ہونے کو روک نہیں سکتے تھے یا اگر روک سکتے تو کیسے۔
مائرہ کیا کر سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ انہیں بدنام کر سکتی تھی۔ جیسا کہ اس نے کہا تھا کہ وہ چاہتی ہے کہ اس کے اور فلک شاہ کے افیئر کے قصے الریان تک پہنچیں اور۔
"نہیں۔۔۔!" فلک شاہ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔
مروہ پھپھو کی ہنگامی آمد۔ مائرہ کا رحیم یار خان جانا۔۔۔ جبکہ یہ آخری دن بہت اہم تھے۔ کالج میں لڑکیاں ہر وقت نوٹس بناتی اور کتابیں رٹتی دکھائی دیتی تھیں۔

چند لمحوں میں فلک شاہ کے سامنے سب کچھ واضح ہو گیا تھا اور وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ فیصلہ کر کے وہ بے حد مطمئن سے ہو کر سب کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے تھے اور تب انہوں نے غور کیا تھا کہ باتیں کرتے کرتے مروہ پھپھو نے کئی بار ان کی طرف بغور دیکھا تھا اور وہ مسکرا دیے تھے اور پھر موقع پا کر باہر جاتے ہوئے انہوں نے مروہ پھپھو کے پاس رک کر کہا۔
"پھپھو! مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا ہے۔ اچھا ہوا' آپ آ گئیں۔ ورنہ شاید میں خود آپ کے پاس آتا۔"
مروہ پھپھو کے ہاتھ سے وہ ٹیڈی بیئر گر گیا تھا جو وہ اپنے چھوٹے بیٹے کو پکڑا رہی تھیں۔ بیٹا اپنا ٹیڈی بیئر لے کر بھاگ گیا تو وہ بھی اٹھ کر لان میں آ گئے۔
لان میں ٹہلنا اور بیٹھنا فلک شاہ کو بہت پسند تھا اور سب ہی جانتے تھے۔ سو کسی نے ان کے باہر جانے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ سب ہی آٹھ بجے والا ڈراما شوق سے دیکھ رہے تھے اماں جان سمیت۔
"موی بیٹا! کیا بات ہے۔" وہ لان میں آ کر چیئر پر بیٹھا ہی تھا کہ مروہ پھپھو آ گئی تھیں۔
تب اس نے ساری بات مروہ پھپھو سے کہہ دی تھی۔ احسان شاہ کی پسندیدگی سے لے کر مائرہ کی حماقت تک۔
"وہ ایسی ہی ہے موی! جنونی سی۔ جس چیز کا اسے جنون ہو جائے' جب تک اسے حاصل نہ کر لے چین سے نہیں بیٹھتی۔"
"لیکن میں چیز نہیں ہوں پھپھو! انسان ہوں۔"
اور تب مروہ پھپھو نے انہیں وہ بتایا تھا جس کا انہیں ڈر تھا۔
"مجھے اس کی بات کا یقین تو نہیں آیا تھا موی! لیکن میں اپ سیٹ ضرور ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے فوراً "الریان" آنے کا پروگرام بنا لیا۔ مجھے عمارہ کی فکر تھی۔ کل شام وہ میرے پاس آئی تھی اور اس نے مجھے اپنے اور تمہارے متعلق بتایا تھا اور کہا کہ

تمہارے ساتھ شادی کی صورت میں عمارہ کی زندگی تباہ ہو جائے گی کیونکہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔"
"ربش۔۔۔" انہوں نے غصے سے ہاتھ کرسی کے ہتھے پر مارا تھا۔ "میں اسے قتل کر دوں گا' جھوٹی' مکار۔"
"ریلیکس موی!"
مروہ نے انہیں تسلی دی تھی۔
"تم بالکل بھی پریشان نہ ہو اور بھول جاؤ۔ میں سب ہینڈل کر لوں گی۔ فی الحال تو میں اسے بہلائے رکھتی ہوں اور اس کا بہتر حل تمہاری اور عمارہ کی فوراً شادی ہے۔ جتنی جلد ہو سکے۔" اور اتنے دنوں بعد وہ پہلی رات تھی' جب وہ سکون سے سوئے تھے۔ رات دیر ہو جانے پر وہ الریان میں ہی رک گئے تھے۔ جب تک احسان شاہ کمرے میں آتے وہ گہری نیند سو چکے تھے۔"

☆ ☆ ☆

زندگی بے حد مصروف ہو گئی تھی۔ وہ کالج سے اکثر پارٹی کے کسی نہ کسی اجلاس میں شرکت کرنے چلے جاتے۔ پارٹی کے ایجنڈے اور مقاصد نے انہیں بہت متاثر کیا تھا۔
"انسان پر اس کے وطن کا بھی حق ہوتا ہے' یہ کیا کہ وہ صرف اپنے لیے جیے اور مر جائے۔" یہ پروفیسر الطاف کا خیال تھا۔
وہ اب پارٹی کے ایک سرگرم رکن تھے۔ لیکن وہ الریان جانا کبھی نہیں بھولتے تھے۔ کالج میں دوبارہ ان کی ملاقات مائرہ سے ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کے پاس سے کترا کر گزر گئے۔ مائرہ کے لبوں پر ایک پرغرور سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس روز غالباً ان کا کالج میں آخری دن تھا۔ وہ گیٹ کی طرف جا رہے تھے کہ اس نے آواز دے کر انہیں روکا۔ وہ رکنا تو نہیں چاہتے تھے' لیکن آس پاس سے کچھ طلبا گزر رہے تھے۔ وہ رک گئے۔
"کیا بات ہے۔۔۔؟" انہوں نے بے حد ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔
وہ تیز تیز چلتے ہوئے ان کے قریب آئی۔ انہوں نے چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ بھی ان کے ہم قدم ہو کر چل رہی تھی۔
"میں آج صرف تم سے ملنے آئی ہوں کالج۔ کل ہمارا لاسٹ پیپر تھا اور آج مجھے واپس رحیم یار خان جانا ہے۔"
اس نے مائرہ کی بات کا جواب نہیں دیا اور یوں ہی چلتے رہے۔
"یوں تمہارے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنا مائرہ حسن کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔"
"اور میں۔۔۔" ان کا غصہ عود کر آیا۔ "میں تمہارے قدموں کے ساتھ قدم ملا کر چلنا تو درکنار تمہیں دیکھنا' بلکہ تم پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔" وہ بڑی نخوت سے مسکرائی تھی۔
"مائرہ حسن کو کبھی زندگی میں شکست نہیں ہوئی موی فلک شاہ اور وہ اب بھی نہیں ہارے گی۔ ایک روز تم اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے فخر محسوس کرو گے۔"
وہ ایک دم ہی رخ موڑ کر دائیں طرف چلی گئی اور وہ حیران کھڑے سوچتے رہ گئے۔
"یہ کیسی لڑکی ہے۔ اتنی بے باک' اتنی ڈھیٹ۔" ستر' اسی کی دہائی میں لڑکیاں اتنی بے باک کب ہوتی تھیں۔ وہ اس کی جرأت پر حیران اور ششدر تھے۔
اگلی صبح وہ بہاول پور جا رہے تھے۔
مروہ پھپھو صحیح کہتی تھیں اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا' اس کی اور عمارہ کی شادی۔
بی اے کے ایگزام ہونے والے تھے۔ وہ بابا جان سے کہیں گے کہ ان کے بی اے کے بعد ان کی شادی کر دی جائے۔ بابا جان نے کبھی ان کی بات نہیں ٹالی تھی اور پھر اگر ضروری ہوا تو وہ سب کچھ بابا جان کو بتا دیں گے۔
"نہیں! وہ اس کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔" وہ اس کی آنکھوں کی چمک سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ وہ

چمک جو فتح کرنے والے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔"

"بابا جان!" انجی کچن کا کام کروا کے کمرے میں آئی تو کمرا خ ہو رہا تھا۔ کھڑکی سے ٹھنڈی اور خنک ہوا اندر آرہی تھی اور فلک شاہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے باہر اندھیرے میں جانے کیا دیکھ رہے تھے۔

"بابا جان! کمرا کتنا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" انجم نے ان کے قریب آکر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ انجم کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

"پتا نہیں کیوں آج یہ ٹھنڈی اور خنک ہوائیں اچھی لگ رہی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ ٹھنڈی ہوا جسم سے ٹکراتی رہے اور اندر سکون سا اترتا رہے۔"

"لیکن بابا جان! ٹھنڈ کہیں نقصان نہ پہنچا دے۔ ابھی تو آپ کا چیسٹ انفیکشن دور ہوا ہے۔ میں کھڑکی بند کرنے لگی ہوں۔"

"لیکن مجھے ابھی سونا نہیں ہے۔" وہ مسکرائے۔ انجم نے کھڑکی بند کرکے ان کی وہیل چیئر کھڑکی کے پاس سے ہٹائی اور بیڈ پر پڑی شال اٹھا کر ان کے کندھوں پر ڈالی اور خود ان کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک ہے بابا جان! آج ہم باتیں کریں گے جب آپ کا سونے کا موڈ بنا تو پھر بتا دیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے!" وہ پھر مسکرا دیے تھے آج برسوں بعد ان کے دل پر پڑا بوجھ کم ہوا تھا۔ آج عموا اپنے بابا جان سے مل رہی ہوگی۔ یہ احساس ہی بڑا خوش کن تھا۔

"بابا جان! آپ مجھے الریان کے متعلق بتائیں۔ نانا جان کے متعلق اور ان سب کے متعلق جو وہاں رہتے ہیں۔" وہ بے حد اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ الریان اور اس کے باسیوں کے متعلق بات کرتے ہوئے تو وہ کبھی نہ تھکتے تھے۔

ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور انجی بے حد شوق اور اشتیاق سے سن رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ ابھی اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ سمیرا ہاتھ میں چائے کا کپ لیے آگئی۔

"چائے پییں گے آپ؟"

"اب اگر بنالی ہے تو پی لیتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر سمیرا کی طرف دیکھا۔

سمیرا چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیا رات کو گیٹ پر چڑھ کر باہر کودے تھے۔ کہاں گئے تھے؟"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"صبح تمہارے گھٹنوں پر رگڑ کے نشان تھے، جبکہ رات جب آئے تھے تو جینز پر کوئی نشان نہیں تھا۔"

"زیادہ جاسوس اعظم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے اپنی گھبراہٹ کو غصے میں چھپایا۔

"مجھے گیٹ پر سے کودنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"مجھے کیا معلوم۔ یہ تو آپ کو پتا ہوگا۔" سمیرا نے کندھے اچکائے۔

"سمو!" اس نے اسے گھورا۔

"عمران سیریز کے ناول پڑھنا چھوڑ دو۔" اس کی نظر سامنے واش روم کے اوپر بنی دو چھتی پر گئی۔ جہاں فالتو سامان پڑا رہتا تھا۔

"میں دو چھتی پر چڑھا تھا۔ اپنے پرانے جوگرز ڈھونڈنے۔"

"تو ایسی کیا ایمرجنسی تھی؟ نیچے سے سیڑھی لے آتے۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

اب پتا نہیں اس نے اس کی بات کا یقین کیا بھی تھا یا نہیں، لیکن اسے بروقت سوجھ گئی۔ یہ پرانے جوگرز اس نے دو دن پہلے ہی نکالے تھے دو چھتی سے۔ کوڑا اٹھانے والا لڑکا کئی دن سے جوتے مانگ رہا تھا۔

"سنو! یہ جوگرز لے جاؤ اور جب کوڑا اٹھانے والا آئے تو اسے دے دینا۔ کب سے جوتے مانگ رہا ہے۔ ننگے پاؤں آتا ہے بے چارہ۔" اس نے سمیرا کی ہمدردی بیدار کرنے کی کوشش کی اور پھر بلاوجہ ہنسا۔

"اور اب جوگرز کا پوسٹ مارٹم کرنے نہ بیٹھ جانا۔ عمران ... کی جانشین۔" سمیرا نے برا سا منہ بنایا اور پھر جوگرز اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"رضی! تمہیں پتا ہے، ابو بہت پریشان ہیں۔"

"بلاوجہ ہی پریشان ہیں۔ میں نے کوئی چوری ڈاکا تو نہیں ڈالا۔" وہ چڑا۔

"ابو نے دو، تین لوگوں سے پتا کیا ہے۔ وہ شخص واقعی غلط ہے۔ اس کے ارادے۔"

"بس کرو سمو! معاف کردو مجھے۔ میں اس وقت نصیحت سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ ابو نے دو گھنٹے جو لیکچر دیا ہے، پہلے اسے ہضم کرلوں، پھر تم اپنا نصیحت نامہ پلانا مجھے۔"

اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور ایک ہی سانس میں کپ خالی کرکے اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ بھی لے جاؤ۔"

"رضی۔" سمیرا کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"مجھے سخت نیند آرہی ہے اور پلیز! تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے، شام کو کہہ لینا۔ اس وقت مجھے سخت نیند آرہی ہے۔"

وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ سمیرا بنا کچھ کہے کمرے سے چلی گئی تو اس نے چھوٹا تکیہ اٹھا کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ سامنے شیشوں سے آنے والی روشنی اسے ڈسٹرب کررہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو چھ بج رہے تھے۔ تین گھنٹے کی نیند نے اسے بہت فریش کردیا تھا۔ وہ کچھ دیر تو یوں ہی بیڈ پر لیٹا رات کی باتیں سوچتا رہا۔ الوینا کا تصور آتے ہی اسے گدگدی ہونے لگی تھی۔

اس کے ہاتھ کا لمس۔

اس کے وجود سے اٹھنے والی مسحور کن خوشبو۔

اور...!

"یہ کیسا اسرار ہے.... وہ سرونٹ کوارٹر سے جاتا راستہ.... وہ اس صراحی میں پڑا مشروب۔ کیا واقعی وہ شراب طہور تھی اور پتا نہیں اس کا ذائقہ کیسا تھا۔ جب میں مقربین میں شامل ہو جاؤں گا تو مجھے بھی وہ پینے کو ملے گی۔" اس کے دل میں بڑی شدت سے اس مشروب کو پینے کی چاہ بیدار ہوئی۔

"اور مے پی، وہ کوئی اور مشروب ہو۔ اللہ کے نیک بندے اور مقرب تو وہ مشروب نہیں پی سکتے۔ کیا پتا یہ شخص واقعی فراڈ ہو اور ابو صحیح کہتے ہوں کہ یہ شخص مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے آیا ہے۔ شیطان کا چیلا، لیکن ابھی تک تو اس نے اسلام کے خلاف کوئی بات نہیں کی اور میں کوئی بے وقوف، ان پڑھ، جاہل نہیں ہوں کہ اس کے جنگل میں پھنس جاؤں گا۔ لیکن اس کی حقیقت تو معلوم ہونا چاہیے مجھے اور وہ لڑکیاں.... وہ تو سچ مچ جنت کی حوریں ہیں۔ پتا نہیں یہ اتنی خوب صورت لڑکیاں کہاں سے آئی ہیں۔ ایک ہی جیسے قد، بت ایک ہی جیسے جسم بس نقوش مختلف تھے۔ جنت کی حوریں کیا ان سے زیادہ خوب صورت ہوں گی؟"

ایک بار پھر الوینا کے ہاتھوں کا لمس اس کے بازو پر جاگ اٹھا۔

نیچے سے چلنے پھرنے اور کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جب باتھ لے کر فریش ہو کر وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا تو اس وقت بھی اس کے تصور میں الوینا کا نازک سراپا تھا اور لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ۔ اس نے اب تک کی زندگی بہت محتاط گزاری تھی۔ کبھی لڑکیوں کے ساتھ اس کا ربط ضبط نہیں رہا تھا، حالانکہ یونیورسٹی میں اس کے ساتھ لڑکیاں بھی پڑھتی تھیں۔ بلکہ اس کی شان دار پرسنالٹی اور خوب صورتی کی وجہ سے کئی لڑکیوں نے اس سے دوستی کرنا چاہی بھی تھی، لیکن اس نے انہیں کبھی کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی، بلکہ ان کی بے چینیوں سے محظوظ ہوتا تھا۔

بچپن سے ہی ابو نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اسے اعلا تعلیم حاصل کرنا ہے اور پڑھ لکھ کر معاشرے میں اپنا مقام بنانا ہے۔ ہم متوسط طبقے کے لوگوں کے پاس صرف تعلیم ایک ایسا ہتھیار ہے، جس کے سہارے ہم معاشرے میں بہتر مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیشہ پڑھائی میں اوپر رہا۔ اس

کی دوستی بھی ایسے ہی لڑکوں سے تھی، جو بہت پڑھاکو سے تھے اور اسی کی طرح ان کے سامنے صرف ایک ٹارگٹ تھا، پڑھائی۔ چند ماہ پہلے تک وہ اپنی اس روٹین سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن چند ماہ پہلے جو اس کے اندر تبدیلی آئی تھی اس کی وجہ غالباً جنید تھا۔ کسی برگر فیملی کا بے حد دولت مند لڑکا۔ عام سی شکل و صورت اور درمیانی ذہانت کا لڑکا، لیکن لڑکے، لڑکیاں اس کے گرد پروانوں کی طرح چکراتے تھے۔ اس نے احمد رضا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جس طرح وہ پیسہ خرچ کرتا تھا، جس طرح وہ قیمتی گاڑیوں میں گھومتا تھا، اس سے اس کے دل میں دولت کی خواہش پیدا ہوئی تھی اور دولت کے ساتھ شہرت کی بھی، لیکن اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھی پڑھائی۔ چنانچہ وہ اور زیادہ محنت کرنے لگا تھا۔

باہر برآمدے میں صرف سمیرا تھی، جو ڈائننگ ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ اس نے آہٹ پر مڑ کر اسے دیکھا اور پھر رخ موڑ کر اپنا کام کرنے لگی۔

"لگتا ہے آپا جان ناراض ہیں سخت۔" اس کے قریب پہنچ کر اس نے شرارت سے کہا۔

اگرچہ سمیرا اس سے تقریباً" چار ساڑھے چار سال چھوٹی تھی، لیکن دونوں میں دوستوں جیسی بے تکلفی تھی اور کبھی کبھی شرارت سے وہ اسے آپا جان کہہ دیتا تھا۔ جب بھی وہ اسے اپنے کمرے میں کپڑے ادھر ادھر پھیلانے پر ٹوکتی تھی۔

سمیرا نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور ہاتھ میں پکڑی صافی سمیت کچن کا رخ کیا تو اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں سمو! اب جو لیکچر دینا ہے دے لو۔ میں ذرا جو ہل جاؤں تو کان پکڑ کر کھڑا کر دینا دھوپ میں دو، تین جتنے گھنٹے کہو گی، تمہارے سامنے بیٹھا تمہارے گولڈن ورڈز دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

"رضی! ہاتھ چھوڑو، میں نے چائے کا پانی رکھا ہوا ہے۔ زیادہ ابل جائے گا۔" اس نے سمیرا کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مسکرایا۔

"تو پھر کب اسٹارٹ کرو گی اپنا لیکچر؟ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"رضی۔" وہ زیادہ دیر بھلا کب اس سے خفا رہ سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نظر آئی۔ "تم ہم سب کی آنکھوں کا خواب ہو رضی! پتا ہے ابو کل رات بھر نہیں سوئے۔"

"میں نے ابو کی باتیں سن لی ہیں اور سمجھ بھی لی ہیں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"میرے لیے بھی میری تعلیم سب سے اہم ہے اور باقی باتیں ثانوی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہماری آپا جان تو بن جائیں مشہور و معروف ڈاکٹر اور ہم انجینئر بھی نہ بن سکیں۔" سمیرا کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اچھا! اب اندر ابو، امی کے ساتھ جا کر بیٹھو۔ میں چائے وہیں لے کر آتی ہوں۔ ابھی باہر تو تپش ہے۔" اس نے صحن کی طرف دیکھا جہاں دھوپ ابھی صحن کی دیواروں سے لپٹی کھڑی تھی۔

"میرے لیے میری تعلیم میرے والدین اور تم دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم ہو۔" اس کے لہجے میں محبت تھی۔

ار وہ جو تم پر شہرت اور دولت حاصل کرنے کا بھوت سوار ہے آج کل۔

سمیرا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"وہ ان سب کے بعد۔" وہ بھی مسکرایا۔ ابو، امی کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے کچن کی طرف جاتی سمیرا کی طرف دیکھا۔

"تمہارا پانی تو اب تک سوکھ چکا ہو گا۔ اب مزید پانی بوائل ہونے تک کچھ کباب اور پاپڑ تل لینا۔ دن کو ٹھیک سے کھایا ہی نہیں گیا۔"

"پیٹ ابو کے لیکچر سے ہی جو بھر گیا تھا۔" سمیرا ہنستی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی اور وہ کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ابو کے ساتھ ہلکی پھلکی باتیں کرتے ہوئے چائے پی گئی۔ حسن رضا کی عادت تھی کہ انہوں نے بات کبھی دہرائی نہیں تھی۔ اب بھی انہوں نے اس

موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ بلکہ گفتگو صرف ملکی حالات اور ان کے آفس کے معاملات تک ہی محدود رہی۔ سات بجنے والے تھے، جب وہ اٹھ کر باہر آیا تھا۔ سمیرا تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔

"کیا پک رہا ہے رات کے لیے۔"

"مکس سبزیوں والی بھجیا۔" سمیرا نے چھلکوں والی ٹوکری اٹھائی اور کھڑی ہو گئی۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ دھوپ اب صحن کی دیوار کے آخری کناروں پر تھی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ سمیرا چھلکے ڈسٹ بن میں پھینک کر آئی اور سبزی والا باؤل اٹھانے ہی لگی تھی کہ فون کی بیل ہوئی۔ فون تخت کے پاس ہی دیوار میں لگے فون اسٹینڈ پر پڑا تھا۔ سمیرا نے فون اٹھا لیا۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور وہ سمیرا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن سمیرا کی "ہیلو، ہیلو" کے جواب میں دوسری طرف سے کوئی نہیں بولا تھا۔ سمیرا ریسیور کریڈل پر ڈال کر باؤل اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی۔ سمیرا ابھی آٹھویں جماعت میں ہی تھی تو اس نے کچن کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا اور اب تو شام کی چائے اور رات کا کھانا روزانہ ہی تقریباً" وہ پکاتی تھی۔ اس نے بے حد محبت اور پیار سے کچن کی طرف جاتی سمیرا کی طرف دیکھا۔

"یہ بہنیں بھی کتنی پیاری شے ہوتی ہیں۔" اس کی ساری ذمہ داریاں تقریباً" سمیرا نے اٹھا رکھی تھیں۔ اس کے کپڑے استری کرنا، اس کے کمرے کی صفائی کروانا وغیرہ۔ سمیرا کچن میں جا چکی تھی۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھ کر وہاں پڑا ایک ڈائجسٹ اٹھا کر دیکھنے لگا۔ گھر کا تمام، کالج کی پڑھائی اور پھر یہ میگزین پڑھنے کا وقت بھی پتا نہیں کیسے نکال لیتی تھی سمیرا۔

اس نے کن اکھیوں سے فون کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں کیوں اسے گمان ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے آنے والے فون کا تعلق کہیں اس سے تو نہیں تھا۔ سو وہ اوپر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔ اسے خواتین کے ڈائجسٹوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اس وقت وہ بہت انہماک سے ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔

سمیرا نے کچن کے دروازے سے جھانک کر اسے دیکھا اور مسکرا دی۔

"بھئی! یہ کہانیاں اتنی بھی بری نہیں ہوتیں۔"

ابھی اس نے چند صفحات ہی پڑھے تھے کہ فون کی بیل پھر ہوئی، اس نے فوراً" ہی ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو!" دوسری طرف الوینا تھی، جو اس کی آواز پہچان کر کہہ رہی تھی۔

"کل صبح تمہاری یونیورسٹی کے نزدیکی پیٹرول پمپ کے سامنے والی بیکری کے پاس تمہارا انتظار کروں گی۔"

ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ گھنٹی کی آواز پر کچن سے باہر آتی سمیرا کو دیکھ کر اس نے دو، تین بار قدرے بلند آواز میں "ہیلو، ہیلو" کیا اور پھر ریسیور رکھ کر ڈائجسٹ اٹھا لیا۔ لیکن اب وہ ڈائجسٹ نہیں پڑھ رہا تھا۔ وہ الوینا کے متعلق سوچ رہا تھا۔ امی جان باہر نکلیں تو انہوں نے لائٹ جلا کر اس کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ یہ رسالہ رکھ دو۔"

"جی!" اس نے فوراً" ہی ڈائجسٹ بند کر کے تخت پر رکھ دیا۔ "میں بس یوں ہی دیکھ رہا تھا۔" وہ کھڑا ہو گیا تو انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

"بیٹا! تمہارے ابو تمہارے بھلے کے لیے ہی سمجھاتے ہیں۔"

"جی امی! جانتا ہوں۔" وہ مسکرایا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"کبھی غلطی سے نماز بھی پڑھ لیا کرو۔" سمیرا شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"نماز ہی پڑھنے جا رہا ہوں آپا جان۔" شرارت سے کہتا ہوا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

☼ ☼ ☼

صبح خلاف معمول وہ سمیرا کے جگانے سے پہلے ہی تیار ہو کر نیچے اترا تو کچن کی طرف جاتی سمیرا نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پہلے اسے اور پھر کلاک کو

دیکھا۔

"رضی! کیا آج سورج مغرب سے طلوع ہوا تھا۔"

اس نے بھی سمیرا کی نظروں کے تعاقب میں برآمدے میں ڈائننگ ٹیبل کے ساتھ والی دیوار پر لٹکے کلاک کی طرف دیکھا۔ ابھی سات بھی نہیں بجے تھے۔ دل ہی دل میں اپنی بے تابی پر شرمندہ ہوتے ہوئے وہ مسکرایا۔

"میں نے سوچا' آج اپنی بہنا کو سیڑھیاں چڑھنے کی تکلیف سے بچالوں۔"

"مہربانی بھیا! ورنہ کل تو محلے والے ڈر کر گھروں سے باہر نکل آئے تھے کہ کہیں زلزلہ تو نہیں آگیا۔"

"اتنے زور سے دروازہ دھڑدھڑایا تھا تم نے۔" اس نے آنکھیں پھاڑیں اور ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں تو تم بھی تو گھوڑے گدھے بیچ کر سوتے ہو۔" سمیرا نے فریج سے ڈبل روٹی اور انڈے نکالے۔

"فرائی یا آملیٹ؟"

"فرائی۔" اس نے ڈائننگ ٹیبل پر پڑا اخبار اٹھالیا تھا اور اب سرسری نظروں سے ہیڈلائن دیکھ رہا تھا کہ اچانک کونے میں ایک چھوٹی سی خبر پر ٹھٹک گیا۔

"کل پولیس نے اسماعیل خان کے تین مختلف ٹھکانوں پر چھاپے مارے' لیکن وہ شخص نہیں ملا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پچھلے تین سال سے وہ لوگوں میں گمراہ کن عقائد پھیلا رہا ہے۔ خیال ہے کہ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔"

"ربش۔" اس نے اخبار ٹیبل پر رکھ دیا۔ "اس نے کبھی دین کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ یہ صحافی بھی بس یوں ہی چھوڑتے رہتے ہیں۔"

ابو بھی تیار ہو کر باہر آگئے تھے۔ اس نے سلام کرکے اخبار ان کی طرف بڑھایا۔

ابو اخبار پڑھنے لگے تھے۔ سمیرا نے ناشتا ٹیبل پر لگا دیا تھا۔ وہ ناشتا کرکے ابو سے پہلے ہی گھر سے باہر آگیا۔ ابو نے بھی حیرت سے اسے جاتے دیکھا اور پھر مسکرا کر ناشتا کرنے لگے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے بچوں پر فخر کیا تھا۔ انہوں نے کبھی انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ چاہے تعلیمی میدان ہو' چاہے غیرنصابی سرگرمیاں۔

وہ دونوں ہمیشہ ٹاپ پر رہتے تھے۔

وہ آگے یونیورسٹی تک جانے کے بجائے پٹرول پمپ کے پاس ہی اتر گیا۔ آج اس نے اپنے اسٹاپ پر کھڑے ہو کر اپنی وین یا بس کا انتظار نہیں کیا تھا' بلکہ پہلے خالی ملنے والے رکشے پر بیٹھ گیا تھا۔ پٹرول پمپ کے پاس اتر کر وہ بیکری کی طرف بڑھا تھا۔ اس نے بیکری سے باہر آتی الوینا کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں شاپر تھا۔ جس میں ڈبل روٹی' انڈے اور ناشتے کا دوسرا سامان تھا۔ اس نے آج شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور سر پر دوپٹے کو اس نے چادر کی طرح لیا ہوا تھا۔ اس کا پورا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اسے ہرگز نہ پہچانتا' اگر وہ قریب سے گزرتے ہوئے اس کا نام نہ لیتی۔ اپنا نام سن کر وہ چونکا اور پھر مسکرا کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے غیر ارادی طور پر شاپر لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ——— یہ بھی عورت کے احترام کا ایک طریقہ تھا کہ مرد ساتھ ہو تو وہ عورت کو کوئی بوجھ نہیں اٹھانے دیتا۔ کچھ عادتیں انسان کے خون میں رچی ہوتی ہیں۔

الوینا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر شاپر اسے پکڑا دیا۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ پٹرول پمپ کی پارکنگ میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ وہ والی گاڑی نہ تھی۔ بلکہ یہ ایک چھوٹی اور خاصے پرانے ماڈل کی تھی۔ الوینا نے گاڑی کا لاک کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولا۔ وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ آج الوینا خود گاڑی ڈرائیو کررہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے چادر پیچھے کھسکا دی اور مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی دلکش مسکراہٹ میں کھوسا گیا۔ گاڑی میں مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی' جو یقیناً اس کے ملبوس سے اٹھ رہی تھی' کچھ ہی دیر بعد گاڑی اندرون شہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟"

جب وہ بانس بازار کے رش میں پھنسے تھے تو اس نے پوچھا۔ الوینا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

حضرت جی نے بلایا ہے تمہیں۔ آج ایک خاص اجتماع ہے۔"

"لیکن' اخبار میں لکھا تھا شاید وہ ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔"

"اخبار والوں نے اپنے اخبار کا پیٹ بھی تو بھرنا ہوتا ہے۔ وہ بے پر کی اڑاتے ہیں۔" وہ پھر مسکرائی۔

باقی کا راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔ کافی آگے جاکر اس نے گاڑی ایک جگہ کھڑی کی اور پھر وہ پیدل ہی مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک مکان میں داخل ہوئے عمارت باہر سے بوسیدہ نظر آتی تھی۔ سال خوردہ سا لکڑی کا رنگ اڑا دروازہ دوبارہ ایک مخصوص انداز میں دستک دینے پر کھل گیا تھا۔ وہ الوینا کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے دروازے پر موجود شخص نے اس کی فائل اس سے لے لی تھی۔

کمرے میں دیواروں کے ساتھ کرسیاں لگی تھیں اور ان پر پچیس تیس کے قریب لوگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں موجود لوگوں میں وہ صرف ایک شخص کو پہچانتا تھا اور وہ تھا رباب حیدر' جسے مقرب خاص کا درجہ حاصل تھا۔ باقی لوگوں میں سے ہوسکتا ہے کوئی پہلے بھی محفل میں موجود رہا ہو' لیکن وہ انہیں نہیں پہچانتا تھا۔ اس کا دھیان کبھی ان لوگوں کی طرف نہیں رہا تھا۔ اس کی توجہ ہمیشہ اسماعیل خان پر ہوتی تھی۔ آج بھی وہ اسماعیل خان کی خالی کرسی کو دیکھ رہا تھا۔ آج اس کی کرسی اتنی شاندار نہ تھی' لیکن بہرحال وہ ان کرسیوں سے قدرے مختلف تھی' جس پر وہ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ آج اس کی کرسی کے دائیں بائیں دو اور کرسیاں بھی خالی پڑی تھیں۔ یہ دونوں کرسیاں بھی قدرے مختلف تھیں' لیکن ان کی پشت کی اونچائی درمیان والی کرسی سے کم تھی۔

ہمیشہ کی طرح سفید میکسی والی لڑکیاں کچھ دیر بعد ٹرے میں مشروب کے گلاس اٹھائے سرو کررہی تھیں۔ مشروب ٹھنڈا اور خوش ذائقہ تھا۔ اس میں سے الائچی اور کیوڑے کی خوشبو آتی تھی۔ ہر بار پہلے سے مختلف مشروب پیش کیا جاتا تھا۔ پچھلی محفل میں صندل کا مشروب تھا اور گلاسوں میں نقرئی ذرے تیرتے تھے۔ ہولے ہولے سب کرسیاں بھر گئی تھیں۔ لڑکیاں خالی گلاس لے کر چلی گئیں تو اسماعیل خان کمرے میں داخل ہوا۔ سب لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے۔ آج وہ اسی دروازے سے اندر داخل ہوا تھا' جس سے باقی لوگ آئے تھے۔ اس کے پیچھے وہ تینوں تھیں' آسمانی میکسی والی لڑکیاں۔ آج بھی انہوں نے آسمانی میکسیاں پہن رکھی تھیں۔ ان کے کھلے سنہری اور بھورے بال ان کے شانوں اور پشت پر بکھرے تھے۔ خوب صورتی سے لگا مسکارا اور کاجل کی لکیریں ان کی آنکھوں کو خمار آلود اور خوب صورت بناتی تھیں۔ اسماعیل خان کے بیٹھنے کے بعد سب لوگ بیٹھ گئے۔ تینوں لڑکیاں اسماعیل خان کی پشت پر کھڑی تھیں' یوں کہ ہر لڑکی ایک کرسی کے پیچھے تھی۔ اسماعیل خان کے سیاہ چغے کے کناروں پر سلور ایمبرائیڈری تھی اور ان میں سفید نگینے دمکتے تھے۔

"شروع اس کے نام سے جو سب جہانوں کا آقا اور مالک ہے۔"

اپنی بات کا آغاز کیا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔

"آج اس ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یونٹی کا یہ ایک خصوصی اجلاس ہے۔ اس میں صرف خاص لوگوں کو بلایا گیا ہے' کیونکہ آج کے اجلاس میں مجھے کچھ اہم اعلانات کرنے ہیں اور یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ کچھ لوگ مسلسل ہمارے خلاف منفی پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف ہیں۔ جو کبھی ہماری محفلوں میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ اللہ کے حکم سے یہ سب لوگ بہت جلد منہ کے بل گریں گے اور ان کا کیا ان کے آگے آئے گا۔ ہم اللہ کے ایک حقیر بندے ہیں' جو مسلمانوں کی اصلاح کا ارادہ کرکے منظر عام پر آئے ہیں۔ اس ورلڈ سوسائٹی کے قیام کا مقصد ہی مسلمانوں کو' جو گمراہ

ہو چکے ہیں 'راہ راست پر لانا ہے۔ آپ سب حضرات اچھی طرح جانتے ہیں 'آج پوری دنیا میں مسلمان کیسے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

اے اس کائنات کے خوش قسمت ترین لوگو! اے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والو! اور نبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے دیوانو! ان پر تن من دھن قربان کرنے والے خوش نصیب انسانو!"

احمد رضا بہت دھیان سے اسماعیل خان کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

"اے نیک دل لوگو! آج ہم اپنے مقربین خاص میں ایک نوجوان کا اضافہ کرنے والے ہیں اور یہ اعزاز اللہ تعالیٰ نے جسے بخشا ہے۔ یہ نوجوان ہے 'احمد رضا۔ جس کی پیشانی پر عروج کی داستان رقم ہے۔"

تمام لوگوں کی نظریں احمد رضا کی طرف اٹھی تھیں۔ وہ ایک دم پزل ہوا اور اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

اسماعیل خان اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر دائیں ہاتھ سے اس نے رباب حیدر کو اشارہ کیا۔ رباب حیدر اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اسے اٹھنے کے لیے کہا۔ وہ حیران سا کھڑا اس کی معیت میں آگے بڑھا۔ رباب حیدر نے دائیں ہاتھ والی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب بیچ میں اسماعیل خان تھا اور دائیں بائیں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ اس کی پشت پر الوینا اس طرح کھڑی تھی کہ اس کی کرسی کی پشت پر رکھا ہاتھ اس کے کندھے کو چھو رہا تھا۔ اس ہاتھ کا حرارت بھرا لمس پورے وجود میں سنسنی دوڑاتا تھا اور اس کے ریشمی بال جب ہوا کے جھونکوں سے اڑ کر اس کے رخساروں سے ٹکراتے تو اس کے اندر گدگدی پیدا کرتے تھے۔ وہ سحر زدہ سا بیٹھا تھا اور اسماعیل خان کہہ رہے تھے۔ "آپ سب بھی ہمارے خاص مقرب ہیں 'ہمیں پیارے ہیں 'لیکن یہ دونوں جوان جو ہمارے آس پاس بیٹھے ہیں 'ان کا مرتبہ آپ سے تھوڑا اس لیے بلند ہے کہ جس روز ہمیں نیابت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نصیب ہوئی تھی 'اس رات یہ دونوں نوجوان ہمارے نزدیک ہمارے پاس تھے۔ سو انہیں یہ قرب حاصل ہوا۔ ہم اللہ کے پیغمبر ہیں 'آپ لوگوں کے لیے۔" حاضرین میں تھوڑی سی بے چینی پیدا ہوئی تھی اور تب ہی حاضرین میں ایک شخص نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"جناب! آپ کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ نبوت میرے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و سلم پر ختم ہے۔ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔"

اس نے ہاتھ اونچا کر کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہم نے خود کو نبی نہیں کہا 'پیغمبر کہا ہے۔"

"لیکن جناب...!" اب بیٹھے بیٹھے اس نے کہا۔ "تمام نبیوں اور پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی آمد کے بعد ختم ہو گیا۔"

"بجا فرمایا آپ نے محترم! میری جان آقائے نامدار آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پر قربان ہو 'آپ میری بات سمجھے نہیں 'اس محفل کے اختتام پر آپ جتنے دل چاہے سوال کیجئے گا۔ میں آپ کے سارے ابہام دور کر دوں گا۔ اب دوبارہ گفتگو سے پہلے ایک بار درود پاک صلی اللہ علیہ و سلم کا ورد کر لیں۔"

محفل میں موجود سب لوگوں نے درود پاک کا ورد کیا۔ احمد رضا نے غور سے سوال کرنے والے جوان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی سیاہ داڑھی خوب سجی ہوئی تھی اور اس کی شخصیت کے حسن میں اضافہ کرتی تھی۔ اس کے ماتھے پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا۔ احمد رضا نوجوان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ الوینا کی انگلیوں کا دباؤ اس کے کندھوں پر بڑھ گیا۔ اسماعیل خان کہہ رہا تھا۔

"مدتوں سے اس آرزو میں جیتا تھا کہ آقا سیدنا صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا دیدار نصیب ہو 'لیکن پھر سوچتا 'کہاں میں گلیوں کی دھول اور خاک... اور کہاں دو جہاں کے سردار صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی زیارت۔

آرزو تو صرف زیارت و دیدار کی تھی 'لیکن سبحان اللہ ایسا دیدار 'ایسی زیارت نصیب ہوئی کہ صرف اس جہاں میں نہیں 'صرف آخرت میں نہیں 'صرف مکاں میں نہیں 'ثم الوریٰ 'ثم الوریٰ 'ثم الوریٰ وصل قائم رہے۔"

کمرے میں ایک دم نعرہ تکبیر بلند ہوا تھا۔ لیکن سیاہ داڑھی والا جوان اٹھ کر باہر جا رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر 'جس پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا۔ ناگوار سی شکنیں تھیں۔

"اور ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے پاس حق پہنچتا ہے اور وہ حق کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اندھے 'گونگے اور بہرے کہا ہے۔"

نوجوان دروازے کے پاس جا کر رکا تھا۔

"نعوذ باللہ! یہ شیاطین کی محفل ہے اور ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ فتنہ برپا کرتے رہیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی امت کو گمراہ کرتے رہیں گے۔"

احمد رضا نے اس کی پوری بات نہیں سنی تھی۔ الوینا کا دباؤ اس کے کندھوں پر بڑھ گیا تھا اور اس نے اپنا چہرہ کچھ اس طرح آگے جھکایا تھا کہ اس کی ٹھوڑی اس کے سر کو چھو رہی تھی۔ وہ ایک دم مدہوش سا ہو گیا۔ اس کے بعد اسماعیل خان نے کیا کہا 'اس نے نہیں سنا الوینا کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو اس پر سحر طاری کر رہی تھی۔ کب اسماعیل خان نے اپنی بات ختم کی 'اس نے کیا 'کیا کہا۔ احمد رضا نے نہیں سنا تھا۔ وہ سن بھی کیسے سکتا تھا۔ اس کا پورا وجود تو الوینا کی طرف متوجہ تھا۔ اسماعیل خان نے بات ختم کر دی تھی۔ اب وہ سب لوگ اٹھ اٹھ کر جا رہے تھے۔ باری باری سب اسماعیل خان کے قریب آ کر اس کا ہاتھ چومتے اور چلے جاتے۔ احمد رضا نے بھی اٹھنا چاہا 'لیکن الوینا نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے دباتے ہوئے اسے اٹھنے سے روکا 'پھر تقریباً" اس کے کان کے قریب منہ لگاتے ہوئے سرگوشی کی۔

"آپ ابھی رکیے احمد رضا... حضرت جی نے آپ کو کچھ عطا کرنا ہے۔"

وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا۔ کان کے قریب اس کا رخسار ایک انجانی حدت سے تپ اٹھا۔ کمرہ خالی ہو گیا تو اسماعیل خان بھی دونوں خادماؤں کے ساتھ چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف الوینا اور احمد رضا تھے۔ الوینا اب پیچھے سے ہٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے لبوں پر بڑی دلکش سی مسکراہٹ تھی۔

"بہت مبارک ہو۔" اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ آگے بڑھایا۔ خواب کی سی کیفیت میں احمد رضا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہولے سے دبا کر چھوڑ دیا۔

"تھینک یو۔"

"آپ کو بہت جلد بڑا مقام ملا۔ اتنی جلدی آج تک کوئی اس مقام پر نہیں پہنچا۔" وہ اسے سراہ رہی تھی۔

"اس خوشی میں آپ سے ٹریٹ لینی ہے۔"

"ضرور۔" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"کب اور کہاں 'اس کا فیصلہ آپ کریں گی۔" وہ مسکرایا۔

تب ہی دوسری لڑکی نے آ کر الوینا کے کان میں کچھ کہا۔ الوینا معذرت طلب نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ اب دوسری لڑکی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ لڑکی الوینا سے بھی زیادہ حسین اور ہوشربا تھی۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا کہ احمد رضا کے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑتی تھی۔ وہ مسحور سا اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک وہ سیدھی ہو گئی۔

"حضرت جی اس وقت اپنے رب کے حضور کھڑے پوری امت کے لیے دعاگو ہیں 'سو اب وہ آپ سے نہیں مل سکیں گے 'لیکن کچھ اور لوگ ہیں 'جو آپ سے ملنے کے شائق ہیں اور حضرت جی نے مراقبے میں جانے سے پہلے حکم دیا تھا کہ آپ کو ان سے ملوا دیں۔"

وہ کھڑا ہو گیا اور سحر زدہ سا چلتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں آ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا 'جس میں ایک گول میز کے گرد چار افراد بیٹھے تھے۔ پانچویں کرسی خالی تھی۔ لڑکی نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاروں افراد نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔

"یہ معتقد خاص ہیں۔" لڑکی نے تعارف کروایا۔

"یہ چاروں افراد مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اور اسلام سے متاثر ہیں۔ ابھی یہ باقاعدہ طور پر حلقہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے، تاہم ..." وہ مسکرائی۔

"حضرت جی چاہتے ہیں کہ آپ ان کے سوالوں کے تسلی بخش جواب دیں۔"

"میں..." احمد رضا گھبرایا۔ "میرا علم تو خود ناقص ہے۔ میں اسلام کے متعلق بہت زیادہ نہیں جانتا... میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا کہ ایک عام مسلمان جانتا ہے۔ نماز، روزہ، حج..."

لڑکی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"حضرت صاحب اس سلسلے میں خود بھی آپ کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔"

چاروں افراد نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ لڑکی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"مجھے اونیل رچی کہتے ہیں۔" ایک نے تعارف کروایا۔ وہ بے حد صاف اردو لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"یہ جان ہے، یہ کشن داس اور یہ داؤد ہے۔"

چاروں نے اپنے اپنے نام پر ہلکا سا سر خم کر کے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔

"ہم ابھی 'ہاں' اور 'نہ' کے درمیان میں لٹک رہے ہیں اور اس کے لیے ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میں بھلا آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں، میں تو طفلِ مکتب ہوں۔"

"چلیں! یہ بھی ہم کبھی آپ کو بتا دیں گے۔" رچی مسکرایا۔

"ابھی تو آپ اپنا تعارف کروائیں۔" پھر وہ اس سے مختلف سوال کرتے رہے۔

اس کا تعلیمی پس منظر، اس کا خاندان، اس کے ابو کی جاب، غرض بے شمار سوالات تھے۔ زیادہ سوال رچی کر رہا تھا۔ باقی تینوں افراد سن رہے تھے۔ احمد رضا حیران سا تھا کہ وہ اس سے اس قسم کے سوال کیوں کر رہے ہیں۔ اگر وہ اسلام سے متاثر ہو کر اس دین میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو انہیں دین کے متعلق سوالات کرنے چاہیے تھے، نہ کہ اس کے متعلق۔ ابھی وہ یہ بات اونیل رچی سے کرنے ہی والا تھا کہ الوینا ہولے سے دروازہ کھول کر اندر آئی۔ اور پھر مسکرا کر ان چاروں افراد سے معذرت طلب انداز میں کہا۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو حضرت جی اس وقت احمد رضا سے کچھ خاص گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے آرام کا وقت ہے۔ آپ حضرات پھر کبھی تشریف لے آئیے گا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد آپ کی تشفی ہو جائے گی اور آپ ہمارے دین کو سارے مذاہب سے بہترین پائیں گے۔"

چاروں کھڑے ہو گئے تھے۔

"ہم مطمئن ہیں میڈم! بہت حد تک ہماری تشفی ہو گئی ہے۔"

اب کے بھی اونیل رچی نے ہی جواب دیا تھا۔

احمد رضا حیران ہوا کہ انہوں نے اس طرح کا تو کوئی سوال کیا ہی نہیں تھا جو "دین اسلام" کے متعلق ان کے ابہام دور کرتا پھر تشفی کیسے ہو گئی۔ لیکن اس نے الوینا سے کچھ نہیں کہا۔ کیونکہ کمرے سے نکل کر وہ فوراً" ہی ایک اور کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کمرے میں ایک دروازہ تھا جو دوسرے کمرے میں کھل رہا تھا۔ یہ مکان باہر سے جتنا بوسیدہ نظر آ رہا تھا۔ اندر سے ایسا نہیں تھا۔

الوینا نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اندر تشریف لے جائیں۔ حضرت جی آپ کے منتظر ہیں۔ مراقبے کے بعد وہ اکثر بہت کمزوری محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے زیادہ دیر گفتگو نہیں کریں گے۔"

اسماعیل خان نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا۔

"پہلے تو ہماری طرف سے مبارک باد قبول کریں کہ اللہ نے آپ کو یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے، پھر ہماری طرف سے یہ قبول کریں۔ یہ آج سے پہلے ہمارے صرف دو

مقرّبین کے پاس ہے۔ آپ تیسرے خوش نصیب ہیں۔"

اس نے ایک سبز اور سیاہ رنگ کا عمامہ اسے عطا کیا۔

احمد رضا کھڑا تھا۔

"بیٹھ جاؤ احمد رضا! ہمیں ابھی ابھی حکم ملا ہے کہ ہم کچھ دنوں کے لیے پردہ کرلیں۔ اس لیے ہماری، آپ کی ملاقاتیں کچھ عرصہ شاید نہ ہوسکیں گی۔ لیکن رابطہ بہرحال رہے گا۔ ہم نے سوچا تھا کہ کچھ دنوں تک ہمیں ایک غیر ملک میں جانا ہے اور آپ ہمارے ہمراہ چلیں گے۔"

"میں؟" احمد رضا گھبرایا۔

"میری پڑھائی کا حرج ہوگا اور پھر میرے ابو اس کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔"

"جانتے ہیں، جانتے ہیں۔ ہم سے کون سی بات چھپی ہے' اسی لیے تو ہم نے آپ کو ساتھ لے جانے کا ارادہ موقوف کردیا ہے۔ لیکن ایسے دن آنے والے ہیں جب ہر سفر میں آپ ہمارے ہمراہ ہوں گے۔"

پھر اس نے آہستہ سے تالی بجائی۔ الوینا جیسے دروازے کے باہر ہی کھڑی تھی۔ دوسرے لمحے وہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی موبائل تھا۔ اسماعیل خان کے اشارے پر اس نے وہ موبائل فون اس کی طرف بڑھادیا۔

"یہ آپ کی نذر۔ اس سے رابطے میں آسانی رہے گی۔"

اسماعیل خان اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ جھجک گیا۔ اس نے فون لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔

"لے لیں! حضرت جی کا دیا تحفہ ٹھکرانا نہیں چاہیے۔" الوینا نے سرگوشی کی۔

اس نے موبائل فون لے لیا۔ اسماعیل خان نے ہاتھ اونچا کیا۔ مطلب کہ ملاقات ختم۔ وہ الوینا کے ساتھ باہر آگیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا داخلی دروازے تک آیا۔ الوینا نے اس کی کالج فائل کے ساتھ ایک چھوٹا سا جدید بریف کیس بھی اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟" وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔

"یہ رجی نے آپ کو گفٹ دیا ہے۔" الوینا کے لبوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی۔ وہ اس کے ہونٹوں کے دلکش کٹاؤ میں لمحہ بھر کے لیے کھو سا گیا۔

"یہ لو احمد رضا! دوستوں کے تحفے ٹھکرایا نہیں کرتے۔"

"لیکن اس میں کیا ہے؟" وہ جھجک رہا تھا۔

"معلوم نہیں۔" الوینا تھوڑا سا آگے بڑھی یوں کہ اس کا بازو اب اس کے بازو سے مس کررہا تھا۔ وہ پزل سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"رجی کہہ رہا تھا' آپ کے اور اس کے درمیان آج جس دوستی کا آغاز ہوا ہے' یہ اس دوستی کے نام حقیر سا تحفہ ہے۔"

وہ خاموش اور الجھا ہوا تھا۔ الوینا نے داخلی دروازہ کھولا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آئے۔ الوینا پھر شلوار قمیص اور چادر نما دوپٹے میں ملبوس تھی۔ اسی گاڑی میں واپسی کا سفر شروع ہوا۔

"کہاں جانا ہے آپ کو یونیورسٹی یا گھر؟"

"گھر۔" احمد رضا کا جواب مختصر تھا۔

"آپ کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا احمد رضا۔" جب باکس بازار کے رش سے نکل کر وہ قدرے کم رش والے علاقے میں آئے تو الوینا نے کہا۔

"خوش قسمتی! وہ تو ایک عام سا لڑکا تھا۔ کوئی بہت زیادہ مذہبی بھی نہ تھا پھر" اس نے گود میں پڑے عمامے کو دیکھا" اسماعیل شاہ کون تھا؟ کیا وہ واقعی اللہ کا برگزیدہ بندہ تھا اور مسلمانوں کی اصلاح کے لیے آیا تھا۔۔۔؟ اور اللہ نے اسے بھی اس نیک مقصد میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے منتخب کیا تھا؟

مختلف اوقات میں ہونے والی اسماعیل شاہ کی گفتگو اس کے ذہن میں آرہی تھی۔ پھر اس کے ذہن میں اس سیاہ داڑھی والے نوجوان کی آواز آئی۔

"یہ شیاطین کی محفل ہے۔"

الوینا نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دو تین بار اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا' لیکن اس نے پھر اسے مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کے گھر کے قریب روڈ پر اس نے گاڑی روک لی۔

"اندر گھر تک گاڑی چلی جائے گی؟"

"چلی تو جائے گی' لیکن آپ ادھر ہی اتار دیں مجھے۔" وہ گاڑی سے اترا تو الوینا نے کہا۔

"یہ عمامہ آپ ادھر ہی چھوڑ دیں۔ اس کی ضرورت آپ کو وہاں اجلاس میں ہی ہوگی۔ آج کے بعد آپ اجلاس میں یہ عمامہ پہن کر حضرت جی کے برابر والی کرسی پر بیٹھیں گے۔" وہ مسکرائی اور پھر جھک کر پسنجر سیٹ کے سامنے پڑا بریف کیس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔

وہ کہنا چاہتا تھا کہ اسے بھی آپ لے جائیں۔ میں اسے کہاں لے کر جاؤں گا۔ لیکن وہ گاڑی ن سے آگے بڑھا لے گئی۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑا رہا پھر وہ بریف کیس اٹھائے گھر کی طرف چل پڑا۔ اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گا' جنید کا ہے یا کوئی بھی بہانہ بنالوں گا۔ لیکن اتفاق سے دروازہ صفائی والی نے کھولا تھا۔ سمیرا ابھی تک کالج سے نہیں آئی تھی اور امی کچن میں تھیں۔ وہ سیدھا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

"کون ہے شمو؟" کچن سے امی نے پوچھا۔

"بھائی آئے ہیں اور اوپر چلے گئے ہیں۔" شمو نے کھڑکی جھاڑتے ہوئے اطلاع دی۔

"اچھا!"

وہ مطمئن سا ہوکر اپنا کام کرنے لگیں۔ کمرے میں آکر اس نے بریف کیس بیڈ پر پھینکا۔

"شکر ہے! وہ جاسوس اعظم عمران کی سیکرٹری گھر پہ نہیں تھی ورنہ۔۔۔"

اس نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکالا اور کچھ دیر تک حیرت و خوشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کے یونیورسٹی فیلوز میں سے صرف جنید کے پاس اس طرح کا موبائل فون تھا' جو اس نے حال ہی میں لیا تھا۔ اس سے پہلے اس کے پاس بھی عام سا تھا۔ اس نے فون کے مختلف فنکشنز چیک کیے۔ اور اسے تکیے کے نیچے رکھ کر بریف کیس اٹھا کر گود میں رکھا۔ بریف کیس کے نمبرز سیٹ تھے۔ جونہی اس نے دبایا وہ کھٹاک سے کھل گیا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بریف کیس میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے انہیں گنا۔ وہ پچاس گڈیاں تھیں۔

"پچاس ہزار۔" اس نے خوف زدہ ہوکر بریف کیس بند کردیا۔ "نہیں' یہ میں نہیں لے سکتا۔ یہ میں کل ہی واپس کردوں گا' لیکن فی الحال اسے چھپانا ہے۔ کہاں چھپاؤں؟" سمیرا کا کچھ پتا نہیں تھا' کب' کس وقت' کہاں چھاپا مار دے۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی بھی جگہ ایسی نہ تھی جو سمیرا کی دسترس سے باہر ہوتی۔ کپڑوں کی الماری میں وہ اکثر اس کے کپڑے سنبھال کر رکھتی تھی۔

"ایک ہی دن کی تو بات ہے۔" اس نے بالآخر اسے اپنے بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ موبائل کو ایک شرٹ میں لپیٹ کر کپڑوں میں سب سے نیچے رکھ دیا اور قدرے مطمئن سا ہوکر بیڈ پر بیٹھ کر ان چاروں کے متعلق سوچنے لگا۔

حسن رضا نے کئی دن تک احمد رضا کی مصروفیات کو چیک کیا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے سیدھا گھر آتا تھا۔ عموماً" وہ ان کے آفس آنے سے پہلے آچکا ہوتا تھا۔ رات کا کھانا وہ سب اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ کھانا کھا کر احمد رضا کبھی تو سیدھا اپنے کمرے میں چلا جاتا' کبھی ٹی وی دیکھتے ہوئے سمیرا سے کچھ گپ شپ لگالیتا۔ بے حد مطمئن ہوکر انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا تھا کہ احمد رضا نے ان کی بات سمجھ لی تھی اور اس جھوٹے فراڈی انسان کے چنگل سے بچ گیا تھا' لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ شخص جو دوسروں کے لیے انڈر گراؤنڈ ہوگیا تھا' احمد رضا کی اس سے ہر دوسرے تیسرے دن ملاقات ہوجاتی تھی۔ لیکن اب یہ ملاقاتیں صبح صبح ہوتی تھیں' جب وہ یونیورسٹی جاتا تھا۔ الوینا اسے بھی

بیکری کے پاس سے اور کبھی پیٹرول پمپ سے پک کرتی تھی۔

"ورلڈ سوسائٹی آف اسلام" کے دو تین اجلاس بھی ہوئے تھے جس میں اسماعیل خان نے اسے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھایا تھا اور اس کے سر پر وہ عمامہ بندھا تھا' جو اسماعیل خان نے اسے عطا کیا تھا۔ ان مجالس میں زیادہ تر اسلام کے بارے میں باتیں کی گئی تھیں اور دنیائے اسلام میں جو مسئلے درپیش تھے انہیں زیر بحث لایا گیا تھا۔ احمد رضا کے دل میں جو شکوک پیدا ہوئے تھے' خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ وہ اسماعیل خان کے لیے اپنے دل میں بے حد عقیدت محسوس کرنے لگا تھا۔

رچی نے گفٹ والے پیسے واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔

"ہمیں تمہاری پسند کا علم نہیں تھا۔ اس لیے اب تم اپنی پسند سے گفٹ خرید لو۔ رچی دوستوں کو گفٹ دے کر واپس نہیں لیتا۔" یہ گفتگو فون پر ہوئی تھی۔ اس کی دوبارہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن الوینا نے اسے مشورہ دیا تھا کہ یہ رقم وہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دے۔ اس نے الوینا کے کہنے پر اپنا اکاؤنٹ کھلوا لیا تھا اور کم از کم اسے اب یہ پریشانی نہیں رہی تھی کہ کسی روز سمیرا پر اس کے کمرے کی صفائی کا بھوت سوار ہوا تو کیا ہو گا۔ وہ اسے اتنی رقم کے متعلق کیا کہے گا۔ وہ اس سارے معاملے میں کسی سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتا تھا۔ سوا اپنے آپ کو خود ہی دلیلیں دے کر مطمئن کر لیتا تھا۔ وہ اب ان مجالس کو انجوائے کرتا تھا۔

اس روز وہ یونیورسٹی سے آکر الوینا سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ پہلی بار تھی' جب وہ خود الوینا کو فون کر رہا تھا' ورنہ وہ ہی فون کرتی تھی۔ تین دن سے اس نے فون نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ کسی اجلاس میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ الوینا نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ شاید مصروف ہو گی۔ اس کا خیال تھا فارغ ہو کر وہ خود ہی رابطہ کرے گی۔ اس نے کہا تھا کہ اگر کبھی اس کی بات نہ ہو سکے تو اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اس سے خود رابطہ کرے گی۔

شام کو وہ سو کر اٹھا تو بہت فریش تھا۔ چائے کے بعد وہ دیر تک نیچے بیٹھا سب کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔

اس بات سے بے خبر کہ آج آخری بار ان سے باتیں کر رہا ہے۔ آج کے بعد وہ یوں ان کے درمیان بیٹھ کر کبھی بات نہیں کر سکے گا۔

اور آج کے بعد پھر کبھی سمیرا کے ہاتھ کی بنی چائے نہیں مل سکے گی۔

آج رات وہ سب کے ساتھ آخری بار بیٹھ کر اکٹھا کھانا کھائے گا۔

"صبح سویرے سب رحیم یار خان جا رہے تھے کسی شادی میں شرکت کے لیے۔ سمیرا نے اصرار کیا تھا کہ وہ بھی پروگرام بنا لے۔ دو تین دن کی تو بات ہے۔ کل یوں بھی سنڈے ہے۔" حسن رضا نے بھی کہا تھا۔

"چلے چلو یار! بارات اٹینڈ کر کے آجانا۔ سب رشتہ داروں سے مل ملا بھی لینا۔" لیکن اس کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔

"نہیں بھئی! میرے آج کل بہت ضروری لیکچرز ہیں۔ میں ایک لیکچر بھی مس نہیں کر سکتا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا! پڑھائی پہلے ہے۔"

رات کو وہ ابو سے بائیک لے کر سمیرا کو آئس کریم کھلانے لے گیا تھا آج کتنے دن بعد وہ دونوں آئس کریم کھانے نکلے تھے۔

دیکھنا سمو! ایک دن میں تمہیں ابو کی بائیک کے بجائے اپنی گاڑی میں آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا۔

"اس وقت خواب مت دیکھیں خواب دیکھتے دیکھتے عالم بالا میں ہی نہ پہنچ جائیں۔" سمیرا کے پاس حسب معمول اس کی بات کا جواب موجود تھا۔

"یہ خواب نہیں سمو! بہت جلد واقعی میں تمہیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر لایا کروں گا آئس کریم کھلانے۔"

"چلو! میں اس وقت کا انتظار کروں گی۔"

اور وہ وقت کبھی نہیں آنا تھا۔ سمیرا کو آج کے بعد کبھی اس کے ساتھ آئس کریم کھانے نہیں آنا تھا۔ نہ بائیک پر بیٹھ کر نہ گاڑی میں۔

صبح سب لوگ بہت سویرے رحیم یار خان کے لیے نکل گئے۔ اس نے سوتی جاگتی کیفیت میں سمیرا کی ہدایات سنی تھیں۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ اس نے کیا کیا بنا کر فرج میں رکھ دیا ہے اور اس کو بس گرم کرنا ہے۔ روٹی تندور سے لانی ہے۔ ناشتا صبح شمو بنا دے گی۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔"

وہ دروازہ لاک کر کے اپنے کمرے میں آیا اور پھر گہری نیند سو گیا تھا۔ اتوار کو یوں بھی وہ دیر تک سوتا تھا۔ اس کی آنکھ شمو کے آنے پر کھلی تھی' جو بیل بجانے کے ساتھ ساتھ دونوں ہاتھوں سے دروازہ بھی پیٹ رہی تھی۔

وہ باتھ لے کر تیار ہو کر نیچے آیا تو شمو نے ناشتا ٹیبل پر لگا دیا تھا اور خود مزے سے فرائی انڈے کے ساتھ پراٹھا کھا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ شمو کے کام کرنے تک وہ نیچے ہی تخت پر بیٹھا اخبار پڑھتا رہا۔ شمو کے جانے کے بعد وہ اوپر آیا تو اس کا موبائل بج رہا تھا۔ دوسری طرف الوینا تھی۔

"ایک ایمرجنسی اجلاس ہے۔ تم اپنے اسٹاپ پر پہنچو۔ لارا تمہیں پک کر لے گی۔"

وہ فوراً" ہی گھر لاک کر کے نکل کھڑا ہوا۔ وہی اندرون شہر والا گھر تھا۔ بڑے کمرے میں کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ اسماعیل خان پہلے سے ہی اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھ گیا بائیں طرف والی کرسی پر جو شخص بیٹھا تھا' وہ اس کے لیے نیا تھا۔ اس کی داڑھی خاصی لمبی تھی۔ سر پر پگڑی پہنے تھا اور گھیر دار شلوار قمیص پر سبز رنگ کی افغانی جیکٹ تھی۔

"یہ طیب خان ہے۔ اس نے سلم ایڈ کے لیے بہت کام کیا ہے اور جہاد افغانستان کا ایک جری مجاہد ہے۔" اس نے بائیں طرف والی کرسی پر بیٹھے شخص کا تعارف کروایا۔

"جہاد چونکہ ختم ہو چکا ہے۔ آج سے یہ ہمارے لیے کام کرے گا۔ عزیز دوستو! بڑے بڑے نبیوں اور پیغمبروں پر مشکل وقت آتے رہے ہیں۔ سو آج ہم پر بھی مشکل وقت آگیا ہے۔ جب تک ممکن ہو سکا' ہم یہاں رہے۔ آج کسی وقت ہم یہاں سے ہجرت کر جائیں گے۔ کہاں۔۔۔؟ یہ ابھی بتانے کا حکم نہیں ہے۔ ہم نے احمد رضا اور طیب خان کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ یہ ہمارے نائب ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ آپ سب پہلے کی طرح "ورلڈ سوسائٹی آف اسلام کے ماہانہ اجلاس میں شرکت کرتے رہیں۔ ہم نے احمد رضا کو خلافت عطا کر دی ہے۔"

اسماعیل خان نے ایک لمبی تقریر کی تھی۔ پھر لوگ اٹھ اٹھ کر اس سے ملنے لگے۔ اس سے دعا کرنے کے لیے کہہ رہے تھے اور جلد واپسی کی درخواست کر رہے تھے۔ آج افراد کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔ یہ سب مریدان خاص تھے۔ احمد رضا کو الوینا اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ وہاں وہی چاروں اسی طرح گول میز کے گرد بیٹھے تھے۔ رچی نے اٹھ کر گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور گفٹ قبول کر لینے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ آج ان کے درمیان چند رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رچی نے کاغذوں کا ایک پلندہ الوینا کو دیا تھا۔

"یہ پمفلٹ تقسیم کروانے ہیں۔"

الوینا نے پمفلٹ لے لیے اور وہ حضرت جی سے ملاقات کرنے چلے گئے۔ الوینا اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ الوینا نے ہی اسے بتایا تھا کہ آج رات اگر وہ ٹھہر جائے تو مقربین خاص کو شراب طہور پلائی جائے گی۔ اسے شراب طہور کے متعلق تجسس تھا۔ اس نے وہاں ٹھہرنے پر ہامی بھر لی تھی۔ آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔

باقی کا سارا دن اس نے الوینا کے ساتھ گزارا تھا۔ ایک دو بار اس نے لارا اور مرینہ کو بھی دیکھا تھا۔ الوینا کا کمرہ چھوٹا سا تھا' لیکن صاف ستھرا تھا۔ فرنیچر قیمتی تھا اور کمرے میں بہت مدھم' لیکن سحر انگیز فریشنر کی

خوشبو پھیلی تھی۔

الوینا نے اسے شراب طہور پیش کی تھی۔ یہ شراب نہیں تھی، لیکن اس میں ہلکا سرور تھا۔ الوینا آج اس پر بہت مہربان تھی۔

وہ اس کے سرہانے بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے جانے کن جہانوں کی سیر کر رہا تھا۔ ہلکے سرور سے اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اس رات اس نے اپنے ایمان، ضمیر، کردار سب کا سودا کر لیا تھا۔ اس نے الوینا کے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لے کر اعتراف کیا تھا کہ اسماعیل شاہ سچا نبی ہے۔ (نعوذ باللہ) اور اسے اللہ نے گمراہ انسانوں کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے۔ اس صبح اسے ایک گاڑی اور نیو گارڈن ٹاؤن میں ایک گھر کی چابی عطا کی گئی۔

"یہ گھر تمہارا ہے اور مستقبل میں تمہیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

اگلی رات بھی ایسے ہی گزری تھی۔ وہ سرور طاری کرتا مشروب بار بار پینے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن الوینا نے تیسرے گلاس کے بعد صراحی اٹھا لی تھی۔

دوسری رات گزار کر صبح وہ گھر جانے کے لیے تیار ہوا۔ الوینا اس کے ساتھ ہی تھی۔ کیونکہ اس نے رحیم یار خان فون کر کے پتا کیا تھا۔ سمیرا نے بتایا تھا کہ وہ مزید دو دن رکیں گے گو شادی آج ولیمہ کے فنکشن کے بعد ختم ہو جانی تھی۔ لیکن وہ لوگ اتنے عرصہ بعد رحیم یار خان آئے تھے اور امی سب رشتہ داروں سے ملنا چاہتی تھی۔"

"جتنے دن دل چاہے رہو اور میری فکر مت کرو۔ میں مزے سے ہوں۔"

سمیرا کا نصیحت نامہ سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا تھا اور اب الوینا کے ساتھ گھر سے کچھ کپڑے لینے آیا تھا۔ الوینا کو گاڑی میں ہی چھوڑ کر وہ گھر آیا تھا۔ گھر لاکڈ نہیں تھا۔ وہ ٹھٹکا۔

"کیا وہ آگئے ہیں؟" اس نے سوچا۔ ان کے پاس چابیوں کا دوسرا سیٹ تھا۔ "ہو سکتا ہے سمیرا نے مذاق کیا ہو۔ لیکن آج تو ولیمہ تھا۔ آج اس وقت تو وہ کسی صورت بھی نہیں آسکتے تھے۔ ہاں! شام تک ممکن تھا، آجاتے۔"

اس نے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے برآمدے میں حسن رضا بیٹھے تھے۔

"ابو آپ آگئے ۔۔۔ اور ۔۔۔" اس نے سمیرا اور امی کی تلاش میں نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔

حسن رضا کا چہرہ سپاٹ تھا۔ جب وہ بولے تو ان کے لہجے میں پتھروں کی سی سنگینی تھی۔ وہ کب آئے تھے اور کب سے یہاں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔

"یہ ۔۔۔" انہوں نے دائیں طرف پڑا اخبار اٹھا کر ایک خبر پر انگلی رکھی۔

"احمد رضا تم ہی ہو۔"

وہ ابو سے ڈرتا تھا، حالانکہ آج تک انہوں نے کبھی اسے انگلی تک نہ لگائی تھی۔ وہ بچوں کو مارنے کے خلاف تھے۔ وہ ابو سے ڈر کر انکار کر دیتا، یہ ممکن تھا۔ لیکن اس وقت رات کے سرور کا اثر ابھی باقی تھا۔ آنکھوں میں ہلکا خمار تھا اور دماغ بہت گہرائی تک سوچنے سے قاصر تھا۔

خبر میں لکھا تھا۔ "نبوت کا جھوٹا دعوے دار اسماعیل کذاب فرار ہو گیا۔ لیکن اپنا خلیفہ احمد رضا نامی لڑکے کو بنا گیا جو یو ای ٹی کا اسٹوڈنٹ ہے۔ احمد رضا نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ۔۔۔"

احمد رضا نے خبر پڑھ لی تھی اور سر جھکائے کھڑا تھا۔

"ابو! وہ میں ۔۔۔"

"ہاں یا نہ میں جواب دو۔" ان کے لہجے میں پتھروں کی سی سنگینی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ لحہ بھر وہ اسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کسی شکست خوردہ شخص کی طرح سر جھکا لیا۔ ان کے کندھے جھک گئے۔ کل شام انہوں نے رحیم یار خان کے بازار میں ایک دکاندار کے پاس کھڑے کھڑے اخبار دیکھا تھا۔

"نہیں!" انہیں یقین نہیں آیا تھا ۔۔۔ یہ ان کا احمد رضا نہیں ہو سکتا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے یونیورسٹی سے آکر وہ کہیں نہیں گیا تھا۔

"یو ای ٹی میں صرف ایک ہی تو احمد رضا نہیں ہے۔" انہوں نے سینکڑوں بار دل کو سمجھایا تھا۔

"لیکن پھر اس رات پولیس کی آمد ۔۔۔ اسماعیل خان کا نام؟" انہوں نے ایک ضروری کام کا بہانہ کیا اور ولیمہ کی دعوت چھوڑ کر واپس آگئے تھے۔ سارا راستہ وہ دعائیں مانگتے آئے تھے کہ یہ کوئی اور احمد رضا ہو۔

سارے راستہ انہوں نے اللہ سے التجائیں کی تھیں کہ یہ جھوٹ ہو۔ لیکن یہ جھوٹ نہیں تھا۔ احمد رضا ان کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

"یا اللہ! مجھے ہمت عطا کر۔ میں بہت کمزور انسان ہوں۔ ہر انسان کی طرح اولاد کی محبت کے معاملے میں مجبور اور بے بس۔ یا اللہ! جو فیصلہ میں نے رحیم یار خان کے بازار میں کھڑے کھڑے کیا تھا، مجھے اس پر قائم رہنے کی ہمت عطا فرما۔"

احمد رضا نے کھڑے کھڑے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ جس میں نیو گارڈن ٹاؤن والے گھر کے مین گیٹ کی چابی تھی اور اس گھر کے پورچ میں کھڑی زیرو میٹر گاڑی اس کی تھی۔ وہ حسن رضا کو یہ بتا کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اس نے اپنا ہاتھ جیب پر سے ہٹا لیا۔ جس حسن رضا کو وہ جانتا تھا، وہ ایسی باتوں سے خوش ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے ساری زندگی رزق حلال کمایا تھا اور انہیں حلال رزق ہی کھلایا تھا۔ پھر وہ ابو کو کیسے راضی کرے ۔۔۔؟ کیسے ان کا غصہ کم کرے؟

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ حسن رضا نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں میں ایک دم ہارے ہوئے سپاہی کا حوصلہ تھا، جو اپنی آخری پونجی بھی داؤ پر لگا کر جیتنے کی سعی کرے۔

"اور تمہارے کمرے میں ۔۔۔" وہ بولے تو ان کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"میں نے تمہارا سارا سامان پیک کر دیا ہے۔ ایک اٹیچی کیس میں ۔۔۔ اور بیگ میں تمہاری کتابیں ہیں، جو بیڈ پر پڑا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی تمہاری چیز ہو تو لے کر نیچے آجاؤ۔"

اس نے حیرت سے حسن رضا کو دیکھا۔ وہ ان کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔

"اوپر جاؤ اور اپنا سامان لے کر اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤ۔"

ان کے لہجے میں یکایک وہی پتھروں کی سی سنگینی در آئی تھی۔

احمد رضا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ انہوں نے آخری سیڑھی سے اسے گم ہوتے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ فیصلہ تو وہ کر کے آئے تھے۔ سمیرا اور زبیدہ کے آنے سے پہلے انہیں اس پر عمل کرنا تھا۔ وہ ان کے آنسوؤں اور اپنی کمزوری سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ اولاد کی محبت کے سامنے کمزور نہ پڑ جائیں۔ بس ایک امید تھی، ایک آس تھی کہ شاید جس احمد رضا کو اسماعیل ملعون نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، وہ یہ احمد رضا نہ ہو لیکن احمد رضا نے یہ آس توڑ دی تھی۔

وہ احمد رضا کو اٹیچی کیس اور بیگ سیڑھیوں سے گھسیٹ کر لاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا ان کے پاس آیا۔

"ابو!" اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

وہ کوئی بہت زیادہ مذہبی نہیں تھے۔ لیکن وہ ایسے بھی نہیں تھے کہ ایک مرتد شخص کو ایک جھوٹے نبی کے کارندے کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں ۔۔۔ کوئی نبی ان کے بعد نہیں آئے گا۔ ہر مسلمان چاہے وہ بہت زیادہ مذہبی ہو یا نہیں۔ ایسے ہی یقین رکھتا تھا جیسے اپنے ہونے پر۔ احمد رضا ان کی نظروں میں مرتد ہو چکا تھا۔ جس نے کسی اور کو نبی مان لیا تھا۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ابو!" احمد رضا نے پھر کہا تو اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ احمد رضا نے اٹیچی کیس وہیں برآمدے میں رکھ دیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔

"آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" وہ روہانسا ہوا۔

"تم مرتد ہو گئے ہو۔" اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے کہا تھا اور پھر جھک کر اٹیچی کیس کا ہینڈل پکڑا اور اسے اٹھا کر صحن کی طرف بڑھے۔ وہ جو سوچ رہا تھا

کہ وہ ہرگز سامان لے کر نہیں جائے گا' ان کے پاؤں پکڑ لے گا' معافی مانگ لے گا' ایک دم کھڑا ہوا اور تیز تیز چلتے ہوئے ان کے قریب جا کر عادتاً" ان کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا۔ انہوں نے مڑ کر بیگ اٹھایا اور وہ بھی اسے پکڑا دیا۔ اب وہ اس کے آگے چل رہے تھے۔ گیٹ کے پاس پہنچ کر انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ احمد رضا متذبذب سا گیٹ سے باہر نکلا اور گیٹ کے پاس اٹیچی کیس اور بیگ رکھ کر اس نے حسن رضا کو دیکھنا چاہا' لیکن وہ گیٹ بند کر چکے تھے اور اب گیٹ سے ٹیک لگائے رو رہے تھے۔ انہوں نے احمد رضا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ مبادا اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ کمزور نہ پڑ جائیں۔

اس چہرے کو انہوں نے سینکڑوں بار چوما تھا۔ سینکڑوں بار آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی بلائیں لی تھیں اور سینکڑوں بار نظر لگ جانے کے خوف سے انہوں نے جی بھر کر دیکھنے کی خواہش کے باوجود اس خوب صورت چہرے سے نظریں ہٹائی تھیں۔

اس بیٹے کے لیے انہوں نے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ اس کے پیدا ہونے سے لے کر اب تک اس کا اتنا خوب صورت نام رکھا تھا۔

"احمد...!" ان کے رونے کی آواز بلند ہوئی تھی۔ باہر گیٹ پر ہاتھ رکھے احمد رضا اپنے باپ کے رونے کی آواز سن رہا تھا۔

وہ باپ جس نے اس سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔

جس نے بچپن سے لے کر اب تک اپنی حیثیت سے بڑھ کر آسائشیں دی تھیں۔ جو اسے اعلا تعلیم کے لیے باہر بھیجنا چاہتا تھا' جس کو اس نے کبھی قیمتی کپڑا پہنے نہیں دیکھا۔ سال میں ایک جوڑا وہ بھی معمولی سادہ اپنے لیے بنواتا تھا... لیکن جس نے اپنے بچوں کو ہمیشہ بہترین لباس پہنایا تھا تاکہ اپنے ادارے میں پڑھنے والے دوسرے بچوں کے مقابلے میں وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔

ایک دم بہت زیادہ پشیمانی نے اسے گھیر لیا۔

یہ اس نے کیا کر دیا تھا؟

اور کیا کرنے چلا تھا۔

اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"ابو...!" اس نے گیٹ پر دباؤ ڈالتے ہوئے آواز دی۔

اور بے تحاشا روتے ہوئے حسن رضا سوچ رہے تھے۔ انہوں نے اس کا بے حد خوب صورت نام رکھا تھا۔ یہ ان کی پہلی اولاد تھا۔

"ابو...!" موبائل کی بیل ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا' الوینا تھی اور پوچھ رہی تھی کہ اس نے اتنی دیر کیوں کر دی تھی... پشیمانی کی جگہ ایک دم غصے نے لے لی۔

"یہ ابو بھی بس..." اس نے جھک کر اٹیچی کیس اور بیگ اٹھایا۔

"امی اور سمیرا آجائیں تو پھر آؤں گا اور منالوں گا ابو کو بھی۔" اس نے قدم آگے بڑھائے۔ وہ نہیں جانتا کہ اب اس گھر کے دروازے اس کے لیے کبھی نہیں کھلیں گے۔ اب وہ کبھی اپنے باپ کا شفیق چہرہ نہیں دیکھ سکے گا۔

وہ اٹیچی کیس اٹھائے الوینا کی گاڑی کی طرف جا رہا تھا اور اندر گیٹ سے ٹیک لگائے حسن رضا دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ یوں جیسے ابھی جوان بیٹے کی میت دفنا کر آرہے ہوں۔ وہ رو رہے تھے اس بیٹے کی موت پر جو جون 1977ء میں پیدا ہوا تھا اور آج اگست 1999ء میں صرف بائیس سال کی عمر میں مر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک انہیں مصنوعی سانس دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب ہمدان مصطفیٰ ڈاکٹر کے ساتھ تقریباً" بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے ایک کو پیچھے ہٹا کر ان کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی اور پھر دایاں ہاتھ اٹھا کر ایک اور حواس باختہ کھڑے ہمدان کو گویا تسلی کا اشارہ کیا تھا۔ پھر فوری طور پر انہیں ایمرجنسی لے جایا

گیا تھا۔ ایبک اور مصطفیٰ ساتھ ہی گئے تھے۔ پھر جب ایمر جنسی کے باہر کھڑے ہمدان مصطفیٰ شاہ کو فون کر کے بابا جان کے متعلق بتا رہا تھا' تب ایبک کو عمارہ کا خیال آیا تھا۔ وہ تیزی سے واپس کمرے کی طرف لپکا تھا۔ جہاں عمارہ بیڈ سے ٹیک لگائے ابھی تک حواس باختہ سی کھڑی تھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھوں میں وحشت سی تھی اور آنسو جیسے ان کی آنکھوں میں ہی ٹھہر گئے تھے۔

"آپی ۔۔۔!" اسے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح اس کی طرف لپکیں اور ایبک فلک شاہ نے انہیں اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

"ریلیکس مما ۔۔۔ وہ بہتر ہیں۔ ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر دیکھ رہے ہیں۔" اس کے تسلی آمیز لفظوں نے جیسے آنکھوں میں منجمد آنسوؤں کو پگھلا دیا اور آنکھوں میں گھرے آنسو رخساروں پر پھسل آئے۔

"بابا جان ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟" انہوں نے بچوں کے سے انداز میں پوچھا۔ ایبک نے بھی انہیں ایسے ہی تسلی دی تھی جیسے بچوں کو دیتے ہیں۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ بابا جان بالکل ٹھیک ہیں۔ ہم ابھی کچھ دیر تک انہیں روم میں لے آتے ہیں۔"

پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور انہیں یوں ہی بازوؤں کے حلقے میں لیے لیے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ عمارہ کی وحشت ذرا کم ہوئی تو انہوں نے مائرہ کی طرف دیکھا' جو عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور یاد کرنے کی کوشش کی تھی کہ ابھی کچھ دیر پہلے مائرہ کیا کہہ رہی تھیں۔

"عمارہ شاہ! تمہیں یہاں آتے ہوئے شرم نہ آئی اور وہ تمہارا شوہر ۔۔۔ اس نے تو کہا تھا کہ وہ کبھی مر کر بھی "الریان" میں قدم نہیں رکھے گا۔ اگر رکھا تو۔"

"اس نے اور بھی تو کچھ کہا تھا۔" انہوں نے یاد کرنے کی کوشش کی تو انہیں یاد نہیں آیا۔ تب انہوں نے بے بسی سے ایبک کی طرف دیکھا۔ ایبک نے آہستہ سے ان کے ہاتھ تھپتھپائے اور کھڑا ہو گیا۔

"مما! آپ ایزی ہو کے بیٹھ جائیں۔ ان شاء اللہ کچھ نہیں ہو گا۔ اللہ اتنا نامہربان نہیں ہے۔ دیکھیے گا! کچھ دیر بعد ابھی آپ بابا جان سے باتیں کر رہی ہوں گی۔ میں ہمدان کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ وہاں اکیلا ہے۔ گھبرا رہا ہو گا۔"

وہ ایک بار پھر ان کا بازو تھپتھپا کر باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے ایک سرسری نظر رابیل احسان پر ڈالی' جو صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ وہ اس سارے عرصے میں تسلسل اس پر اور عمارہ پر نظریں جمائے ہوئی تھی۔

عمارہ فلک شاہ نے ایبک کو باہر جاتے دیکھا تو ایک لمحہ کو جیسے ان کا دل ڈوب سا گیا۔ ان کا جی چاہا' وہ ایبک کو آواز دے کر روک لیں۔ انہیں مائرہ کی نظروں سے خوف آ رہا تھا۔ مائرہ جو ان کی سب سے چھوٹی بھابھی اور ان کے بے حد پیارے دوستوں جیسی بھائی کی بیوی تھیں۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی' پہلے روز سے ہی انہوں نے مائرہ کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت محسوس کی تھی' حالانکہ احسان شاہ کے حوالے سے وہ انہیں بے حد عزیز تھی۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا جب وہ اسٹیج پر دلہن بنی احسان شاہ کے پہلو میں بیٹھی تھیں۔ وہ فلک شاہ کے ساتھ اسٹیج پر آئی تھیں اور فلک شاہ جھک کر احسان کے کان میں کچھ کہہ رہے تھے تو انہوں نے بہت محبت سے مائرہ کا ہاتھ تھام کر مبارکباد دی تھی۔

"مائرہ بھابی! آپ کو زندگی کا نیا سفر مبارک ہو۔" اور مائرہ نے جس طرح نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹکا تھا اور جن نظروں سے انہیں دیکھا تھا' وہ ششدر سی کھڑی رہ گئی تھیں۔ فلک شاہ نے سیدھا ہوتے ہوئے شاید مائرہ کو ان کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے دیکھ لیا تھا کہ بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ہولے سے دبا کر شاید اس احساس کو زائل کرنے کی کوشش کی تھی' جو اس وقت ان کے دل کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا اور پھر مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

"آئیے عمو! بابا جان ہمیں بلا رہے ہیں۔" اور وہ جو اسٹیج پر تصویر بنوانے کے لیے آئی تھیں فلک شاہ کے

ساتھ اسٹیج سے نیچے اتر آئیں۔ احسان شاہ انہیں آواز ہی دیتے رہ گئے تھے۔

انہوں نے سر اٹھا کر مائرہ اور رابیل کی طرف دیکھا۔ مائرہ ویسی ہی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور رابیل کی نظریں بھی ان پر تھیں۔ رابیل کی آنکھیں اس کے ہونٹوں کی بناوٹ بالکل مائرہ جیسی تھی۔

"تو کیا یہ احسان شاہ اور مائرہ کی بیٹی ہے ۔۔۔ رابیل احسان۔" انہوں نے بے حد اشتیاق سے اسے دیکھا۔ غائبانہ طور پر ایبک نے سب سے ہی ان کا تعارف کروا رکھا تھا۔

اور ان کا اتنی دیر سے بغور جائزہ لیتی ہوئی رابیل نے سوچا۔

"تو یہ ہیں عمارہ پھپھو۔" وہ اسے بہت نرم اور دھیمے مزاج کی لگ رہی تھیں۔ جبکہ مما نے جس طرح ان کا تعارف کروا رکھا تھا' اس سے اس کے ذہن میں عمارہ پھپھو کا جو خاکہ بنا تھا' وہ تو ایک انتہائی بدمزاج اور چالاک سی عورت کا تھا' جبکہ عمارہ کے چہرے پر جو نرمی اور جو شفقت تھی' وہ کسی بدمزاج عورت کے چہرے پر تو ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ اور مما نے اسے بتایا تھا کہ عمارہ اور موحی نے ان کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ اگر موحی الریان میں قدم نہ رکھنے کی قسم نہ کھاتے تو شاید ان کا گھر اجڑ جاتا۔ ایسے ہی فتنہ باز تھے دونوں۔

یہ بات انہوں نے اس روز رابیل سے کہی تھی جب ایبک پہلی بار ہمدان مصطفیٰ کے ساتھ "الریان" آیا تھا۔

"دیکھو! اب یہ شخص کیا گل کھلاتا ہے۔"

اور انہوں نے رابیل کو سختی سے ایبک کے ساتھ بے تکلف ہونے سے منع کیا تھا۔

اس نے اپنی طرف دیکھتی عمارہ کی طرف دیکھا' جو بے اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں وہی نرم سی کیفیت تھی' جس سے محبت کا اظہار ہو رہا تھا اور پھر مائرہ کی طرف دیکھا۔ وہ عمارہ کی طرف متوجہ تھیں۔

"عمارہ ۔۔۔!" انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"عمارہ تمہاری طلاق تو "الریان" میں قدم رکھنے سے مشروط تھی تو اگر اتنے سالوں بعد تم نے موحی سے طلاق لینے کا فیصلہ کرنا ہی تھا تو بہت پہلے کر لیا ہوتا۔ اماں جان بھی تمہاری یاد میں یوں نہ تڑپتیں۔ اور "الریان ۔۔۔"

"لیکن ۔۔۔" عمارہ نے رابیل کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بے حد حیرانی سے مائرہ کو دیکھا۔

"میں نے تو ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

"اچھا تو کیا موحی نے تمہیں چھوڑ ۔۔۔"

"نہیں۔" عمارہ نے تڑپ کر مائرہ کی طرف دیکھا۔

"مائرہ بھابھی! میں "الریان" میں نہیں آئی ہوں ۔۔۔ یہاں ہاسپٹل میں آئی ہوں اور یہیں پر بابا جان سے ملاقات کر کے ایبک کے ساتھ واپس چلی جاؤں گی۔"

"اوہ! اچھا۔" مائرہ نے ہونٹ سکوڑے اور تب ہی رابیل نے ازحد ناگواری سے مائرہ کی طرف دیکھا۔

"مما! پلیز۔" اسے مائرہ کا اس وقت عمارہ سے اس طرح کی طنزیہ گفتگو کرنا قطعی پسند نہیں آیا تھا۔ جبکہ عمارہ بابا جان کی حالت کی وجہ سے پہلے ہی پریشان بیٹھی تھیں۔

"کیا ہے؟" مائرہ نے اس کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ رابیل کچھ کہتی' ایبک ایک بار پھر کمرے میں آیا' مائرہ اور رابیل کی طرف دیکھے بغیر وہ سیدھا عمارہ کے پاس آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

"آئیے ۔۔۔ بابا جان کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ آپ انہیں دیکھ لیں۔ ایک دو گھنٹے وہ انہیں آئی۔ سی۔ یو میں ہی رکھیں گے۔ پھر کمرے میں منتقل کر دیں گے۔ ویسے وہ کافی بہتر ہیں۔"

"اور اگر پھر ان کی طبیعت خراب ہو گئی تو ۔۔۔؟" عمارہ نے خوفزدہ نظروں سے ایبک کی طرف دیکھا۔

"نہیں ۔۔۔ وہ خود آپ کے لیے بہت بے قرار ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں آپ کو لے آؤں۔"

ایک اور عمارہ کے باہر نکلتے ہی رابیل نے مائرہ کی طرف دیکھا۔

"مما! آپ بھی بس۔۔۔ یہ کیا موقع تھا عمارہ پھپھو سے ایسی باتیں کرنے کا؟"

"اچھا! اب تم مجھے بتاؤ گی کہ مجھے کسی سے کس طرح بات کرنی ہے۔ بہت ہمدردی ہو رہی ہے تمہیں پھپھو سے کیا بات ہے۔ آج سے پہلے جس کی نہ شکل دیکھی نہ۔۔۔"

"مما۔۔۔!" رابیل نے بے حد ناراضی سے مائرہ کی طرف دیکھا۔

"سن لو رابی! تمہارے دل میں اگر ایبک کا کوئی خیال ہے تو اسے ابھی اسی وقت دل سے نکال دو۔۔۔ نفرت ہے مجھے موی عمارہ اور اس کی اولاد سے۔"

اور دوسری طرف بھی رابیل احسان شاہ تھی۔ جس نے آج تک کسی کی نہیں سنی تھی اور مائرہ کی ایسی اتنی غلط بات پر وہ احتجاجاً" کمرے سے باہر نکل گئی تھی اور مائرہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں۔

"سنو۔۔۔ سنو رابی! رکو۔ ابھی بابا جان آئی سی یو میں ہیں۔۔۔ اور تمہارے پاپا آتے ہوں گے کیا کہیں گے وہ؟"

لیکن رابیل نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور تیزی سے ہاسپٹل کے کوریڈورز اور لاؤنج سے گزرتی گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔

"مما نے یہ کتنی غلط بات کہی تھی۔ میرے دل میں ایبک کا خیال۔ میں نے تو ایک بار بھی اسے دھیان سے دیکھا تک نہیں اور نہ ہی ڈھنگ سے کبھی اس سے بات کی ہے پھر۔"

اس کی گلابی رنگت دہک رہی تھی اور نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے کاٹتی تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی اور بیسمنٹ میں موجود اسٹور سے دوائیاں لے کر آتے ایبک نے بے حد حیرت سے اسے اور پھر اس کے پیچھے آتی مائرہ کو دیکھا۔۔۔ اور بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"رابیل۔"

رابیل ٹھٹک کر ایک لمحہ کے لیے رک گئی۔ اس نے ایک اچٹتی سی نظر ایبک پر ڈالی۔

"وہ ابھی دس پندرہ منٹ میں بابا جان کو روم میں منتقل کیا جا رہا ہے۔"

لیکن رابیل اس کی بات کا جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی تھی اور وہ حیران سا کھڑا مائرہ مامی کو اس کے پیچھے سیڑھیاں اترتا دیکھ رہا تھا۔ جنہوں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے بے حد غصیلی نظروں سے اسے دیکھا تھا ایبک نے کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں سر کو ہولے سے جھٹکا تھا اور پھر سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔

سیڑھیاں چڑھ کر جب وہ فرسٹ فلور پر آیا تو اس نے کوریڈور میں پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتے مصطفیٰ شاہ کو دیکھا تھا جو اس پر نظر پڑتے ہی تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے اور بے تابی سے پوچھا تھا۔

"بابا جان کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟ ایمرجنسی میں تو نہیں ہیں۔ ہمدان نے فون کیا تھا کہ بابا جان۔"

"بابا جان ٹھیک ہیں اب۔" ان کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایبک نے نرمی سے کہا۔ "انہیں پہلے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا لیکن پھر ڈاکٹر نے انہیں روم میں جانے کی اجازت دے دی ہے۔"

"لیکن نہیں ہیں وہ روم میں بھی۔ دیکھ آیا ہوں میں۔ تم کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو ایبک بیٹا۔"

"نہیں ماموں جان۔۔۔ بابا جان بالکل ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر نے بہت تسلی دی ہے کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک دم ہیجان سے وقتی طور پر طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"

اور اس کی بات پر غور کیے بغیر وہ آئی سی یو کی طرف بڑھ گئے تھے۔ ایبک بھی ان کے ساتھ تھا۔ لیکن وہ آئی سی یو میں نہیں تھے۔ مصطفیٰ شاہ ایک بار پھر پریشان ہو گئے۔ تب ایبک نے پھر انہیں تسلی دی۔

"وہ لفٹ سے گئے ہوں گے۔" اور مصطفیٰ شاہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ یہی سوچ رہے تھے کہ راستے میں تو کسی کمرے کی طرف ہمدان اور بابا جان اسے نظر نہیں آئے تھے۔

تسلی آمیز انداز میں ان کی طرف دیکھتا ایبک اس وقت انہیں بالکل موی کی طرح لگا۔ موی ان سب کو کتنا پیارا تھا۔ کتنا عزیز تھا۔ لیکن وقت نے کیسے اسے ان سے دور کر دیا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ ایبک کے ساتھ پھر سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

ایبک نیچے آ کر ڈاکٹر کے روم کی طرف چلا گیا تھا دوائیاں چیک کروانے۔ اور وہ روم نمبر نو کی طرف بے تابی سے بڑھے تھے اور دروازہ کھولتے ہی جو منظر ان کی آنکھوں نے دیکھا اس نے انہیں ایک لمحے کے لیے دروازے میں ہی ساکت کر دیا تھا۔

وہ یقیناً" عمارہ تھیں جو بابا جان کے بیڈ پر ان کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھیں۔ وقت نے انہیں بہت بدل دیا تھا۔ ان کی گلابی رنگت میں زردیاں گھلی تھیں اور آنکھوں میں ایک حزن کی سی کیفیت ٹھہری ہوئی۔۔۔ لگتی تھی۔ وہ انہیں بے حد کمزور اور کچھ بیمار سی لگی تھیں یہ ان کی بے حد لاڈلی بہن تھیں اور وہ کتنے سالوں بعد انہیں دیکھ رہے تھے۔

وہ دروازے پر ہاتھ رکھے یونہی ساکت کھڑے تھے جب عمارہ نے انہیں دیکھا تھا۔ عمارہ یکدم بابا جان کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ انہوں نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔ لیکن پھر وہاں ہی رک گئی تھیں۔ پتا نہیں مصطفیٰ بھائی ان سے ملنا پسند بھی کریں گے یا نہیں۔ پتا نہیں انہیں بھی مائرہ کی طرح میرا یہاں آنا اچھا نہ لگا ہو۔

اور انہیں ٹھٹک کر رکتے دیکھ کر جیسے مصطفیٰ شاہ چونکے تھے۔

"عمو!" ان کے لبوں سے نکلا تھا اور وہ تیزی سے ان کی طرف لپکے تھے اور دوسرے ہی لمحے وہ انہیں لپٹائے کھڑے تھے عمارہ کے آنسو ان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ اور وہ بھرائی آواز میں کہہ رہے تھے۔

"کیسی ہو عمو۔۔۔ بہت کمزور لگ رہی ہو۔ ہمدان نے بتایا تھا کہ تمہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے۔ اب ٹھیک ہو نا لگتا ہے صدیوں بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

"مصطفیٰ بھائی۔۔۔ آپ۔ آپ سب نے مجھے چھوڑ دیا۔۔۔ یوں الگ کر کے پھینک دیا جیسے میں نے کوئی جرم کیا تھا۔ جیسے بہت بڑی خطا کی تھی میں نے۔ سالوں میں نے انتظار کیا کہ شاید آپ میں سے کسی کو میرا خیال آئے۔۔۔ اور کوئی نہیں تو آپ اور ثنا بھابھی تو ضرور آئیں گی مجھ سے ملنے۔ لیکن میری آنکھیں پتھرا گئیں۔"

وہ رو رہی تھیں اور ہولے ہولے گلہ بھی کر رہی تھیں۔

"عمو۔۔۔!" مصطفیٰ شاہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہیں۔ عمارہ صحیح کہہ رہی تھیں۔ وہ جا سکتے تھے۔ اکیلے' ثنا کو لے کر' لیکن ایسا کچھ تو تھا کہ وہ نہ جا سکے۔ کیا زارا نے اسے کچھ نہیں بتایا ہو گا کہ کس بات نے انہیں زنجیر کر دیا تھا۔

انہیں مراد پیلس کے راستے بھی پتا تھے اور بہاول پور بھی کبھی ان کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ پھر کیوں ان کے قدم مراد پیلس کی طرف نہیں اٹھے تھے' کیوں انہوں نے خود کو روکے رکھا اور اس روکنے روکنے میں اتنے سال گزر گئے۔ ان کے بالوں میں سفید بال نظر آنے لگے۔ روتے روتے عمارہ کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ ہمدان نے انہیں آہستہ سے الگ کیا۔

"پھپھو جان پلیز ریلیکس۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے پھر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ عبدالرحمن شاہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ بہہ کر ان کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

"بابا جان پلیز۔ روئیں نہیں آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" عمارہ نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے ان کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھے تھے۔ تب عبدالرحمن شاہ نے ان کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر چومتے ہوئے نم آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔

"عمو! میرا موی کیسا ہے؟" ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

"موی۔" عمارہ کی سسکی نکل گئی۔ "ٹھیک ہیں۔"

"کبھی اس نے ہمیں بھی یاد کیا؟"

"بابا جان! یہ پوچھیں، موی نے کب کس کو یاد نہیں کیا۔ وہ تو دن رات تڑپتے ہیں، روتے ہیں۔ آپ سب تو ان کے دل میں بستے ہیں۔ وہ تو الریان کی اینٹ اینٹ کو یاد کرتے ہیں۔"

"آہ۔" عبدالرحمٰن شاہ کی آنکھیں پھر برس پڑی تھیں۔

تب ہمدان شاہ بیڈ کی دوسری طرف سے آکر ان کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اس نے اپنا ایک بازو ان کے گرد حمائل کرتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔

"بابا جان پلیز! حوصلہ کریں۔ نہیں تو پھر طبیعت خراب ہو جائے گی۔ جو گزر گیا سو گزر گیا۔ اب اس وقت عمارہ پھپھو آپ کے پاس ہیں۔ آپ ان سے باتیں کریں۔ بیتے برسوں کا حال احوال پوچھیں۔"

ایک ہاتھ ان کے گرد حمائل کیے اور ایک ہاتھ سے ان کے آنسو پونچھتے ہوئے وہ ہولے ہولے ان سے باتیں کر رہا تھا۔

ایسے میں مصطفیٰ شاہ نے ہمدان مصطفیٰ کی طرف تشکر سے دیکھا۔ وہ خود میں اس وقت بالکل بھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔ بیتے ہوئے سالوں کے سارے منظر ان کی آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ موی انہیں بہت پیارا تھا بہت عزیز تھا۔ پھر بھی جب عبدالرحمٰن شاہ نے بتایا تھا کہ مراد شاہ عمارہ کی رخصتی چاہتے ہیں تو انہوں نے صاف منع کر دیا تھا۔

"نہیں بابا جان! ابھی نہیں۔۔۔ ابھی تو وہ پڑھ رہی ہے اور موی بھی دو سال ضائع کر چکا ہے۔ اب کم از کم وہ ماسٹر تو کر لے۔"

لیکن مروہ پھپھو کا بھی اصرار تھا کہ موی اور عمارہ کی شادی جلد کر دی جائے۔ اب پتا نہیں اس میں ان کی کیا مصلحت تھی۔ لیکن عبدالرحمٰن شاہ نے مراد شاہ کی بات مان لی تھی اور فی الحال نکاح کی ہامی بھر لی تھی اور رخصتی عمارہ کے بی اے کرنے کے بعد طے پائی تھی۔ اور پھر عمارہ کے نکاح کے ساتھ ساتھ گھر میں ایک دم سے رونق اتر آئی تھی۔ عمارہ کا موی سے پردہ کرا دیا گیا تھا۔

اس روز موی ہاسٹل سے آیا تھا۔ گھر میں ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ بینا چچی، مروہ پھپھو مرتضیٰ کی بیوی تینوں رات کے کھانے کے بعد ڈھولکی لے کر لاؤنج میں بیٹھ گئی تھیں۔ چھوٹی زارا سب سے زیادہ پُرجوش تھی۔ احسان اور عثمان بھی نیچے کارپٹ پر بیٹھے سب کے ساتھ تالیاں بجاتے ہوئے گا رہے تھے۔ اور وہ موی کے پاس بیٹھے ہوئے ان سب کو گاتے ہوئے سُن رہے تھے اور احسان بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ دونوں بھی گانوں میں ان کا ساتھ دیں ورنہ یہ خواتین بازی لے جائیں گی۔ مرتضیٰ پتا نہیں کہاں تھے۔ انہوں نے ادھر ادھر کھوجتی نظروں سے دیکھا تھا اور یہ سوچ کر اٹھنے ہی لگے تھے کہ شاید وہ بابا جان کے پاس ہوں تب ہی موی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے پوچھا تھا۔

"مصطفیٰ بھائی! عمارہ کہاں ہے؟"

اور ابھی انہوں نے کچھ جواب بھی نہیں دیا تھا کہ مروہ پھپھو نے گانا گاتے گاتے مڑ کر پیچھے دیکھا تھا شاید انہوں نے موی کی بات سن لی تھی۔

"عمارہ کا تم سے پردہ ہے نکاح تک۔"

"لیکن کیوں؟" وہ ازحد حیران ہوا تھا۔

اور اس کی حیرانی کو بے حد انجوائے کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"موی! میں ذرا بابا جان کی طرف جا رہا ہوں، انہوں نے مہمانوں کی لسٹ بنانے اور کچھ مشورے وغیرہ کے لیے بلایا تھا۔ مرتضیٰ بھی شاید بابا جان کے پاس ہیں۔ میرے آنے تک تم جانا نہیں۔"

اور جب وہ لاؤنج سے نکل کر بابا جان کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو لابی میں پڑے فون کی بیل بج اٹھی تھی۔ انہوں نے رک کر فون ریسیو کیا تھا۔

"ہیلو۔۔۔ کون!"

"میں۔۔۔" دوسری طرف کوئی نسوانی آواز تھی۔

"مجھے مرتضیٰ یا مصطفیٰ سے بات کرنا ہے۔"

"جی میں مصطفیٰ بول رہا ہوں، آپ کون ہیں پلیز۔"

"میں جو کوئی بھی ہوں اسے آپ رہنے دیں۔ مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ جس شخص سے اپنی بہن کا نکاح کرنے والے ہیں۔ وہ شخص آپ کی بہن کے قابل نہیں ہے۔۔۔ حد درجے کا فلرٹ ہے۔ کالج میں جتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ اس کی دوستی ہے اور کتنی ہی لڑکیوں کے ساتھ اس نے شادی کے وعدے کر رکھے ہیں۔ خود میرے ساتھ بھی دو سال سے افیئر چلا رکھا ہے۔ اور اب جبکہ میں۔" لڑکی کی آواز بھرا گئی تھی۔

مصطفیٰ ہاتھ میں ریسیور تھامے ساکت کھڑے تھے۔

"پلیز، اپنی بہن کی زندگی تباہ مت کریں۔" لڑکی نے روتے ہوئے کہا تھا اور فون بند کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی نہ پوچھ سکے تھے کہ وہ کون تھی اور اس نے ان کے گھر کا فون نمبر کہاں سے لیا تھا۔

ریسیور ہاتھ میں لیے وہ یونہی خالی خالی نظروں سے ریسیور کو دیکھتے رہے تھے اور پھر ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہ وہاں ہی لابی میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ وہ بابا جان کے پاس جانے کے لیے نکلے تھے۔

"نہیں۔۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ موی ایسا نہیں ہو سکتا۔"

انہیں لڑکی کی بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس کی وہ روتی آواز۔ کیا موی نے اس کے ساتھ کچھ غلط کیا ہے۔ لیکن پھر اپنی ہی سوچ پر وہ شرمندہ سے ہو گئے تھے۔ موی انہیں بے حد عزیز تھا لیکن عمارہ ان کی بہن تھی انہیں اس کے متعلق تحقیق تو کرنا چاہیے۔ ابھی تو نکاح میں کچھ دن ہیں۔ کیا وہ ڈائریکٹ موی سے بات کریں۔ بابا جان سے کہیں۔ مرتضیٰ سے بات کریں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے لابی میں بیٹھے تھے جب مروہ پھپھو لاؤنج سے کسی کام کے لیے باہر نکلی تھیں۔ اور انہیں یوں کرسی پر دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے دیکھ کر پریشان سی ہو کر ان کے پاس آکر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھنے لگی تھیں۔

"مصطفیٰ! کیا ہوا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

اور انہوں نے سر اٹھا کر مروہ پھپھو کی طرف دیکھا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو وہ بے حد خوش خوش لاؤنج سے باہر آئے تھے اور پھر اتنی سی دیر میں ایسا کیا ہو گیا تھا۔ مروہ پھپھو بے حد گھبرا گئی تھیں۔

"مصطفیٰ بولو نا، خیر تو ہے نا۔ ایسے کیوں بیٹھے ہو۔"

"مروہ پھپھو۔۔۔!" انہوں نے ایک دم ہی مروہ پھپھو سے سب کہنے کا فیصلہ کیا تھا اور کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔

"پھپھو پلیز۔ ذرا میرے ساتھ میرے کمرے میں چلیں۔" اور پھر انہوں نے وہ سب مروہ پھپھو کو بتا دیا تھا۔ جو اس لڑکی نے فون پر کہا تھا اور مروہ پھپھو نے ان کی ساری بات سننے کے بعد کہا تھا۔

"میرے خدا وہ لڑکی اس حد تک آجائے گی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔"

"کون لڑکی پھپھو؟" وہ الجھ سے گئے تھے۔

"دیکھو مصطفیٰ! جو فون تم نے سنا ہے اسے بھول جاؤ۔ موی ایسا نہیں ہے۔ حیرت ہے تم نے اس لڑکی کی بات پر یقین کیسے کر لیا۔ کیا تم موی کو نہیں جانتے۔"

"یقین تو نہیں کیا تھا پھپھو! لیکن اپ سیٹ ضرور ہو گیا تھا۔" وہ شرمندہ سے ہوئے تھے۔

"تم اطمینان رکھو مصطفیٰ! ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کو بھی جانتی ہوں اور اس فون کے پس منظر کو بھی۔"

"کون ہے وہ لڑکی اور اسے موی پر یہ الزام لگانے کی جرأت کیسے ہوئی۔۔۔ بتائیں مجھے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ یک دم ہی غصے میں آگئے تھے۔

"یہ جاننا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے مصطفیٰ! کہ وہ کون ہے۔ وہ میرے سسرالی عزیزوں میں سے ہے اور موی کے لیے پاگل ہو رہی ہے۔ اس سلسلے میں مجھ پر بھی دباؤ تھا کہ میں اس کی شادی موی سے کروا دوں تب ہی میں نے بھائی جان سے کہا تھا کہ فی الحال موی اور عمارہ کے نکاح کے متعلق کسی کو نہ بتایا جائے۔ لیکن بھلا ہو عبداللہ بھائی کا، وہ شادی کا کارڈ

دینے گئے تو عمارہ کے نکاح کا ذکر بھی کر آئے۔ خیر تم ریلیکس ہو جاؤ۔"

"آپ مجھے بتائیں تو سہی۔ میں اس کا پاگل پن دور کردوں گا۔" وہ بضد ہوئے تھے۔

"رہنے دو مصطفیٰ! جب موی کا نکاح ہو جائے گا تو وہ خود ہی مایوس ہو جائے گی۔" اور انہوں نے شکر کیا تھا کہ انہوں نے مردہ پھپھو سے اس کا ذکر کیا تھا۔ کسی اور سے کر دیتے تو موی کس قدر ہرٹ ہوتا..... وہ تو یوں بھی بہت تھڑدلا اور حساس تھا..... اور پھر کتنے دن گزر گئے کوئی فون نہیں آیا تھا..... جب بھی بیل ہوتی تو ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ فون اٹھائیں۔ احسان اور عثمان نے ان کا ریکارڈ بھی لگایا تھا۔

"کہیں سسرال سے کسی خاص بندے کا فون تو نہیں آنا۔" اور وہ ہنس دیے۔

"کیا خبر' ایسی باتیں بتائی تھوڑی جاتی ہیں۔" اور پھر نکاح کا دن بھی آگیا تھا۔ اگرچہ پہلے یہ پروگرام تھا کہ عمارہ کا نکاح سب سے آخری فنکشن ہوگا۔ عثمان اور مصطفیٰ کے ولیمہ والے دن نکاح کا فنکشن بھی ہو جائے گا لیکن پھر موی نے شور مچایا تھا..... "نہیں بھئی سب سے پہلا فنکشن نکاح کا ہوگا۔ یہ سخت ناانصافی ہے کہ شادی کے سارے فنکشنز میں عمارہ مجھ سے چھپتی رہے۔ اور میں اور وہ دونوں شادی انجوائے بھی نہ کر سکیں۔"

تب مائرہ پھپھو اور بینا چچی نے پورا پورا موی کا ساتھ دیا تھا۔

"تو اور کیا۔ موی صحیح کہتا ہے۔"

اور یوں پہلا فنکشن موی اور عمارہ کے نکاح کا تھا۔ مراد شاہ بہاولپور سے ایک دن پہلے ہی آگئے تھے اور ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ دو تین قریبی عزیز تھے۔ ان کے دو کزن اور ایک پھوپھی زاد بہن۔ اور نکاح والے دن عمارہ اور موی دونوں اتنے پیارے لگ رہے تھے کہ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی تھی۔

"یا اللہ انہیں نظر بد سے بچانا۔" لیکن نظر تو لگ گئی تھی لیکن تب وہ نہیں جانتے تھے۔

"ارے یہاں ابھی تک رونے دھونے کا سین چل رہا ہے۔"

ایبک نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ تو انہوں نے چونک کر بابا جان کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ بابا جان کے بیڈ پر عمارہ نم آنکھوں کے ساتھ بیٹھی تھیں اور موی اسی طرح بابا جان کے گلے میں بازو حمائل کیے ہولے ہولے کچھ کہہ رہا تھا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے ایبک؟" بابا جان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی میڈیسن لینے گیا تھا۔"

"ہمدان!" وہ ایک طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے ہمدان سے مخاطب ہوا تھا۔

"یہ دوائیں تم دیکھ لینا کہ کب کب دینی ہیں۔ ویسے تو سسٹر خود ہی آکر دیتی ہیں۔" ہمدان نے سر ہلا دیا تھا۔ مصطفیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور سوچا۔

"ایبک بالکل موی جیسا ہے ویسا ہی لونگ اور کیئرنگ۔"

"تم نے اتنی دیر کیوں کر دی ایبک؟" بابا جان اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ "پہلے عمارہ کو کیوں نہیں لے آئے۔ اگر مجھے کچھ ہو جاتا میں زندہ نہ رہتا تو اپنی عمو کو دیکھنے کی حسرت لیے دنیا سے چلا جاتا اس کی ماں کی طرح۔"

پھر وہ عمارہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"وہ تمہارے لیے بہت تڑپتی تھی عمو! بہت روتی تھی۔ بس ایک بار تمہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ تمہیں سینے سے لگانا چاہتی تھی لیکن تم نے کیسا دل پتھر کر لیا تھا۔"

بہت سارے دنوں سے دل پر رکھے شکوے کا بوجھ جیسے اب عبدالرحمٰن شاہ سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔

"میں نے بابا جان!" عمارہ نے بے حد شاکی نظروں سے دیکھا۔

"یا آپ نے..... آپ سب نے اپنے دل پتھر کر لیے تھے۔ ٹھیک ہے "الریان" کے دروازے مجھ پر

"باباجان! وہ شاید گھر چلی گئیں۔"

مصطفیٰ شاہ نے آہستگی سے کہا اور یک دم ان کے دل میں خیال آیا۔"وہ لڑکی جس نے اس رات فون کر کے موی کے متعلق الٹی سیدھی باتیں کی تھیں۔ مائرہ تو نہیں تھی کہیں۔ مروہ پھپھو کی سسرالی عزیز۔ لیکن نہیں بھلا مائرہ کیسے وہ لڑکی ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بھلا مروہ پھپھو احسان اور مائرہ کی شادی پر اتنا اصرار کیوں کرتیں۔" انہوں نے خود ہی اپنی بات کو جھٹلا دیا۔

اور عین اس لمحے ہمدان مصطفیٰ نے بھی سوچا۔

"کمال ہے یہ مائرہ چچی اور رابیل اس حالت میں بابا جان کو چھوڑ کر گھر چلی گئیں جب کہ اس نے تو باباجان کے ٹھنڈے پڑتے جسم کو دیکھ کر سوچ لیا تھا کہ شاید بابا جان۔"

"باباجان پلیز سنبھالیے خود کو' یہ باتیں ابھی سوچنے اور کرنے کی نہیں ہیں۔"

انہوں نے خود سے الگ کرتے ہوئے انہیں آہستگی سے لٹا دیا اور پھر ہمدان کو اشارا کیا کہ وہ عمارہ اور باباجان کو پانی پلائے۔ ایبک بھی عمارہ کو لیے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

اور ہمدان کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر عمارہ کی طرف بڑھا رہا تھا۔ باباجان نے پانی کے دو گھونٹ بھر کر گلاس ہمدان کو پکڑا دیا تھا۔ وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"عمو۔۔۔ ادھر میرے پاس آؤ۔ ادھر آکر بیٹھو۔"

اور عمارہ ایک بار پھر اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھی تھیں اور ایک بار پھر انہوں نے باباجان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بڑے دل گیر لہجے میں کہا تھا۔ "الریان تو ہمارے لیے شجر ممنوعہ بن گیا تھا لیکن آپ نے مراد پیلس کو کیوں اپنے لیے حرام کر لیا تھا۔

تب عبدالرحمٰن شاہ نے بے بسی سے مصطفیٰ شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ کیا کہتے عمارہ سے کہ زنجیریں تو ان کے پاؤں میں بھی پڑ گئی تھیں' وہ بھی اتنے ہی بے بس تھے جتنی وہ۔ اگر موی نے اس رات غصے میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ وہ "الریان" میں قدم نہیں رکھیں گے تو احسان شاہ نے بھی ان سب کے لیے مراد پیلس

بند ہوئے تھے لیکن "مراد پیلس" کے دروازے تو آپ سب کے لیے کھلے تھے۔ لیکن آپ کے لیے تو میں اور موی مر گئے تھے پھر ان کھلے دروازوں کی طرف آپ کیوں دیکھتے۔ جب انجی ہوئی تھی اور جب ڈاکٹرز نے میری زندگی خطرے میں بتائی تھی اور میرے بچنے کے چانسز بہت کم تھے تب بھی آپ کے دل نہ پسیجے۔۔۔ موی نے کیسے رو رو کر "الریان" فون کیا تھا۔ صرف میرے لیے' میری خاطر۔ میں اپنے آخری لمحوں میں اپنے سب پیاروں کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن میری نظریں منتظر ہی رہیں۔ میں آپریشن تھیٹر تک جاتے جاتے بھی مڑ مڑ کر دیکھتی رہی کہ شاید ابھی کوئی آتا ہو۔ کوئی میرا ماں جایا۔۔۔ اور کوئی نہیں تو میرا باپ میری ماں۔۔۔ موی نے تو فون پر یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ آپ لوگوں کے سامنے نہیں آئیں گے۔ اگر آپ کو ان سے نفرت ہے۔"

"نہیں۔" باباجان نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

اور ایبک حیرت سے عمارہ کو پہلی بار اتنا بولتے اور شکوہ کرتے دیکھ رہا تھا۔

"اماں جان بیمار ہوئیں تو مجھے کسی نے اطلاع نہ دی۔ مجھے تو ان کی وفات کی خبر بھی زارا کے آنے پر ان کی وفات کے تین دن بعد ملی۔۔۔ اور میں اس کے لیے "الریان" کے کسی بھی شخص کو کبھی معاف نہیں کروں گی کبھی نہیں۔"

آنسوؤں نے ان کا حلق بند کر دیا۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی تھیں۔

"نہیں۔۔۔" باباجان کمزور آواز میں کہہ رہے تھے "نہیں عمو! ایسا نہیں ہے بیٹا۔۔۔ میں نے خود کہا تھا مائرہ سے کہ وہ تمہیں اطلاع کر دے کہ تمہاری ماں اسپتال میں ہے۔۔۔ اور ڈاکٹر اس کی زندگی سے متعلق پرامید نہیں ہیں۔ ایک بار نہیں دو تین بار مائرہ نے تمہیں فون کیا تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ تم نے کہا ہے۔ موی نے تمہیں آنے کی اجازت نہیں دی پھر بھی۔۔۔ پھر بھی میں نے تمہاری ماں کی وفات کے بعد ایک بار پھر کسی سے کہا تھا۔ یاد نہیں شاید مائرہ سے ثنا سے یا شانی سے کہ تمہیں اطلاع دے دیں۔ اپنی ماں کا آخری دیدار تو کر لو۔"

"نہیں' مجھے کسی نے کوئی فون نہیں کیا تھا۔ نہ مائرہ بھابی نے نہ کسی اور نے۔ مجھے پتا چلتا' میری ماں بیمار ہے۔ بستر مرگ پر ہے تو میں اڑ کر آتی اور موی۔۔۔ موی بھلا مجھے کیوں روکتے۔ وہ تو مجھ سے پہلے اڑ کر پہنچتے۔ وہ تو مجھ سے زیادہ "الریان" کے باسیوں سے محبت کرتے ہیں۔

ان کے آنسوؤں میں مزید روانی آگئی اور پھر وہ چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ جیسے اختیار کی لگامیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھیں۔ ایبک اور مصطفیٰ ایک ساتھ ہی ان کی طرف بڑھے تھے اور پھر ایبک نے انہیں اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا اور ہولے ہولے انہیں تھپک رہا تھا۔

پلیز مما! بس اب اور نہیں۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں پاپا سے کیا کہوں گا۔ وہ تو۔۔۔ نہیں پلیز۔ اپنے آپ کو سنبھالیے۔" مصطفیٰ عبدالرحمٰن شاہ کو اپنے ساتھ لگائے ہولے ہولے کہہ رہے تھے۔

"باباجان! پلیز اپنے آپ کو سنبھالیے۔ گلے شکوے تو ہوتے رہیں گے۔ یہ سب تو تقدیر میں لکھا تھا۔ شاید ایسے ہی ہونا تھا۔ کچھ باتیں انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی ہیں باباجان۔"

"لیکن یہ سب تو۔۔۔" انہوں نے مصطفیٰ شاہ کو دیکھا۔ "یہ سب تو انسانوں نے ہی کیا ہے۔ مائرہ نے آخر ایسا کیوں کیا مانی۔۔۔؟ اس نے عمو کو بتایا کیوں نہیں۔۔۔ تمہاری ماں کی وہ آخری نظریں۔۔۔ وہ حسرت بھری نظریں تو میرے دل میں گڑ گئی ہیں۔ مرتے دم تک گڑی رہیں گی اور عمو۔۔۔ اس کے سینے میں دکھ کا جو یہ تیر پیوست ہے کہ وہ اپنی ماں سے نہ مل سکی نہ جیتے جی۔ نہ مرنے کے بعد چہرہ دیکھ سکی۔۔۔ کہاں ہے مائرہ' پوچھو تو اس سے۔"

انہوں نے کمرے میں دیکھنے کے لیے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ابھی عمارہ کے آنے سے پہلے تو وہ یہیں تھی۔ پھر کہاں چلی گئی۔

کے راستے بند کردیے تھے۔

عمارہ اور فلک شاہ کو الریان سے گئے تب چھ دن ہو گئے تھے اور الریان کے در و دیوار پر ویرانی بسیرا کیے ہوئے تھے۔ اماں جان ہر وقت روتی رہتی تھیں۔ عبدالرحمٰن شاہ کو کسی پل چین نہ تھا۔۔۔ یہ کیا ہو گیا تھا اور کیوں؟ انہوں نے ایسا تو نہ چاہا تھا۔ وہ چچا جان کو کیا منہ دکھائیں گے۔۔۔ وہ روز محشر سلجوق سے کیا کہیں گے۔

ایسے میں زارا پہلی بار سسرال سے میکے آئی تو عمارہ کو نہ پا کر حیران رہ گئی۔

"عمو آپا کہاں چلی گئیں؟ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا وہ میرے آنے تک بہاول پور نہیں جائیں گی۔" زارا کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے ہی تو وہ رخصت ہو کر گئی تھی اور اماں جان سے ساری حقیقت جان کر وہ مچل اٹھی تھی بہاول پور جانے کے لیے۔ اس نے عمارہ سے بات بھی کی تھی۔

"عمارہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے بابا جان کو بتایا تھا۔

اور جب عبدالرحمٰن شاہ اماں جان، مصطفیٰ اور زارا بہاول پور جانے کے لیے تیار ہوئے تھے تو احسان شاہ نے کہا تھا۔

"اس گھر سے کوئی بھی مراد پلیس نہیں جائے گا اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر یہاں سے کوئی مراد پلیس گیا یا کسی نے عمارہ یا موی کو فون کیا تو میں اسی وقت خود کو گولی مار لوں گا۔" تب مصطفیٰ شاہ نے نرمی سے کہا تھا۔

"ایسا کیا ہے شانی! جو تم موی اور عمارہ سے اتنے متنفر ہو گئے ہو۔ ہو سکتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوئی ہو۔"

"نہیں مصطفیٰ بھائی! مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ جو ویا ہے اسے ویا ہی رہنے دیں۔"

"عمارہ بیٹی ہے ہماری ہم کیسے اسے اس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔۔۔ وہ یہاں نہیں آ سکتی لیکن ہم تو جا سکتے ہیں۔"

"وہ اب آپ کی بیٹی نہیں موی کی بیوی ہے۔ میں نے کہا تھا اس سے کہ وہ "الریان" میں آ جائے موی کو چھوڑ کر۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ "الریان" کے دروازے عمارہ کے لیے ہر وقت کھلے ہیں لیکن وہ نہیں آئے گی اور آپ سمجھیں کہ وہ مر گئی ہے آپ سب کے لیے۔" احسان شاہ بے حد سفاکی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا اور عبدالرحمٰن شاہ حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ عمارہ کے لیے اتنا سفاک بھی ہو سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے موی نے غصے میں الٹا سیدھا کچھ کہہ دیا ہے لیکن ہم عمارہ کو تو نہیں چھوڑ سکتے نا۔"

مصطفیٰ اور عثمان نے پھر مرتضیٰ نے بھی سمجھایا تھا۔ لیکن احسان شاہ کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ اور بھی سخت ہوا تھا اور اس نے کہا تھا وہ صرف خود کو ہی نہیں مائرہ کو بھی گولی مار دے گا اور یہ بات اس نے قسم کھا کر کہی تھی اور تب سب ساکت ہو گئے تھے۔

"قسم کا کفارہ بھی ہو سکتا ہے۔" مصطفیٰ شاہ نے عبدالرحمٰن شاہ کو سمجھایا تھا "ابھی نہ جانے کیوں وہ غصے میں ہے۔ بعد میں کبھی آرام سے بات کی جا سکتی ہے اس سے۔" لیکن وہ بعد کبھی نہیں آیا تھا۔

وہ نہ تو قسم کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوا تھا اور نہ اس نے وہ بتائی تھی۔ ہاں اس کا ایک ہی مطالبہ تھا۔

"عمارہ موی کو چھوڑ کر الریان آ جائے۔"

لیکن عمارہ یہ بات سننے کے لیے تیار ہی نہ تھیں۔ خود دوبار مصطفیٰ نے احسان کے کہنے پر اسے فون کیا تھا۔

"عمو! ہم سب تمہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ موی نے کوئی راہ نہیں چھوڑی۔ تم موی کو چھوڑ کر آ جاؤ۔" انہوں نے یہ بات بہت مشکل سے کہی تھی اور عمارہ رو پڑی تھیں۔

"نہیں مصطفیٰ بھائی! موی مر جائے گا۔ وہ تو ایک دن بھی میرے اور ایبک کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسا مت کہیں۔"

اور یوں چھبیس طویل برس گزر گئے تھے۔ انہوں نے شرمندہ سا ہو کر سر جھکا لیا۔ چھبیس برس پہلے عمارہ سے کہی اپنی بات پر وہ خود ہی شرمندہ ہو گئے تھے۔ عبدالرحمٰن شاہ نے انہیں سر جھکاتے دیکھا تو ان کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ اور عمارہ کی طرف دیکھا جو ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

"کچھ سوالوں کے جواب نہیں ہوتے بیٹا! میرے پاس بھی تمہارے سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔" اور ایبک نے موضوع بدلنے کے لیے ہمدان کو مخاطب کیا تھا۔

"سنو ہمدان! ہم ایئرپورٹ سے سیدھے اسپتال آ رہے ہیں اور تمہیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ کینٹین سے ایک کپ چائے ہی پلوا دو۔"

"اوہ ہاں۔۔۔!" ہمیشہ کی طرح ہمدان بوکھلا گیا تھا اور تیزی سے دروازے کی طرف لپکا تھا اور پھر کچھ خیال آتے ہی واپس مڑ کر اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر کمرہ نمبر نو میں چائے اور سینڈوچ بھجوانے کا آرڈر دیا تھا۔

"یہاں بس سینڈوچ ہی ملیں گے۔"

"کافی ہیں۔" ایبک مسکرایا تھا۔ وہ موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"انجی کو بھی ساتھ لے آتیں عمو۔" عبدالرحمٰن شاہ محبت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ "زارا بہت ذکر کرتی تھی انجی کا، کیسی ہے وہ؟ تمہارے جیسی؟"

وہ بے حد اشتیاق سے پوچھ رہے تھے۔

"شکل و صورت میں میرے جیسی لیکن مزاج میں مختلف۔ میں اس کی عمر میں بہت شوخ اور باتونی تھی لیکن وہ بہت کم گو اور سنجیدہ ہے۔ اس نے شاید پیدا ہوتے ہی ماں باپ کا دکھ اپنے اندر اتار لیا تھا۔ تب ہی تو۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر چپ ہو گئیں تو ایبک نے عبدالرحمٰن شاہ کی طرف دیکھا۔

"کسی روز لاؤں گا اسے آپ سے ملانے۔ اسے خود بھی بہت اشتیاق ہے آپ سے ملنے کا۔"

"ابھی ہی ساتھ لے آتے، پتا نہیں۔" عبدالرحمٰن شاہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"پھر پاپا کے پاس کون ہوتا۔ مما کے واپس جانے تک وہ رہیں گی پاپا کے پاس۔ انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"کیوں کیا ہوا موی کو۔ کیا بیمار ہے کچھ؟" عبدالرحمٰن شاہ اور مصطفیٰ شاہ کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا تھا۔

"نہیں وہ۔۔۔" اور تب ہی دروازہ کو کھول کر احسان شاہ اندر داخل ہوئے تھے۔ بے حد گھبرائے ہوئے سے۔ اندر قدم رکھتے ہی ان کی پہلی نظر مصطفیٰ پر پڑی تھی۔

"کیا ہوا بابا جان کو؟"

اور پھر دوسری نظر عمارہ پر پڑی تو انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے ان کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ جس تیزی سے اندر آئے تھے اسی تیزی سے واپس پلٹ پڑے۔

"احسان! شانی۔۔۔!" مصطفیٰ نے انہیں پکارا تھا۔

ہمدان کا فون ملنے کے بعد وہ شانی کی طرف ہی گئے۔ وہ آفس میں نہیں تھا تب وہ اس کے آفس میں اس کے لیے پیغام چھوڑ آئے تھے۔

احسان شاہ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ تب وہ تیزی سے ان کے پیچھے لپکے تھے اور لابی میں تیز تیز چلتے احسان کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تھا۔

"رکو۔۔۔ رکو احسان! کیا ہوا ہے؟" احسان شاہ نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"پہلے ایک پھر اب عمارہ اور کل کو۔ موی۔۔۔ نو۔۔۔ نیور۔ ناٹ ایٹ آل۔"

وہ مصطفیٰ شاہ کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گئے اور مصطفیٰ شاہ وہاں ہی لابی میں حیران سے کھڑے اسے جاتے دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

رضیہ مہدی

"مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ' یہ روز کی بک بک سن کر میرا دماغ خراب ہونے لگتا ہے۔" عارف نے قدرے سخت لہجے میں واصف سے پوچھا۔

"ارے کچھ نہیں' وہ بس۔" عبیر نے شاید بات سنبھالنی چاہی۔

"آپ چپ رہیں بالکل۔" عارف نے چمچے کو پلیٹ میں زور سے رکھا' پھر وہ واصف کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں بولو' بات کیا ہے' میں تمہارا بنا ہوا منہ دیکھ رہا ہوں' خوب اچھی طرح کان کھول کر سن لو' آخری دفعہ بتا رہا ہوں' جو پکے گا گھر میں وہی کھانا ہوگا' سن لیا۔" وہ دھاڑا۔

"جی!" واصف کا جواب دھیما سا تھا۔

"اب اپنا کھانا ختم کرو جلدی۔" وہ اپنی پلیٹ کی طرف — متوجہ ہوئے۔

میں دیکھ رہا تھا' عبیر پہلو بدل رہی تھی' شمائلہ اور اریبہ دونوں اب بڑی بددلی سے کھا رہی تھیں' جبکہ واصف صرف چمچے اور کھانے سے کھیل رہا تھا۔

مجھے لگنے لگا کہ میرا اس وقت وہاں ہونا بالکل مناسب نہیں تھا' حالانکہ یہ میرا معمول تھا' عبیر میری چھوٹی بہن ہے تو عارف میرا کزن ہی نہیں' بچپن کا دوست بھی ہے۔ میں اپنے دفتر سے آتے ساتھ ہی کھانا کھا لیتا ہوں' پھر یونہی تھوڑی دیر ٹہلنے نکل پڑتا ہوں' عبیر کا گھر میرے محلے میں ہی ہے' صرف دو گلیاں آگے' اسی لیے اکثر ٹہلتا ہوا یہاں آجاتا ہوں۔ عارف سے تھوڑی گپ شپ بھی ہو جاتی ہے' کبھی یہ لوگ کھانا کھا چکے ہوتے ہیں' کبھی کھا رہے ہوتے ہیں کوئی تکلف تو ہے نہیں' میں ان لوگوں سے باتیں کرتا رہتا ہوں' قریب بیٹھ کر کبھی کبھی عبیر یا عارف کے اصرار پر کوئی سویٹ ڈش چکھ لیتا ہوں یا کبھی موڈ ہوتا ہے تو چائے پی لیتا ہوں اور اگر جی نہیں چاہتا تو منع بھی کر دیتا ہوں' یہ میرے مزاج آشنا ہیں' اس لیے سمجھ جاتے ہیں۔

عارف مزاج کا شروع ہی سے کچھ تیز ہے' ویسے انسان بہت اچھا ہے' مگر اس کا غصہ' سچ پوچھیں تو مجھے کبھی کبھی اپنی چھوٹی بہن پر فخر سا ہونے لگتا ہے' وہ بڑی خوبصورتی سے اپنا رشتہ نبھا رہی ہے' اس کی شادی کو اب تقریباً" چودہ سال ہو رہے ہیں' مگر مجال ہے جو اک حرف شکایت کبھی کسی نے اس کی زبان سے سنا ہو' ویسے یہ بات بھی ہے کہ عارف اس کا بہت خیال رکھتا ہے' اسے کسی چیز کی کوئی کمی نہیں ہوتی' شاید اسی لیے وہ اچھی بیویوں کی طرح صبر و سکون سے ان سخت مقامات سے گزر جاتی ہے' جہاں چپ رہنا مشکل اور بولنا زندگی کو مشکل میں ڈال دیتا ہے۔

عارف بہت محنتی ہے اور اپنی بیوی اور بچوں کے لیے وہ خود کو جیسے بھلائے ہوئے ہے' ایک پرائیویٹ ادارے میں کام کرتا ہے' جہاں کام' کام اور صرف کام ہی مقام بناتا ہے' وہ ادارے کے مالکان کی نظر میں ان تھک محنت سے وہ مقام بنا چکا ہے کہ اس کی تنخواہ اور مراعات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس کو ترقیاں ملتی رہتی ہیں' البتہ اس اعتبار اور اعتماد کو قائم رکھنے کے لیے وہ نا صرف صبح سے رات دیر تک کام کرتا ہے بلکہ چھٹیوں میں بھی آرام نہیں کرتا۔

سچ بات تو یہ ہے کہ میں جب اوروں کا تقابل اس سے کرتا ہوں اور اوروں کی کیا بات خود سے بھی تقابل کروں تو وہ الگ ہی دکھائی دیتا ہے' اپنے گھر اور خاندان کے لیے خود کو مٹانے والا' سب کا خیال رکھنے والا' بہت محبت کرنے والا' مگر اس کا غصہ' وہ غصے میں جیسے کچھ بھی نہیں دیکھ پاتا' موقع محل' وقت' اپنا' پرایا کچھ نہیں' بس بادل گھر کر آتے ہیں اور گرج چمک کر گزر جاتے ہیں۔

عبیر اس کی کمزوری سے واقف ہے اور ہمیشہ بات کو سنبھالنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے' مگر اب میں دیکھ رہا تھا کہ اولاد کے معاملے میں وہ جیسے پھنس سی جاتی ہے' ایک طرف تو وہ ماں ہے دوسری طرف اسے ایک اچھی بیوی کا کردار نبھانے کی عادت ہو گئی ہے' مگر اولاد کی محبت اس کی اب تک کی صبر و سکون سے چپ رہنے اور برداشت کر لینے کی عادت کو توڑنے کے درپے ہے' وہ جانتی ہے کہ غصے میں عارف کچھ نہیں سنتا' تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

وہ جو کہتے ہیں ناں کہ "باپ پر پوت" تو واصف بھی اپنے باپ پر ہی پڑا ہے' یوں بھی آج کل کے بچے کھانا کھانے میں کچھ زیادہ ہی نخرے کرنے لگے ہیں۔

یہ نہیں کھانا' وہ نہیں کھانا' سبزی نہیں کھائیں گے' گوشت اچھا نہیں لگتا' کھائیں گے تو بالکل صاف بوٹی ہونی چاہیے' مرچیں اچھی نہیں لگتیں' پھیکا کھانا برا لگتا ہے۔

عبیر بہت اچھا کھانا پکاتی ہے' عارف کو اکثر خاندان والوں اور دوست احباب کو کھانے پر بلانے کا شوق چڑھا رہتا ہے۔ سب ہی عبیر کی تعریف کرتے ہیں' مگر جب دو چار مرتبہ میں نے یوں کھانا کھانے پر واصف کو ڈانٹ کھاتے سنا اور گھر کا ماحول مکدر ہوتے دیکھا تو میں نے اس وقت وہاں جانے سے احتیاط کرنا شروع کر دی۔

دو چار دن بعد جب میں وہاں گیا تو عارف ابھی دفتر سے نہیں آیا تھا۔

"بھائی جان! آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔ آپ شاید ہمارے گھر کے ماحول کو دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ۔۔۔ عارف تو بہت اچھے ہیں' مگر آپ تو جانتے ہیں ان کا غصہ۔۔۔" وہ بے چاری شرمندہ سی تھی۔

"کوئی بات نہیں' سب گھروں میں ایسے ہی چلتا ہے' تم فکر مت کرو' میں اسے خوب جانتا ہوں۔"

"بس بھائی جان! یہ واصف بھی تو۔۔۔"

"تم واصف کو سمجھاؤ' پیار سے سمجھاؤ گی تو سمجھ جائے گا۔"

"عارف سمجھانے بھی تو دیں' وہ کچھ کہتا ہے۔ یہ میرے کچھ بولنے سے پہلے محاذ سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں اور بات بڑھ جاتی ہے۔"

"تم ایسا کیا کرو کہ بچوں کو پہلے ہی کھانا وانا کھلا دیا کرو۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "آپ نہیں سمجھیں گے بھائی جان!" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں اس کے ہنسنے پر حیران تھا۔

"عارف چاہتے ہیں کہ رات کا کھانا سب ایک ساتھ کھائیں۔ وہ کہتے ہیں' دن بھر میں یہی تو ایک وقت ہوتا ہے جب پورا خاندان ایک ساتھ ہوتا ہے' انہیں مزا ہی نہیں آتا بچوں کے بغیر کچھ کھانے پینے میں' کبھی اگر انہیں کچھ دیر ہو جاتی ہے اور بچے کھانا کھا لیتے ہیں تو وہ بس رسم پوری کرتے ہیں' کھانا نہیں کھاتے۔"

وہ عارف کا ذکر بہت محبت اور احترام سے کر رہی تھی اور اس کے الفاظ اور انداز میں عارف کی اپنے گھر سے محبت کی قدر نمایاں تھی۔

"ہاں یہ تو ہے' عارف بہت محنتی ہے' وہ اپنے خاندان سے بہت اٹیچڈ ہے۔"

"بس یہی بات میں بچوں کو سمجھاتی ہوں' ان ہی لوگوں کے لیے تو وہ اتنی محنت کرتے ہیں' باقی دونوں تو سمجھ جاتے ہیں' مگر واصف۔۔۔"

"اچھا تم فکر مند نہ ہو۔ میں سمجھاؤں گا واصف کو' سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

☼ ☼ ☼

وہ چھٹی کا دن تھا' اسی لیے میں بہت آرام سے اپنی نیند پوری کر کے اٹھا' اطمینان سے ناشتے اور اخبار سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ واصف' شہریار کو آوازیں دیتا اندر داخل ہوا' مجھے دیکھا تو سلام کیا۔ شہریار اندر کمرے میں تھا' میں نے اسے اپنے پاس بلایا تو وہ بڑے قرینے سے آ کر میرے قریب بیٹھ گیا' میں نے عارف کا پوچھا تو اس نے بتایا۔

"دفتر گئے ہیں۔" وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"ایں' آج بھی دفتر۔" اچھی خاصی گرمی پڑ رہی ہے۔ اور موٹر سائیکل پر روزانہ دفتر آنا جانا تھکا دیتا ہے پھر ایک دن بھی ہفتے میں آرام نہیں۔

وہ جیسے ادھر ادھر دیکھتا رہا' میری بات پر دھیان دیے بغیر' ہلکی سی مسکراہٹ اب بھی چہرے پر کھلی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے' برخوردار! اتنے خوش خوش کیوں ہو؟"

"آج جم کر کھیلیں گے مزا آئے گا۔ یہ شہریار کیا کر رہا ہے اندر۔" وہ پھر شہریار کو پکارنے لگا۔ "آؤ نا جلدی آؤ۔"

"ایک بات بتاؤ۔ تم اپنے بابا سے کتنی محبت کرتے ہو؟" مجھے عبیر کی بات یاد آئی تو میں نے ایک دم ہی پوچھ لیا۔

"ایں!" وہ چونکا۔ "سچ بتاؤں!"

"ہاں ہاں۔ سچ بتاؤ' ہم تم تو دوست ہیں نا!" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

اس نے ہنستے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "بالکل نہیں۔ مجھے وہ بالکل اچھے نہیں لگتے۔"

"ارے!" مجھے اس کے جواب نے حیران کر دیا' مجھے اس جواب کی توقع بہر حال نہیں تھی۔

"ہاں تو اور کیا' ہمارے بابا کوئی آپ جیسے تھوڑی ہیں۔" وہ جیسے کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

"ہاں بھئی۔ جانتا ہوں' وہ مجھ سے اچھے ہیں۔" میں نے تو اس سے اگلوانے کے لیے کہا تھا۔ "مگر یہ میری دلی رائے بھی تھی' اپنے بیوی بچوں کی خاطر وہ مجھ سے زیادہ تکلیف اٹھاتا تھا' یہ حقیقت تھی۔

"جی نہیں۔ برے ہیں بہت برے' ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ' ہر ہر بات پر اعتراض' اس سے مت ملو' اس کے پاس کیوں کھڑے تھے' گھر میں رہا کرو' باہر مت جاؤ' محلے کے بچوں کے ساتھ مت اٹھا بیٹھا کرو' یہ کھاؤ' وہ مت کھاؤ' ٹی وی مت دیکھو۔" وہ تو جیسے حلق تک بھرا بیٹھا تھا۔

"بس بس بھائی! تم نے تو اپنے باپ کے خلاف پورا شکایت دفتر تیار کیا ہوا ہے۔" میں نے اسے فی الفور روکا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماموں! یقین کریں آج اگر وہ دفتر نہ گئے ہوتے تو میں کھیلنے نکل سکتا بھلا۔" وہ الجھا ہوا لگ رہا تھا۔

"اور تو اور آپ سب لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔ ہر کلاس میں' میں ہمیشہ پوزیشن لیتا رہا ہوں' بتا میں لیتا رہا ہوں ناں! مگر وہ مجھ سے کبھی خوش نہیں ہوتے۔" اس کے لہجے میں گلہ تھا۔

"ایسا نہیں ہے یار! وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔" میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

"اچھا!" وہ طنز سے بولا۔ "آپ اپنے بچوں سے محبت نہیں کرتے' شہریار تو روز کھیلنے نکلتا ہے باہر' ٹی وی بھی دیکھتا ہے اور' اور۔۔۔"

"اور کیا بولو؟" مجھے تشویش تھی' مگر اپنے ہونے والے بھانجے کے سامنے اپنی فکر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"وہ مجھ سے کلاس میں بھی۔۔۔" وہ ہچکچا رہا تھا۔

"ہاں ہاں۔ میں جانتا ہوں' وہ تم سے آگے کبھی نہیں رہتا۔" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"پھر بھی ماموں! آپ اسے کسی بات کے لیے منع نہیں کرتے۔" اب اس کے لہجے میں حسرت تھی' میں سوچ میں پڑ گیا۔

اتنے میں شہریار اپنے کمرے سے باہر نکلا۔ "اب جلدی جلدی کر رہے ہو' کل تو تم نے منع کر دیا تھا کھیلنے کے لیے۔"

"ہاں تو مجھے کہاں خبر تھی کہ آج ہمارے والد صاحب صبح صبح دفتر سدھاریں گے' ہوتے تو فرماتے۔ گرمی بہت ہے' گلی محلے کے ان آوارہ بچوں کے ساتھ مت کھیلو۔" اس نے آواز موٹی کر کے عارف کی نقل اتاری۔

اس کے اس انداز پر شہریار ہنسنے لگا۔ میرے لبوں پر بھی بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

پر جب وہ لوگ جانے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ "واقعی گرمی بہت ہے' خوب اچھی طرح پانی پی کر جاؤ' اور ہاں ذرا جلدی آ جانا۔"

"کیوں ابو؟" شہریار بولا۔

"کالے ہو جاؤ گے یار!" میرے کہنے پر دونوں ہنسنے لگے۔

پر جب شہریار سامنے میز سے بوتل اٹھا کر گلاس بھر بھا' واصف میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور عجیب حسرت سے بولا۔

"ماموں! کاش میں آپ کا بیٹا ہوتا۔"

"میرے بیٹے ہی تو ہو تم۔" میں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔

وہ چلے گئے تو میں سوچنے لگا' اور سوچتا ہی رہا' بار بار سامنے واصف کا چہرہ آ جاتا۔

"ماموں! کاش میں آپ کا بیٹا ہوتا۔" عارف جیسے محبت کرنے والے شخص کے بیٹے کا یہ حسرت بھرا لہجہ کیوں آخر کیوں؟

مجھے وہ دن یاد آنے لگا' جب واصف دنیا میں آیا تھا' میں اور نیلو یہ اطلاع ملنے پر کہ عبیر اسپتال میں ہے' اسپتال پہنچے تو اسی وقت نرس نے آ کر خوش خبری دی' پھر کمبل میں لپٹے گلابی گلابی سے ننھے منے بچے کو دیکھ کر عارف خوشی سے ناچنے لگا پھر بولا۔

"امی! دیکھیں ذرا' اس کی ناک' اس کی آنکھیں' یہ سب میری طرح ہیں۔" وہ اس کے ایک ایک نقش کو چوم رہا تھا' ہاتھ' پاؤں ایسے چھو رہا تھا جیسے اس کے لمس سے راحت کشید کر رہا ہو۔

"اچھا' بس۔ اب اسے مجھے دو۔" اس کی امی نے اسے ٹوکا تھا۔

مگر وہ اسے اپنے کلیجے سے لگائے ہوئے تھا۔ ہم سب ہنس رہے تھے۔

ایسے میں وہ ننھا منا سا وجود کلبلانے لگا اور پھر رونے لگا۔

عارف بوکھلا سا گیا۔ "اس کو کیا ہوا' یہ رو کیوں رہا ہے؟"

"ارے بچے روتے ہی ہیں' دیکھو تو ذرا' کوئی یوں بھی دیوانہ بنتا ہے۔" پھوپھی کو غصہ آنے لگا تھا۔

پھر وقت آگے بڑھا تو عبیر اکثر ہنس کر شکایت کرتی تھی کہ اتنے سے کمرے میں انہوں نے اتنے کھلونے لا کر رکھ دیے ہیں کہ چلنا پھرنا مشکل ہو رہا ہے' ان دنوں یہ [illegible] سب مل جل کر ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔

میرے ذہن میں اور ایک منظر ابھرا' ایک دن جب میں ان کے گھر گیا تو عبیرہ کچن میں تھی اور واصف اس وقت تقریباً" دو ڈھائی سال کا تھا' وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا' عارف' واصف کے پاس ہی بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا' محویت کا عالم یہ تھا کہ اسے میرے آنے تک کا احساس نہ ہو سکا' وہ سوتے ہوئے بیٹے کے ہاتھوں کی انگلیوں پر ہاتھ پھیر کر جیسے اس کے لمس کو اپنے اندر اتار رہا تھا' میں قریب گیا تو وہ بولا۔

"زبیر! یہ بچے کیا ہوتے ہیں' جان اٹکی رہتی ہے یار! ان میں' آج عبیرہ نے فون پر بتایا کہ واصف گر گیا' حالانکہ اس نے بار بار کہا کہ کوئی چوٹ نہیں آئی ہے' مگر پھر میرا دل دفتر میں نہیں لگا۔" پدرانہ شفقت نے اس کے چہرے پر ایک روشنی سی بکھیری ہوئی تھی' اس وقت مجھے عارف بہت اچھا لگا۔

وہ دن تو میں بھول ہی نہیں سکتا' جب عبیرہ نے فون کیا کہ واصف کا بخار بہت تیز ہو رہا ہے۔

"ارے حد کرتے ہو تم دونوں میاں بیوی' بچے بیمار ہوتے رہتے ہیں۔" نیلو نے اسے سمجھایا۔

"نہیں بھابھی! اس کا بخار' مجھے ڈر لگ رہا ہے' عارف کو فون اس لیے نہیں کر رہی کہ وہ تو بالکل ہاتھ پاؤں چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ بھائی جان آ گئے ہوں تو اسے کسی اسپتال لے چلیں' میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

ہم پہنچے تو عارف اسے گود میں لیے گھر سے نکل رہا تھا۔ "میرا دل گھبرا رہا تھا' اس لیے جلدی آ گیا۔" وہ ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے بولا اور پھر دو دن تک اسے ایک پل کے لیے بھی قرار نہ تھا' نہ کچھ کھانے پر تیار نہ پینے پر' گھر جانے کا کیا سوال' وہ تو بیٹھ بھی نہیں رہا تھا' مسلسل ٹہل رہا تھا۔

"زبیر! میرے بیٹے کو کسی کی نظر لگ گئی ہے' کیا ہو گا؟" وہ مسلسل روہانسا سا ہو کر کہہ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا' دعا کرو' ٹھیک ہو جائے گا۔" سب ہی سمجھا رہے تھے۔

آصف کو نمونیہ ہو گیا تھا' وہ دو دن آئی سی یو میں رہا۔

مجھے تو اس دوران عارف کی طرف سے خطرہ سا ہو گیا تھا کہ خدانخواستہ اگر کوئی ایسی ویسی خبر آئی تو اس کا کیا ہو گا۔

اسے سمجھا بجھا کر بٹھاتا تو کہتا۔

"یہ بچے کیا ہوتے ہیں' ان توتوں میں ہماری جان ہوتی ہے۔" کبھی کہتا۔ "یہ کیسی محبت ہے' جی چاہتا ہے اپنی جان وار دوں' کلیجہ نکال کر دے دوں۔"

میں اس کا ہاتھ تھپتھپانے لگا' وہ بولا۔ "زبیر! ہم لوگ جب بچے تھے تو ہر چیز چھین جھپٹ کر لے لیتے تھے' ماں' باپ سے اپنے حصے کے لیے ضدیں کرتے تھے' پھر بھائی' بہنوں سے محبت کے باوجود کبھی اپنا حق' اپنی پسند' اپنے حصے کی چیز نہیں چھوڑتے تھے' مگر یار! یہ اولاد کیا ہوتی ہے' ہم جو چیز ہمیشہ خود کھانا' پینا' پہننا' رکھنا چاہتا ہوں' خود بخود بغیر مانگے اولاد کی طرف بڑھا دیتے ہیں' یہ خوش جہان خوش۔"

عارف کے ان الفاظ کے یاد آتے ہی لگا میرے ذہن نے کوئی الجھی ہوئی ڈور سلجھالی ہو' ابھی واصف مشکل سے بارہ' تیرہ سال کا ہے۔ ابھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے' عارف کے سینے میں دھڑکتے ہوئے دل میں خون کی جگہ بچوں کی خاص طور پر واصف کی محبت رواں ہے اور بیٹا' باپ سے نالاں ہے' اس سے پہلے کہ شکایت گلے میں اور گلہ بدگمانی میں ڈھل جائے' اس خلیج کے بڑھنے سے پہلے پاٹ دینا ہو گا۔

☼ ☼ ☼
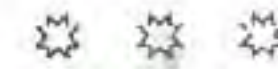
دو چار دن بعد جب میں ان کی طرف گیا تو عارف کھانا کھا چکا تھا۔ "چلو کہیں باہر ٹہلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں چلو۔ گرمی بھی زیادہ ہے۔" اس نے رضامندی ظاہر کی۔

ہم دونوں یونہی ٹہلتے' باتیں کرتے کافی دور نکل آئے' بات چیت میں موضوع بچوں کے مستقبل کا نکل آیا۔

"میں آج کل کچھ ڈیپریس سا رہنے لگا ہوں۔"

عارف نے خود ہی بات شروع کی۔

"خیریت۔" میں نے پوچھا۔

"واصف کی طرف سے پریشان ہوں' ایک ہی بیٹا ہے' میں جانے اس کے لیے کیا کیا کرنا چاہتا ہوں' مگر وہ تو۔" وہ دفعتاً" چپ ہو گیا۔

"کیا وہ تو' تمہارا بیٹا ذہین ہے' اپنی کلاس میں ہمیشہ اچھی پوزیشن لیتا ہے۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے وہ ذہین بھی ہے اور ضدی بھی۔" اس نے مسئلہ بیان کیا۔

"یہ تو خیر اس کی جینز کا مسئلہ ہے۔" میں نے رشتے سے فائدہ اٹھایا۔

"مذاق نہیں کرو یار! یہ بہت سنجیدہ مسئلہ ہے' وہ دن بدن عجیب سا ہوتا جا رہا ہے اور مجھ سے تو اس کا رویہ۔ کبھی غور کیا تم نے؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

اس کے چہرے پر چھائی افسردگی نے میری گردن کو نفی میں ہلنے پر مجبور کر دیا۔

"نہیں غور کیا نا تم نے۔ یہ میرے گھر کا مسئلہ ہے' مگر تم کون سے غیر ہو۔"

"یار! میری سمجھ میں آج کل کی اولاد نہیں آتی' تم یاد کرو' جب ہم لوگوں کے والد گرامی گھر میں آتے تھے تو ہم لوگ سب شرارت ورارت بھول کر گھر کے کونے کھدروں میں چھپ جاتے تھے' رعب ہوتا تھا ان کا' یہاں بچوں کو کوئی احساس ہی نہیں' وہ باپ کو اس کے مقام پر نہیں رکھتے' اور تو اور ڈانٹ ڈپٹ کرو تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں' جواب دیتے ہیں' سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں' حد ہو گئی' باپ کا باپ بننے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ سانس لینے رکا۔

میں چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا اور چاہتا تھا وہ سب کچھ کہہ لے' اس کے دل کی بھڑاس بھی نکلے گی اور شاید مسئلے کا سرا سمجھ میں آنے کے بعد اس کا حل بھی مل جائے گا۔

"بولو' ہم لوگ کبھی سوچ سکتے تھے کہ کوئی جواب دیں گے انہیں' وہ غلط کہیں یا صحیح' مگر ہم لوگ بس سر جھکائے سنتے رہتے اور بس جی' جی ابا' جی کے علاوہ کچھ منہ سے نکلتا تھا اور اب یار! کبھی کبھی تو بس جی چاہتا ہے سب کچھ چھوڑ چھاڑ دوں' جائیں جہنم میں۔" وہ جھنجلا رہا تھا۔

"چھوڑو یار! اس طرح نہیں سوچتے' تم واصف کے بارے میں شروع ہی سے جذباتی ہو' اس لیے اتنی دور تک چلے جاتے ہو' وہ اچھا بچہ ہے' ذہین ہے اور ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھو کہ زمانہ بدل گیا ہے۔"

"کیا زمانہ بدل گیا ہے' ہم کیا بابا آدم کے زمانے کے ہیں۔" وہ بھی جھنجلا رہا تھا۔

"ارے اچھا یاد دلایا' کل کسی صاحب نے ایک عجیب سی بات کہی' وہ کہنے لگے کہ ہم لوگ آدم کی اولاد ہیں' اس لیے فطرت بابا آدم کی ہی پائی ہے۔" مجھے بات یاد کر کے ہنسی آنے لگی۔

"کیا مطلب؟" عارف نے سوال کیا۔

"بابا آدم کے والد تو تھے نہیں' اسی لیے ان کے دل میں والد سے محبت کا خانہ بالکل خالی تھا' البتہ اولاد تھی اور دل پدری محبت سے سرشار تھا' اب غور کرو' پوری دیانت داری سے دل کو ٹٹولو' باپ کا ادب و احترام اپنی جگہ' مگر دعویٰ محبت کے باوجود ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے والد کے لیے خود کو مٹانے پر تیار ہیں' اپنی ہستی کو فراموش کر کے اپنے آگے کا نوالہ باپ کی پلیٹ میں خوش ہو کر ڈال رہے ہیں۔"

وہ حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"لوگ تو دین ایمان تک بھلائے ہوئے ہیں اولاد کے لیے' جائز' ناجائز کی تمیز روا نہیں رکھتے' حق دار کا حق نہیں دے پاتے اور تو اور خود کو بھی اپنے کمائے ہوئے پیسوں کا حق دار نہیں سمجھتے' چلا جائے یا نا چلا جائے' کمایا جائے یا مر مر کر پیسہ لایا جائے' پیسے ہونے سے [illegible] سے [illegible] کیا جائے' اپنے آگے رکھی [illegible] وہ چیز [illegible] کو [illegible] کی پیٹ میں ڈال دیتے ہیں' بولو زمانہ [illegible] کہ نہیں؟" میں نے اسی سے تصدیق چاہی۔

"ہے یار! مگر کیا یہ بری بات ہے باپ اپنی اولاد کے لیے بھی ایثار نہ کرے تو پھر وہ انسان تو نہ ہوا نا یہی تو فرق ہے انسان اور جانور میں اور پھر اگر باپ اپنی اولاد کے لیے ایثار کرتا ہے تو کیا اولاد کو اس کا احساس نہیں کرنا چاہیے 'یہ کیا بات ہوئی۔" وہ ایک مرتبہ پر الجھنے لگا۔

"ارے بھئی' سمجھایا تو ہے ابھی کہ ہمیشہ دو اور دو چار نہیں ہوتے۔ انسانی کیمسٹری الگ ہی ہے۔"

"ہاں یار! کہتے تو تم کچھ ٹھیک ہی ہو مگر اولاد کی محبت بھی تو خالق ہی دل میں ڈالتا ہے مگر ہم لوگ دنیا میں آکر سارے سبق ہی اپنے خلق کیے جانے کا بھلائے بیٹھے ہیں۔" گھر قریب آچکا تھا' اس لیے ہم بحث کو تشنہ چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ ہو لیے۔

☼ ☼ ☼
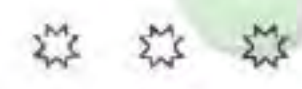
اس دن کے بعد سے مسلسل میں سوچتا رہا' کبھی لگتا عارف ٹھیک کہتا ہے! اتنی محبت' اتنے ایثار کی قدر' ہو تو کسے اچھا لگے گا اور کبھی وہ بھولا بھالا سا چہرہ' آنکھوں میں نمی لیے حسرت بھرے انداز میں کہہ رہا ہوتا تھا۔

"ماموں! کاش میں آپ کا بیٹا ہوتا۔" کچھ تو تھا' جب ہی تو وہ شاکی تھا۔

ایک دن میں اور شہریار یونہی بیٹھے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے ہم باپ' بیٹا اکثر کسی نہ کسی موضوع پر بات چیت کیا کرتے تھے' کبھی کرکٹ' کبھی کوئی اچھی ڈاکیومنٹری' کبھی ملکی حالات' کبھی یوں ہی ماضی کے قصے تو میں نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھا اور اس کا جواب سن کر دنگ رہ گیا۔

"ابو! سب مذاق اڑاتے ہیں واصف کا۔"

"کیوں بھئی؟ اتنا اچھا تو وہ ہے۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ تو اچھا ہے' مگر عارف انکل۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ "ان میں کیا خرابی ہے؟" میں چونکا۔

"وہ بہت عجیب سے ہیں۔" اس کے لہجے میں واضح ہچکچاہٹ تھی۔

"ہیں!" اس کے ریمارکس مجھے پریشان کر گئے۔

"ابو! بھی واصف اگر کسی لڑکے کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے تو وہیں اس لڑکے کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگتے ہیں' اگر گیٹ پر کوئی لڑکا آجائے تو بھگا دیتے ہیں اور اپنی کڑک دار آواز میں واصف سے بات کرتے ہیں کہ بس' بعد میں سب دوست اس کا مذاق بناتے ہیں۔"

"واصف فوراً گھر چلو' یہاں کیا کر رہے ہو' منع کیا تھا نا میں نے۔" اس نے عارف کے لہجے کی نقل اتاری۔

"بری بات ہے بیٹا! یوں بڑوں کی کوئی نقل اتارتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے ٹوکا۔

"ابو! بے چارہ واصف جب کھیلنے آتا ہے تو سب کہتے ہیں' جاؤ بابا سے پوچھ کر آؤ' اپنے' کبھی کوئی یونہی ٹوک دیتا ہے' بابا سے پوچھ کر کہہ رہے ہو' ابو! اب ہم لوگ بچے نہیں ہیں۔"

میں نے اپنے تیرہ سال کے بیٹے کو چونک کر دیکھا' اگرچہ اس نے کافی قد نکال لیا تھا' مگر تھا تو ابھی بچہ ہی' مگر اسے اپنے بڑے ہونے کا احساس تھا۔

مجھے کسی کی کہی ہوئی بات یاد آگئی کہ ہم اپنے بچپن کو جلدی سے الوداع کہنے میں لگ جاتے ہیں اور پھر ساری عمر بچپن کو یاد کرتے رہتے ہیں۔

"عارف بہت اچھا انسان ہے' بہت ذمہ دار باپ ہے' تم لوگ ابھی والدین کی ذمہ داریوں کو نہیں سمجھتے ہو بیٹا! ماں' باپ سے زیادہ بچوں کی بہتری کوئی چاہ نہیں سکتا' یہ بات تم بھی سمجھ لو اور اپنے دوست کو بھی سمجھایا کرو۔"

"مگر ابو! آپ تو ایسے نہیں ہیں۔" نئی نسل آسانی سے مطمئن کہاں ہوتی ہے۔

"ہاں' اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

تب ہی دروازہ کھول کر کمرے میں واصف داخل ہوا' اسے دیکھ کر شہریار تو خوش ہوا ہی' میں بھی

خوشی سے کہا۔
"آؤ آؤ شہزادے! ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔"
"اچھا وہ کیا؟" اس نے دلچسپی دکھائی۔
"میں شہریار کو بتا رہا تھا' تمہارے والد کے بارے میں' عارف پڑھائی میں ہمیشہ ہی بہت اچھا رہا تھا' یہی وجہ رہی کہ وہ تمہیں تھکاوٹ کے باوجود پڑھاتا رہا' مگر میں وہ توجہ شہریار پر نہیں دے پایا کیونکہ سچ بات یہ ہے بیٹا! کہ دفتر سے آکر بچوں کو پڑھانا بہت مشکل کام ہے۔"
"یہ تو ہے ماموں! بابا شروع ہی سے چاہے دفتر سے کبھی بھی آئیں' میرا ہوم ورک بھی کرواتے تھے اور دوسرے دن کا سبق بھی' تب ہی میں کلاس میں اچھا رہتا ہوں۔" وہ فخریہ بولا۔
"ایک اور بات پر غور کرو' میں ہمیشہ خاندان کی تقریبات ہوں یا دوستوں کی' اپنے گھر والوں کے ساتھ ضرور جاتا ہوں' مگر عارف کبھی نہیں جاتا' جانتے ہو کیوں؟"
دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔
"اس لیے کہ رات دیر تک ہونے والی تقریبات کی وجہ سے تم لوگوں کی نیندیں پوری نہیں ہو پائیں گی اور اسکول میں تم اچھی کارکردگی نہیں دکھا پاؤ گے۔ وہ خود جاتا ہے نہ تم لوگوں کو جانے دیتا ہے' بے چاری عبیرہ کو ہی سب نبھانا پڑتا ہے' وہ یہ تمہارے لیے ایثار کرتا ہے' ورنہ بیٹا! سب آپس میں ملتے ہیں تو مزا تو آتا ہے نا!"
دونوں بچے سوچنے لگے' مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے ان کی سوچوں کو مثبت سمت دے دی۔
پھر میں جب موقع ملتا عارف کو سمجھاتا' سختی سے کام بننے کے بجائے بگڑ رہا ہے' آج کا دور جہاں ذہانت کو فروغ دینے کا ہے' میڈیا کا بہت مضبوط کردار ہے' اچھا بھی اور برا بھی' وہیں کمپیوٹر نے پوری دنیا کو ایک چھوٹے سے دائرے میں کھینچ لیا ہے' اب رعب اور دبدبے کے بجائے ایک عزم اور دوستانہ ماحول ہی شخصیت کو بنانے میں مددگار ہے' اس لیے اسے اب خود کو بدلنا چاہیے۔
اور کبھی موقع ملتا تو واصف کو احساس دلاتا کہ اسے اپنے باپ کی محبت کی قدر کرنی چاہیے' دنیا میں بہت سے ایسے والدین ہیں خاص طور پر باپ' جو بچوں کو نہ توجہ دیتے ہیں نہ محبت اور عارف تو اپنی محبت میں بالکل الگ ہی نظر آتا ہے۔
عارف کی طبیعت کچھ خراب تھی' میں گیا تو وہ لیٹا ہوا تھا' خلاف معمول' مجھے عبیرہ نے بتایا کہ دو' تین دن سے طبیعت ٹھیک نہیں تھی' ڈاکٹر نے ٹیسٹ کروائے تو پتا چلا کہ شوگر بڑھی ہوئی ہے۔
وہ افسردہ سا اپنے بیڈ پر لیٹا تھا۔
"تھو یار! یہ بیماری دل پر لینے والی نہیں' یہ کیا بیماروں کی سی صورت بنائے پڑے ہو۔"
"زبیر! میں سوچ رہا ہوں' میں نے ابو سے لی ہے یہ بیماری۔ ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا کہ یہ عموماً نسل در نسل چلتی ہے' اس معاملے میں تم ہی نہیں ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ باپ پر پوت..." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر ہنسا' عجیب افسردہ سی ہنسی۔
"ارے بھئی' یہاں تو ہر دوسرا آدمی ایسی ہی کسی بیماری میں مبتلا ہے' ویسے پھوپھا جان کو بھی سنا ہے بہت جلدی یہ شکایت ہوگئی تھی' مگر دیکھ لو' ماشاء اللہ حیات ہیں' اپنے قویٰ کو مضبوط رکھے ہوئے ہیں' تم بھی مت گھبراؤ۔"
پھوپھا جان پھوپھی جان کے بعد تنہا رہ گئے تھے' وہ اپنے اسی پرانے گھر میں رہتے تھے' چھوٹے بیٹے آصف کے ساتھ' عارف ان کی کفالت سے غافل نہیں تھا' اس کی تصدیق مجھ سے آصف نے کی تھی کہ بھائی جان' بہت خیال رکھتے ہیں' دوا' علاج ہی نہیں ان کے کھانے' پینے کے اخراجات بھی پابندی سے ادا کرتا تھا' مگر جب ان کا ذکر چلا تو مجھے خیال آیا کہ صرف مالی اعانت کیا والدین کا حق ادا کر سکتی ہے' ہم خود کو اچھا فرماں بردار ثابت کرنے کے لیے بلکہ والدین کے مصارف برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں' [illegible] وہ دینے کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس'

بیوی' بچے اور دفتر اس دائرے سے باہر نکلیں تو پھر ادھر توجہ دے پائیں۔
عارف اور میں دیر تک اس دن اپنے بچپن کو یاد کرتے رہے۔ مجھے بھی ندامت سی تھی کہ میں کافی دن سے اس طرف سے نا جاسکا تھا اور عارف بھی شرمسار تھا کہ اتنے دن یونہی گزر گئے اسے وہاں گئے ہوئے۔
ہم دونوں نے دوسرے ہی دن جانے کا پروگرام بنالیا' مگر دوسرے دن صبح ہی صبح خبر آگئی کہ پھوپھا جان کا انتقال ہوگیا۔
میں دوڑا ہوا عارف کی طرف گیا' وہ بری طرح رو رہا تھا' میں جانتا تھا کہ وہ حساس ہے اور جو یہ بھی کبھی چوک سی ہو جاتی ہے یہ عمر بھر کا ملال بن جاتی ہے۔ تدفین وغیرہ سے فراغت کے بعد میں نے غور کیا' عارف بہت کمزور بہت نڈھال سا لگ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کچھ دنوں بعد جب میں اس کے گھر گیا تو پتا چلا کہ تین دن سے دفتر نہیں گیا ہے' طبیعت خراب ہے' عارف جیسے بندے کا دفتر نہ جانا غیر معمولی امر تھا۔
"کیوں' کیا بہت زیادہ طبیعت خراب ہے؟" میں نے عبیرہ سے پوچھا۔
"معلوم نہیں بھائی جان! بس وہ خاموش ہو گئے ہیں بالکل' چپ چاپ لیٹے رہتے ہیں' میں تو پریشان ہوں ہی انہیں دیکھ دیکھ کر بچے بھی بہت پریشان ہیں' خاص طور پر واصف..."
میں عارف کے پاس گیا تو مجھے لگا' جیسے وہ دنوں میں نچڑ سا گیا ہو' کمزور اور مایوس سا۔
"کیا ہو گیا ہے عارف! کوئی مسئلہ ہے کیا؟ مجھے تو بتاؤ یار!" میں نے اس کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔
"نہیں' کوئی بات نہیں۔"
"پھر بھی۔" میں نے اصرار کیا تو رنجیدہ لہجے میں بولا۔
"زبیر! میں سوچ رہا ہوں' ہم لوگ اپنے تئیں خود کو کتنا سمجھ دار سمجھتے ہیں' مگر یار! بہت بدنصیب ہیں ہم لوگ جب اپنی چھاؤں کو کھو دیتے ہیں اور دھوپ میں جلنے کے لیے تنہا رہ جاتے ہیں' تب ہمیں خیال آتا ہے' خسارے کا۔ انسان خسارے میں ہے' تمہیں معلوم ہے میں ہر جگہ ممتاز اور نمایاں رہا' تعلیمی میدان میں بھی' بعد میں سروس میں بھی' مگر جسے میں اپنی صلاحیت سمجھتا تھا' وہ کچھ بھی نہیں تھی' دراصل میں دعاؤں کے حصار میں رہتا تھا' ہمیشہ اب جو یہ حصار ٹوٹا ہے تو میں بھی ٹوٹ سا گیا ہوں۔ زبیر! میں دھوپ میں جل رہا ہوں' میری چھاؤں رخصت ہو گئی' میں نے انہیں کیا' ابو میرا انتظار کرتے تھے' میں دو ہفتے سے جا بھی نہیں پایا تھا' جی چاہتا ہے کہیں سے سامنے آجائیں اور پھر مجھے خوب ڈانٹیں' جیسے بچپن میں ڈانٹتے تھے۔"
اس کی کیفیت دیکھ کر مجھ سے بھی کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔
"بعض اوقات انسان اور کچھ نہیں چاہتا' بس ایک ہاتھ چاہتا ہے' جسے پکڑ سکے' ایک دل چاہتا ہے' جو سمجھ سکے یار! ہم لوگ یہی تو شکوہ کرتے ہیں نا' اپنے بچوں سے کہ وہ ہمیں سمجھ نہیں پاتے' مگر ہم بھی تو سمجھنے میں بہت دیر کر دیتے ہیں' سمجھتے سمجھتے عمر لگا دیتے ہیں' کھو کر سیکھتے ہیں' بڑے خسارے میں ہیں ہم لوگ' یار! بڑے خسارے میں۔" وہ رونے لگا۔
میں دیر تک اسے تسلیاں دے کر بڑے بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر کے لیے اٹھا۔ کمرے سے باہر آیا تو واصف دروازے کے ساتھ ہی کھڑا ملا۔ وہ میرے ساتھ دروازے تک آیا۔ جب میں باہر نکل رہا تھا تو اس نے کہا۔
"ماموں! کیا بابا مجھے معاف کریں گے؟ وہ مجھ سے خفا ہیں نا! آپ میری مدد کریں۔ میری ان سے سفارش کردیں ماموں! میں بہت دیر نہیں کرنا چاہتا۔ میں خسارے سے بچنا چاہتا ہوں۔"
اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں سچائی تھی۔
مجھے بے ساختہ اس پر پیار آگیا۔ واقعی نئی نسل سمجھ دار ہے اور ذہین بھی۔ ہے نا!

☆

فیضیہ عامر

اب کی بار تو اتنے زور سے بجلی کڑکی کہ ببلی نے بستر سے چھلانگ لگائی اور تخت پر بیٹھی اماں کے اوپر تقریباً" کود ہی پڑی۔

"ارے کیا مصیبت ہے۔ بچوں کی طرح سے ڈرتی ہے' نگوڑ ماری! انگوٹھا توڑ دیا میرا۔" اماں پیر کا انگوٹھا پکڑ کر بیٹھ گئیں اور بلو حسب معمول کھی کھی کرنے لگا۔

"تو اور کیا کروں' بجلی کی کڑک تو دیکھو' پھر یہ اندھیرا کمرا اور یہ اکلی، ٹمٹماتی موم بتی' توبہ! ایسی بھی کیا

ناولٹ

غربت۔۔۔ ایک ایمرجنسی لائٹ ہی خرید لیتیں اماں اور تو۔۔۔ تو کیا کھی کھی کر رہا ہے نکما کہیں کا۔" اس نے ہنستے ہوئے بلو کو گھورا۔ بلو نے دانت نکالتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"جب تمہارے جیسے کارٹون گھر میں ہوں تو ہنسی تو آئے گی نا۔"

"اماں! اسے سمجھالیں۔" وہ چیخی۔

"ارے! چپ رہو بھئی۔ مجھے تو بڑی بی کی فکر ہو رہی ہے۔ جانے کہاں رہ گیا ان کا نواسا۔۔۔ بلو! جا ذرا دیکھ کر تو آ کوئی موم بتی یا لائٹ ہے وہاں۔" اماں کو بڑی بی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

"اللہ توبہ اماں! میں تو کبھی نہ جاؤں' ایک تو ویسے ہی اوپر والا کمرا آسیبی مشہور ہے پورے محلے میں اور پھر اندھیرا' اکیلی بڑی بی۔ چھل پیری تو نہیں ہیں وہ۔" بلو نے خوف سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"چپ کر جا۔ کیوں اول فول بک رہا ہے۔ جا دیکھ کر آ' بے چاری کس حال میں ہے۔" اماں نے اسے گھر کا۔

"نہیں بھئی! میں نہیں جاتا۔ اسی کو بھیجیں نا' خوامخواہ میں ڈرنے کی ایکٹنگ کر رہی ہے' اپنی موٹی ساس سے تو کبھی ڈری نہیں' بجلی سے ڈر رہی ہے۔" بلو نے توپ کا دہانہ پھر ببلی کی طرف موڑ دیا۔

"اماں! اسے سمجھالو' پٹ جائے گا۔ تو بڑا طرم خان ہے' لڑکا ہو کر ڈرتا ہے ڈرپوک کہیں کا۔" ببلی نے اسے غیرت دلانا چاہی۔

"ہاں! تو ٹھیک ہے نا! انسانوں کی بات الگ ہوتی

ہے۔ بھوت پریت سے تو سب ہی ڈرتے ہیں۔ ہوائی مخلوق ہوتی ہے‘ ہمیں تو دکھائی نہیں دیتی‘ پر خود ہمیں دیکھ رہی ہوتی ہے۔“ بلو نے الٹا اسے خوف زدہ کردیا۔

”اللہ کے واسطے مت ڈرا بلو! جان نکل جائے گی میری۔ تیرے سر ہوگا میرا خون‘ پھر میرے میاں کو تو ہی جواب دینا۔“ وہ واقعی سہمی ہوئی تھی۔

”کب جواب دوں گا؟ آتے کب ہیں وہ؟“ بلو نے اسے جتایا۔

”آئیں گے... ایک دن تو آئیں گے ہی۔“ وہ جز بز ہوگئی۔

”تین مہینے سے پڑی روٹیاں توڑ رہی ہو... پتا نہیں کب آئیں گے تمہارے میاں اپنی بلا کو لینے۔“

”تیری زبان بہت چل رہی ہے‘ تیری روٹیاں توڑ رہی ہے؟ گدھا! سدھرتا ہی نہیں ہے۔ جا بے بی تو جا‘ بڑی بی کی خبر لے جاکر۔ بے چاری پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔“ اماں سے بے بی کی شرمندگی دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے بلو کو ڈانٹ کر بے بی کو پچکارا۔

”توبہ ہے اماں! میں اتنی دیر سے کیا کہہ رہی ہوں...

ڈر لگ رہا ہے مجھے۔ بچپن سے ڈرتی ہوں میں بجلی کی کڑک سے۔ اوپر سے وہ کمرا... نہ بھئی۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”اے لو! تجھے بھی وہاں آسیب کا شک ہے۔“ اماں نے اس کی بات کو ذرا بھی اہمیت نہ دی۔

”شک کی کیا بات ہے‘ سارا محلہ جانتا ہے۔ جب کمرا خالی ہوتا ہے تو خود تم دن کے وقت بھی وہاں نہیں جاتیں۔ ہمیشہ سے یہی دیکھ رہے ہیں ہم... اور ہمیں اس وقت بھیج رہی ہو۔“ وہ ابھی تک اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

”اُفوہ! محلے والوں کی جھوٹی سچی باتوں پر یقین کرلیا اور میں جو کہہ رہی ہوں وہاں کچھ نہیں ہے تو...“ اماں نے اس کا خوف کم کرنا چاہا۔

”تو پھر مغرب کے وقت ہمیں جانے کیوں نہیں دیتی تھیں چھت پر؟“ بلو کو بچپن کی روک ٹوک یاد آگئی۔

”لو! مغرب کے وقت تو ویسے بھی کھلی جگہ جانے سے منع کرتے ہیں۔ اس میں انوکھی کیا بات ہوئی؟“ اماں کسی طرح بھی ماننے کو تیار نہ تھیں۔

”کچھ بھی ہو‘ اکیلے خالی کمرے سے بھی کھٹ پٹ کی آوازیں بہت سنی ہیں ہم نے۔ میں تو نہیں جانے کا۔“ بلو نے صاف ہری جھنڈی دکھادی۔

”بھاڑ میں جاؤ بزدلو! میں ہی جاتی ہوں۔“ اماں نے چپل پہنی۔

”اماں! میری چپل تو چھوڑیں۔ پانی کتنا بھرا ہے باہر‘ ٹوٹ جائے گی۔ ڈھائی سو کی ہے۔ اپنی پہنیں یہ ربڑ والی۔“ بے بی نے فوراً چپل اماں کے پیروں سے جھپٹ لی۔

”اے تو میری کہاں ہے‘ نظر نہیں آرہی۔“ اماں نے موم بتی کی مدھم روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے دیکھا۔

”یہ لیں! یہ رہی۔“ بے بی نے چپل ان کے پیروں کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں! سب کو اپنی اپنی پڑی ہے‘ ماں کی فکر نہیں‘ چپل کی فکر ہے۔ بڑے ہیرے موتی جڑے ہیں تیری چپل میں۔“ اماں نے اسے لتاڑ دیا۔

”ہاں تو‘ ٹوٹ گئی تو کون دلائے گا نئی؟ عید کی چپل ہے میری۔ معلوم تو ہے‘ مجھے بڑی زہر لگتی ہیں‘ موچی سے سلی ہوئی چپلیں۔“ وہ ذرا جو شرمندہ ہوئی ہو۔

”ہاں! معلوم ہے شہزادی! اب میں جاؤں؟“ اماں نے بے زاری سے کہا۔

”اماں! دیکھ کے... سیڑھیوں کے پاس پھسلن ہو رہی ہے‘ خود نہ گر پڑنا۔“ بلو نے لیٹے لیٹے ہدایات دیں۔

”خود نہ ہلنا۔ بڑا آیا فکر کرنے والا۔“ بے بی نے بلو کو گھورا۔

اماں سنبھل سنبھل کر دروازے کی چوکھٹ پر پہنچیں‘ کیونکہ پانی زیادہ ہونے کی وجہ سے صحن کا پانی تھوڑا تھوڑا کمرے میں بھی آرہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ گلی

اونچی تھی اور گھر نیچے بنے ہوئے تھے۔ برسات میں ڈھلان سے پانی پھسلتا گھروں میں آجاتا تھا۔ بڑی مشکل ہوتی تھی۔ بڑی بڑی اینٹوں پر لکڑی کے تختے رکھ کر باتھ روم اور کچن تک پل سا بنالیا جاتا تھا۔ اماں یعنی صغرا برسات میں مٹی کے تیل کا چولہا کمرے ہی میں رکھ لیا کرتی تھیں اور چند دیگر ضروری کھانے پکانے کا سامان بھی۔ یہ مسئلہ اگرچہ اس علاقے کے تمام گھروں میں تھا۔ لیکن سب کہتے تھے کہ صغرا کے گھر کی زمین ٹھیک نہیں ہے۔ تب ہی ہر مشکل‘ ہر مسئلہ سب سے پہلے اس کے گھر کا رخ کرتا تھا۔ وہ لانڈھی میں رہتے تھے۔ میاں نے وہ گھر بیچ کر یہاں یہ چھوٹا سا دو کمروں کا گھر خریدا تھا۔ مگر بے چارے کو رہنا نصیب نہ ہوا۔ صرف دو ماہ بعد ایک حادثے میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔ صغرا کو پنشن ملنے لگی‘ مگر آدھی پنشن میں دو بچوں کے ساتھ خاک گزارا ہوتا‘ سو زندگی کی گاڑی گھسیٹنے کی خاطر خاصی تگ و دو کرنی پڑتی۔

☼ ☼ ☼

صغرا کام چور اور سست تھیں۔ بیاہ کر سسرال میں آئیں تو ایک ہفتے بھی ساس کے ساتھ خوش نہ رہ سکیں۔ ہر وقت لڑائی جھگڑا‘ ذرا‘ ذرا سی بات پر تکرار معمول بن گئی۔ قصور زیادہ صغرا کا ہی ہوتا۔ وہ اپنے کسی کام میں مداخلت پسند نہیں کرتی تھیں۔

ماں‘ باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ مگر بے حد کسمپرسی میں پلی تھیں۔ سسرال میں میکے سے قدرے بہتر حالات تھے۔ شوہر سرکاری محکمے میں ہیڈ کلرک تھے۔ اسی لیے ہاتھ پاؤں پھیلا رہی تھیں۔ سسرال میں تھا ہی کون... ایک بوڑھی ساس اور ایک کنواری نند۔ وہ بھی ان کے لیے وبال جان تھی۔ حالانکہ اس کی منگنی ہوچکی تھی اور سال بھر میں اس کی شادی ہوجانی تھی۔ اس کا رویہ صغرا کے ساتھ اچھا تھا۔ مگر صغرا عادت سے مجبور تھیں۔ ساس نے بیٹی کا سارا جہیز اپنی حیثیت کے مطابق جوڑ رکھا تھا۔ کچھ روپیہ بھی جمع کر رکھا تھا۔ صغرا تو خالی ہاتھ آئی تھیں۔ پانچ جوڑے اور چاندی کی بالیاں

جن پر سونے کا پانی پھرا تھا۔ برتن بھانڈے کچھ بھی نہیں۔ شکل و صورت اچھی ہونے کی وجہ سے بر مل گیا تھا۔ ورنہ اب تک گھر میں بیٹھی ہوتیں۔ ان کی عادت سے ان کا پورا خاندان واقف تھا' کون اپنے بیٹے' بھائی سے بیاہتا۔ یہ رشتہ تو رشتہ کرانے والی نے لگایا تھا۔

نند کی شادی ہوتے ہی صغرا مزید پھیل گئیں۔ بےبی کی پیدائش کے بعد انہوں نے ساس کی زندگی دوبھر کردی۔ وہ بیمار رہنے لگیں۔ مگر یہ ان کی کوئی خدمت نہ کرتیں۔ دو سال کی بےبی کو خوامخواہ گود میں لیے پھرتیں کہ کام نہ کرنا پڑے۔ صرف اپنے کام کرتیں اور کھانا پکاتیں۔ ڈاکٹر نے ساس کو پرہیزی کھانے کی ہدایت کی تھی۔ مگر مجال ہے' جو صغرا نے ایک وقت بھی ساس کو کچھ بنا کر کھلایا ہو۔ بیٹی آتی تو ماں کے کپڑے دھوتی' بالوں میں تیل ڈالتی' نہلاتی' کنگھا چوٹی کرتی۔ میاں وسیم چوں چوں کا مربہ تھے۔ بیوی کے آگے کچھ نہ بول پاتے۔ ماں کی فکر تو تھی' مگر بیوی کی فطرت کے آگے مجبور تھے۔

پھر ایک روز بیٹی' داماد آئے اور ساس کو لے گئے' ہمیشہ کے لیے۔ دونوں نے ان کی بہت خدمت کی۔ داماد اچھا تھا۔ اس کے ماں' باپ لاہور میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ صغرا کی ساس کا بڑھاپا بیٹی' داماد کے پاس اچھا کٹا۔ وہ تین سال زندہ رہیں۔ اپنا سرجانی ٹاؤن والا پلاٹ نواسے کے نام کر گئیں۔ وسیم اور صغرا کو لانڈھی کا یہ ساٹھ گز پر بنا گھر ہی ملا جسے بیچ کر وہ لیاقت آباد کے اس اسّی گز کے گھر میں شفٹ ہو گئے۔ انہیں بیچنے کا کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ دونوں گھروں کی قیمتوں میں انیس بیس کا فرق ہی تھا۔ مگر یہاں سے وسیم کا دفتر نزدیک تھا جو لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ کی اوپری منزل پر تھا۔ روزانہ کا کرایہ بھی بچنے لگا تھا۔ ملکہ جسے پیار سے وسیم اور صغرا بےبی کہتے تھے' کی پیدائش کے بعد ایک لڑکا بلال عرف بلو بھی دنیا میں آگیا۔

گھر کی گاڑی صغرا کی عاقبت نااندیشی کے باوجود ٹھیک ہی چل رہی تھی کہ وسیم روڈ پار کرتے ہوئے گاڑی کی زد میں آگئے۔ وہ دنیا سے کیا گئے صغرا کی تو دنیا ہی اندھیرا ہو گئی۔ دو بچوں کا ساتھ اور وہ اکیلی۔ وسیم کے ہوتے انہیں کسی شے کی فکر نہ ہوتی تھی۔ مگر اب آٹے' دال کا بھاؤ معلوم ہو رہا تھا۔

گھر کی چھت پر ایک کمرا اور بیت الخلا بنا ہوا تھا۔ صغرا نے اسے کرائے پر دینا شروع کر دیا۔ کوئی کرائے دار سال بھر سے زیادہ وہاں نہ ٹکتا۔ کوئی کوئی تو چھ ماہ بھی نہ گزار پاتا۔ کوئی خاص وجہ نہ بتاتا' بس بہانہ کر کے چھوڑ جاتا۔

آس پاس کے گھر والے کہتے کہ رات کو وہاں سے کھٹ پٹ کی آوازیں آتی ہیں۔ کبھی یوں لگتا ہے جیسے کوئی روٹی پکا رہا ہو' چمٹے کی آوازیں آتی ہیں اور گرم روٹی کی خوشبو صاف محسوس ہوتی ہے۔ صغرا سب کو جھٹلاتی رہتیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر وہ خود بھی رات کے وقت اوپر جاتے ہوئے ڈرتی تھیں اور بچوں کو تو دن کے وقت بھی اوپر نہ جانے دیتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

ایک ہفتہ پہلے ایک تیس بتیس سالہ نوجوان باسط ایک ضعیف خاتون جو کہ بول نہیں سکتی تھیں' کے ساتھ میرپور خاص سے ٹرانسفر ہو کر کراچی آیا اور اسٹیٹ ایجنسی کے ذریعے صغرا کا گھر کرایہ پر لیا۔ بڑی بی کو اس نے اپنی نانی بتایا۔ صغرا غربت کی وجہ سے کرایہ داروں کی زیادہ چھان بین نہیں کرتی تھیں۔ گھر کرایہ پر اٹھ جائے' یہی ان کے لیے غنیمت تھا۔ دونوں کا سامان بہت مختصر سا تھا۔ دو چارپائیاں' ایک چھوٹا سا ٹین کا ٹرنک' دو بالٹیاں' چند برتن اور چارپائیوں پر بچھانے کے لیے دو افراد کے بستر۔ باسط خود ہی کھانا پکاتا' صفائی کرتا۔ بڑی بی ضعیفی کے باعث بھلا کہاں گھر کے کام کر سکتی تھیں۔ اس عمر میں ہوٹل کا کھانا بھی ان کے لیے مناسب نہ تھا اور نہ ہی باسط کی اتنی حیثیت تھی کہ روز' روز ہوٹل سے کھانا لا سکے۔

گھر میں شفٹ ہوئے پانچواں روز تھا کہ باسط نے صغرا کو بتایا کہ وہ چند گھنٹوں کے لیے حیدر آباد جا رہا ہے' شام تک لوٹ آئے گا۔ پھر وہ صبح سات بجے بڑی بی کو ناشتا کرا کے حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گیا۔

صغرا نے نہایت رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرما گرم روٹی اور ارہر کی دال بڑی بی کو دوپہر کے کھانے میں دی اور پھر شام کی چائے بھی پلائی۔ غنیمت تھا کہ بڑی بی ضروریات زندگی سے خود ہی فراغت پا لیا کرتی تھیں۔

شام کو محکمہ موسمیات کی پیش گوئی کے عین مطابق مہینے کے اواخر کے بادل گھر آئے اور مغرب کے وقت سے جو بارش شروع ہوئی تو رات کے دس بج گئے مگر بارش تھی کہ رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

صغرا نے چوکھٹ پر کھڑے کھڑے باہر کا جائزہ لیا۔

"اف! کس قدر اندھیرا ہو رہا ہے۔" بارش کی تیزی نے باہر کا سارا منظر دھندلا دیا تھا۔ ٹھیک سے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یا اللہ! رحم کر' کیسے آگے جاؤں؟" صغرا بڑبڑائیں۔

ہمت کر کے انہوں نے پاؤں پانی میں ڈال ہی دیا۔ ایک ایک قدم سنبھال سنبھال کر رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھیں۔ بمشکل زینے تک پہنچی تھیں کہ زور کی بجلی چمکی۔ لمحے بھر کو ہر طرف روشنی کوندی۔ صغرا کی نظریں اوپر کی سمت ہی جمی تھیں' انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی سایہ سا کھڑا ہے۔ ان کا دل اچھل کر حلق میں اٹکا محسوس ہوا اور وہ الٹے پیروں واپس کمرے کی طرف لوٹ آئیں۔

"الٰہی خیر! جل تو جلال تو۔۔۔"

"کیا ہوا اماں؟ کیا بھوت دیکھ لیا؟" بلو دوڑ کر آیا۔

"ایں؟ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ بھوت ووت تو نہیں دیکھا۔" انہوں نے بات سنبھالی۔

"پھر اتنی جلدی واپس کیوں چلی آئیں اور یہ جل تو جلال تو کا ورد؟" وہ بھی ایک سیانا تھا۔

"بجلی کیسی کڑک رہی ہے' بھئی! مجھے تو ہول اٹھ رہا ہے۔ رات کٹ جائے جلدی سے۔ یہ باسط پتا نہیں کہاں رہ گیا۔ مصیبت ہمارے سر ڈال گیا۔ بڑھیا زندہ بھی ہے یا نہیں۔ پتا نہیں اپنے ساتھ نانی کو کیوں لیے پھرتا ہے۔ کوئی اور رشتہ دار نہیں ہے کیا؟" صغرا کو باسط پر شدید غصہ آرہا تھا۔

"چھوڑیں اماں! اندر آجائیں۔ بارش کا زور ذرا ٹوٹ لے تو میں اور بلو جا کر دیکھ آئیں گے بڑی بی کو۔" بےبی نے ماں کو تسلی دی۔

صغرا چپل اتار کر چارپائی پر چڑھ بیٹھیں۔

"بےبی! میں تو کہتا ہوں' چائے بنا لو' مزا آجائے گا۔"

"ہاں بےبی! چائے پلا دے' مجھے بھی سردی سی لگ رہی ہے۔" اماں نے بھی خواہش کا اظہار کیا۔

"میرا بھی دل چاہ رہا ہے چائے پینے کو۔" بےبی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کمرے میں دیوار کے ساتھ لگی درمیانے سائز کی لکڑی کی میز پر مٹی کے تیل کا چولہا رکھا تھا۔ بےبی نے پتیلی میں پلاسٹک کے کین میں سے پانی انڈیلا اور چولہے کی بتیاں اوپر کر کے چولہا جلا دیا۔

"پائے نکال لو اماں! باسی ہو رہے ہیں۔ کل ایک نکال کر کھایا تھا۔ سچی سیلے سیلے لگ رہے تھے۔" بلو نے للچا کر کہا۔

"ہاں' ہاں! نکال لوں۔۔۔ ناشتے میں تجھے کیا کھلاؤں گی؟ کلیجے اور پائے؟" اماں نے گھور کر کہا۔

"ارے! صبح تازے منگا لینا یا موئی سے کہنا' پراٹھے پکا لے۔ ابھی تو پائے کھانے دیں۔ بھوک لگ رہی ہے۔"

"نکال لیں اماں! ایسی بھی کیا کنجوسی۔۔۔ بھوک لگ رہی ہے بےچارے کو۔" بےبی نے خلاف توقع بلو کی حمایت کی۔ ایسا اتفاق سال' چھ مہینے میں ایک بار ہوتا تھا۔

"تیرے میاں نے گھر میں راشن ڈلوایا ہے نا۔ گھی کے کنستر بھرے پڑے ہیں۔ جا بھائی کو پکا دے' تر تر پراٹھے۔" صغرا بڑبڑاتی ہوئی اٹھیں اور دیوار میں نصب لکڑی کی دو پٹ کی الماری کا تالا کھولنے لگیں۔

"کاش! کبھی میرے میاں کو راشن کا نہ سہی' میرا ہی

خیال آجاتا۔ اب تو تم بھی طعنے دینے لگیں۔" بے بی اداس ہو کر بولی۔ صغراں کو فوراً" غلطی کا احساس ہوا۔

"ارے تو! اس میں طعنے والی کون سی بات ہے۔ تجھ میں کیا کمی ہے۔ رنگ ذرا سانولا ہے تو کیا ہوا۔ دکھتی تو اچھی ہے۔ پہن اوڑھ کر تو اور بھی پیاری لگتی ہے۔" صغرا پاپے کی تھیلی نکالتے ہوئے بولیں۔

"لو کھاؤ دونوں۔"

بلو نے پاپا چائے میں ڈبو کر منہ کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ بجلی زور سے کڑکی۔

"یا اللہ خیر۔ ! بس کر اللہ معافی دے دے گناہوں کی۔ ارے ! بڑی بی کی خبر کیسے لوں' زندہ ہیں کہ مر گئیں۔" صغرا کو پھر بڑی بی یاد آگئیں۔

"کہا تو ہے ہم بھی چائے پی کر جائیں گے ہم دونوں۔ بے فکر رہیں ناں! چائے پئیں' ٹھنڈی ہو رہی ہے' یہ پاپے بھی لیں۔" بلو نے ان کی فکر دور کرنے کی کوشش کی۔

"بلو اس وقت تو تجھ میں بالکل میرے دیور زبیر کی شباہت آرہی ہے۔ پورے گھر میں وہی ہمدرد ہے میرا۔ ایسے ہی تسلیاں دیتا رہتا تھا۔" بے بی سسرال کی سوچوں میں گم بولی۔

"توبہ کرو! وہ خبطی؟ شکل سے ہی کھسکا ہوا لگتا ہے۔" بلو نے سخت برا مانا۔

"کوئی نہیں! اچھا بھلا ہے۔ شکل میں تو اپنے بڑے بھائی سے بھی اچھا ہے۔" بے بی نے دیور کی طرف داری کی۔

"او ہو! آپ کو یہ خوش فہمی ہے کہ آپ کے شوہر نامدار شکل کے اچھے ہیں۔۔۔ ہاہاہا۔" بلو نے مذاق اڑایا۔

"کیا مطلب؟ تیرا دماغ خراب ہے کیا' اچھے بھلے تو ہیں۔" بے بی چیخی۔

"اچھے بھلے؟ بقول اماں کے بس انسان کا بچہ ہیں۔" بلو ابھی تک ہنسے جا رہا تھا۔

"اماں! سنبھالیں اسے۔ پٹ جائے گا۔" بے بی نے احتجاج کیا۔

"جاؤ! چائے پی لی۔ اب جا کر بڑی بی کی خبر لو۔" صغرا نے قصہ ختم کیا۔

"چلو بے بی!" بلو کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"تم ہی چلے جاؤ ناں۔" بے بی بچنا چاہ رہی تھی۔

"او میڈم! چلو شرافت سے' ورنہ میں نہیں جاتا۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے ایسی جگہوں سے۔ وہ بھی اندھیری رات اور یہ بارش۔" بلو دوبارہ بیٹھ گیا۔

"چل بھائی ڈرپوک! چلتی ہوں۔" بے بی نے صغرا کی ربڑ کی چپل پاؤں میں ڈالی۔

دونوں سنبھل سنبھل کر صحن تک پہنچے۔ بے بی نے سر پر تولیہ تانا ہوا تھا اور بلو پلاسٹک کی تھیلی سے سر بچا رہا تھا۔ بارش کی شدت میں قدرے کمی ہوئی تھی۔ مگر بجلی اب بھی چمک رہی تھی۔ سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر دونوں نے رک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر بلو نے سنبھل کر سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ بے بی نے اس کے پیچھے قدم بڑھایا۔

اوپر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ بجلی کی چمک میں صحن کا منظر صاف دے رہا تھا۔ خوب پانی کھڑا تھا۔ پرنالے میں شاید کچرا پھنسا ہوا تھا۔ پانی بہت تھوڑا' تھوڑا نکل رہا تھا۔ سامنے کمرا تھا اور کمرے میں بڑی بی۔ بلو نے ڈرتے ڈرتے دو قدم اور آگے بڑھائے۔

"چل ناں! رک کیوں گیا؟" بے بی کو بارش کے شور کی وجہ سے زور سے بولنا پڑا۔ چاروں طرف سے پرنالوں کا پانی گر رہا تھا۔

بلو آگے بڑھا اور کمرے کے دروازے تک جا پہنچا۔ بے بی بالکل اس کے پیچھے تھی۔ بلو نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانکا۔ مکمل اندھیرا تھا۔ پھر بجلی کوندی اور لمحہ بھر کو ہر چیز صاف دکھائی دے گئی۔

اور پھر بلو تھیلی چھوڑ کر الٹے پیروں واپس بھاگا۔ بے بی بھی گھبرا کر اس کے پیچھے بھاگی۔

دونوں گرتے پڑتے دو' دو سیڑھیاں پھلانگتے نیچے پہنچے۔ سانسیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ صغرا دونوں کی ہونق شکلیں دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"کک۔ کیا ہوا؟ بڑی بی ٹھیک ہیں۔"

"اسی سے پوچھو۔" بے بی نے بلو کی طرف اشارہ کیا۔

بلو دونوں گھٹنوں کو پکڑ کر جھکا سانس لے رہا تھا۔ صغرا اور بھی گھبرا گئیں۔

"ارے! کچھ تو بولو' بڑھیا مر گئی کیا؟ دم نکلا جا رہا ہے میرا تو۔"

"اماں! سچ کہہ رہا ہوں' وہ بڑھیا انسان نہیں' کوئی اور مخلوق ہے۔" بلو کی آواز خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔

"یا اللہ خیر! کیا دیکھ لیا تو نے؟" صغرا دل پکڑ کر بولیں۔

"وہ بڑھیا گھپ اندھیرے میں بیچ کمرے میں بستر پر بیٹھی کتاب کھولے کچھ پڑھ رہی تھی۔"

"کیا۔۔۔ اندھیرے میں پڑھ رہی تھی؟" صغراں کی آنکھوں میں بھی خوف تھا۔

"ہاں! اور سفید دوپٹا اوڑھا بھی ہوا تھا۔ اف! بہت خوف ناک منظر تھا۔" بلو نے خوف سے جھرجھری لی۔

"کیا پتا' اپنا ڈر دور کرنے کے لیے قرآنی آیات پڑھ رہی ہو؟" صغرا نے ان سے زیادہ شاید خود کو تسلی دی۔

"تو پتا نہیں کیا دیکھ کر آیا ہے۔ بے بی تو آگے نہیں گئی؟"

"توبہ کرو اماں! اس کی تو حالت غیر تھی۔ مجھ سے پہلے تو یہ بھاگ نکلی تھی۔" اس عالم میں بھی بلو اس کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آیا تھا۔

"یا اللہ! یہ رات جلدی سے کٹ جائے۔ یہ بارش تھم جائے۔" صغرا نے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔

"لائٹ آجائے' یہ دعا بھی تو کریں۔" بے بی نے کہا۔

"موٹی' ڈرپوک۔" بلو نے تخت پر لیٹتے ہوئے بے بی کو پھر چھیڑا۔

"سمجھا لیں اماں! اپنے اس کالے کلوٹے ہیرو کو۔ مار کھائے گا مجھ سے۔"

"چپ رہو! آیتہ الکرسی پڑھو اور سو جاؤ۔" صغرا نے دونوں کو ڈانٹا۔

تینوں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ بلو کے خراٹے تھوڑی ہی دیر میں کمرے کی خاموشی کو توڑنے لگے۔ صغرا اور بے بی بھی نیند کے جھکولے لینے لگیں۔

☼ ☼ ☼

آدھی رات کو صغرا کی آنکھ کھلی تو بارش تھم چکی تھی اور پرنالوں کا شور بھی ختم ہو چکا تھا۔ بہت گہری خاموشی تھی۔ مگر پھر صغرا کے کانوں میں اچانک کسی کی سرگوشیوں کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ پھر۔۔۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے خود سے سوال کیا۔

دبی دبی سسکیاں۔

صغرا نے پلٹ کر دیکھا بے بی بستر پر نہیں تھی۔ موم بتی چھوٹی اور اس کی لو لمبی ہو گئی تھی۔

صغرا اٹھ بیٹھیں اور اس سمت بڑھیں' جہاں سے بے بی کی آواز آرہی تھی۔ صغرا کا دل گھبرا رہا تھا۔ انہیں لگا' یہ بھیانک رات جیسے ڈھلنے کے لیے تھی ہی نہیں۔ جب باہر دیکھو' اندھیرا۔۔۔ صغرا نے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر جھانکا۔

بے بی موبائل فون پر بات کرتے ہوئے رو رہی تھی' وہ خوشامد بھرے انداز میں بول رہی تھی۔

"میں کسی کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی' تمہیں تو بالکل نہیں۔۔۔ کب تک یہاں رہوں' تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے لینے آجاؤ۔ تین مہینے ہو گئے۔۔۔ کیا؟ ساری عمر لینے نہیں آؤ گے؟ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔"

دوسری طرف سے فون بند ہو چکا تھا اور اب بے بی کی سسکیاں خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ صغرا نے تاسف سے بے بی کو دیکھا۔

"بے بی! یہ فون کہاں سے آیا؟"

بے بی نے چونک کر ماں کو کھوئی کھوئی آنکھوں سے دیکھا۔ صغرا کو اس کی آنکھوں میں دکھ اور ملال صاف نظر آیا۔

"اٹھ کیوں گئیں؟ سو جائیں۔" بے بی نے ماں کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"آنکھ کھل گئی تھی تیری آواز سے۔ پر یہ فون؟"

"کل دوپہر کو حمیرا کے ساتھ صرافہ گئی تھی۔ انگوٹھی بیچ کر یہ فون خرید لیا۔ اور پیسے بھی ہیں۔ کیا کرتی اماں! طارق سے بات تو کرنی تھی۔"

دونوں اندر چلی آئیں۔ بے بی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ صغرا نے اپنی چارپائی کا رخ کیا۔ بلو تخت پر لیٹا خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

"اماں! میں اگر سانولی ہوں' تیکھے نین نقش بھی نہیں ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟ اور وہ کون سا گلفام ہے' وہ بھی تو سانولا ہے' معمولی شکل کا عام سا انسان ہے۔ مجھ سے کہتا ہے' ساری عمر ماں کے گھر بیٹھی رہو۔ میں لینے نہیں آنے کا۔ میری ماں نے شادی کروی' ورنہ میں تو تم جیسی سے کبھی شادی نہ کرتا۔ ماں نے تعریف کی تھی۔ بر دکھوے پر تو تم نے خوب کریمیں لگا کر رنگ گورا کر لیا تھا۔ مگر بعد میں ساری پول کھل گئی۔" بے بی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"صبر کر! اللہ سب دیکھ رہا ہے۔" صغرا نے اسے دلاسا دیا۔

"پتا نہیں اماں! ہم سے کون سے گناہ ہوئے کہ ہماری سزا ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ یہ بلو ہے' نہ پڑھائی' نہ لکھائی' نہ نوکری۔۔۔ اور میں شادی شدہ ہو کر بھی میکے میں پڑی ہوں۔" بے بی پھر رونے لگی۔

"رو کیوں رہی ہے۔ فکر نہ کر' دیکھا جائے گا۔ اگر تجھے چھوڑنا چاہتا ہے تو چھوڑ دے۔ خدا کی یہی مرضی۔" صغرا کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اللہ نہ کرے' کیسی باتیں کرتی ہو اماں! بڑی مشکلوں سے تو میری شادی ہوئی ہے۔ کوئی پسند تو کرتا نہیں تھا مجھے۔ تم بات کرو نا طارق سے۔" بے بی دہل گئی۔

"کتنی بار تو کر چکی ہوں۔ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ہے۔ میرا دل نہیں ملتا آپ کی بیٹی سے۔ کیا پاگل پن ہے۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر سب کو ہیروئنیں چاہئیں۔" صغرا نے تاسف سے کہا۔

"اماں! ہمارے دن کیوں نہیں پھرتے؟ وہی زندگی' وہی غربت' دکھ اور ہر بار کوئی نہ کوئی مسئلہ۔" بے بی بھی کافی افسردہ تھی۔

"چائے بناؤں تیرے لیے؟" اماں کا لہجہ محبت سے لبریز تھا۔

"رہنے دیں! اب صبح ہونے والی ہے۔ تب ہی بنا لیں گے۔" بے بی نے بے زاری سے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"بنا لیں اماں! ایک کپ میرے لیے۔" بلو بند آنکھوں سے جیسے سب دیکھ رہا تھا۔

"اے لو۔۔۔ اٹھ گیا مفت خورہ۔ مطلب کی بات پر کان میں انٹینا لگ جاتا ہے۔" صغرا نے حسب توفیق بلو کی خبر لی۔

"سو جائیں اماں! میری وجہ سے اٹھ گئیں خوامخواہ۔"

دونوں پھر آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگیں۔ باہر خاموش فضا میں ایک بار پھر بارش کی بوندیں ہلچل مچانے لگیں اور ٹپ ٹپ کی آواز سے سناٹا اور گہرا معلوم ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

صغرا کی آنکھ کھلی تو باہر خوب روشنی پھیل چکی تھی۔ چمکیلی دھوپ نئی تازگی کا احساس دلا رہی تھی۔ چبوترہ سوکھ چکا تھا۔ مگر صحن میں کھڑا پانی پیش آنے والی مشکل کا احساس دلا رہا تھا۔ بے بی اور بلو بے خبر سو رہے تھے۔

وہ باہر نکل آئیں۔ بمشکل اینٹوں پر رکھے تختے پر قدم جما جما کر رکھتے ہوئے وہ صحن میں لگے نلکے تک پہنچ ہی گئیں۔ نلکا چبوترے پر لگا تھا۔ وہ اس پر چڑھ کر منہ دھونے لگیں۔ فارغ ہو کر انہوں نے دوبارہ عارضی پل کے ذریعے صحن عبور کیا اور باورچی خانے میں چلی آئیں۔

"آج بے بی کے لیے پراٹھے پکاؤں گی۔" وہ دل ہی دل میں بولیں اور ڈبے سے آٹا نکالنے لگیں۔ یکبارگی بڑی بی کے خیال نے انہیں ہولا دیا۔

"یا اللہ! سب خیریت ہو' ورنہ ہمارے پاس تو کفن دفن کے پیسے بھی نہیں ہیں۔" انہوں نے دعا کی۔

پراٹھا اور چائے ٹرے میں رکھ کر وہ مرے مرے قدموں سے اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ ہر قدم پر دعاؤں کا ورد کررہی تھیں۔ اوپر چھت پر سنہری دھوپ اور ٹھنڈی ہوا نے ان کا استقبال کیا۔

اندر کمرے میں جھانکتے ہی جیسے ان کے سینے پر رکھی منوں وزنی سل کو کسی نے ہٹادیا۔ بڑی بی منہ ہاتھ دھوکر بستر پر بیٹھی بال بنارہی تھیں۔ پلاسٹک کا ہرا کنگھا اور سرسوں کے تیل کی شیشی چھوٹی سی میز پر رکھی تھی۔ صغرا کو دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ صغرا نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور ناشتا بستر پر رکھ دیا۔ خود بھی پاس ہی بیٹھ گئیں۔

رات کیسی گزری خالہ! معاف کرنا! پانی بہت برس رہا تھا۔ تمہیں دیکھنے کوئی اور نہ آسکا۔"

بڑی بی نے جواب میں مسکرا کر اوپر کی سمت اشارہ کیا جیسے "اللہ کا کرم ہے" کہہ رہی ہوں۔

"ایک بات بتاؤ خالہ! رات اندھیرے میں کتاب کھولے کیا پڑھ رہی تھیں؟ بچے آئے تھے' پر ڈر گئے۔" صغرا سے برداشت نہ ہوا تو پوچھ ہی لیا۔

بڑی بی کی مسکراہٹ اس بار گہری تھی۔ اس بار انہوں نے منہ کھول کر بولنے کی کوشش کی اور بمشکل ان کے منہ سے نکلا۔

"ق۔۔۔ قرآ۔۔۔ن"

"اندھیرے میں؟" صغرا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

جواب میں بڑی بی نے سینے پر ہاتھ رکھا اور پھر سر پر جیسے دماغ یا عقل کا اشارہ دیتے ہیں۔

"کیا حافظہ ہیں؟" صغرا نے کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

بڑی بی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تو پھر قرآن کھول کر کیوں بیٹھی تھیں؟" بڑی بی نے طاق پر رکھے قرآن کو محبت سے دیکھا' پھر ہاتھوں کو دیکھا اور انہیں چوم لیا۔

"اچھا' بھئی! تم جانو' تمہارا نواسا کہاں رہ گیا؟"

بڑی بی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور ناشتا کرنے لگیں۔ صغرا نے اٹھ کر باہر چھت کے کناروں پر جمع پانی جھاڑو سے سوتنا شروع کیا۔ سوکھے پتے' کاغذ اور تنکے سمیٹ کر ایک تھیلی میں بھرے۔ پانی کی ٹنکی کے ڈھکن کا معائنہ کیا اور واپس کمرے میں چلی آئیں۔

بڑی بی ناشتے سے فارغ ہوکر تولیے سے منہ صاف کررہی تھیں۔ صغرا برتن اٹھانے کے لیے جھکیں تو انہوں نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر دعا کے لیے ہاتھ بلند کردیے۔ صغرا نے تشکر سے بڑی بی کو دیکھا۔

سیڑھیاں اترتے وقت صغرا خود کو بہت ہشاش محسوس کررہی تھیں۔ خدا جانے کیا بات تھی لیکن وہ واقعی خوش تھیں' اس انبساط میں وہ بڑی بی کے لاپروا نواسے کو گالیاں دینا بھی بھول گئیں۔

نیچے آکر انہوں نے بالٹی میں میلے کپڑے بھگوئے اور بڑی بی کا میلا سوٹ بھی ساتھ ہی ڈال دیا۔ کمرے میں بے بی اور بلو ناشتا کررہے تھے۔ بے بی کی آنکھیں رات کی گریہ زاری کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔

"اماں! آج کیا پکائیں گی؟" بلو چائے کا کپ رکھتے ہوئے بولا۔

"ابھی ناشتا ہضم ہوا نہیں اور کھانے کی فکر پڑگئی' پیٹو کہیں کا۔ پورے چھبیس کا ہوگیا ہے' نہ کام' نہ پڑھائی۔۔۔ ناکارہ' نکما۔" بے بی بے نقط سنارہی تھی۔

"اماں! یہ بلا کب دفعان ہوگی؟ شادی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا' زردہ' بریانی اور تمبو کا خرچہ سب برباد گیا۔ یہ یہیں کی یہیں ہے۔ اماں! آج گوشت پکائیں' پرسوں آلو کی قتلیاں' کل ارہر کی دال' بس بہت کھالیا۔ لائیں پیسے دیں' گوشت لادوں۔"

"دماغ چل گیا ہے تیرا' گوشت کے دام معلوم ہیں تجھے' تین سو سے اوپر ہے۔ مہینے کا آخر ہے' پنشن بھی ختم اور کرایہ بھی۔ بجلی کے بل کے روپے رکھے ہیں۔ آج سبزی پر ہی گزارہ کرو' نوابی کھانے کے لیے کما کر لاؤ۔" صغرا کو طیش آگیا۔

"اماں! آپ بھی اسی کی زبان بول رہی ہیں۔ کب سے تو کام ڈھونڈ رہا ہوں۔ رفیق دبئی گیا ہے' بلانے کا کہہ کر گیا تھا۔ شاید بلا ہی لے اور اتنے لوگوں سے کہا ہوا ہے۔۔۔ بس! میرے ہی پیچھے پڑے رہو تم لوگ۔" بلو روٹھ کر باہر چبوترے پر جا بیٹھا۔

"ہاں! تیرے دوست تیرے جیسے جھوٹے۔ رفیق کیا ابھی گیا ہے؟ دو سال ہوگئے اسے گئے ہوئے' تیرے پاسپورٹ کو بنے ہوئے بھی ایک سال ہوگیا ایسا لگ رہا تھا جیسے جاتے ہی بلالے گا۔" صغرا کو پاسپورٹ کی فیس یاد آگئی' جو انہوں نے بڑی مشکل سے دی تھی۔

"اماں! بس بھی کرو۔ ایک ہی تو بیٹا ہے۔ میں بھی پاگل ہوں' خوامخواہ اس کے پیچھے پڑجاتی ہوں۔ یہ لو پیسے گوشت منگالو۔ آلو گوشت پکانا۔" بے بی نے دوپٹے کے پلو سے پیسے کھول کر ماں کی طرف بڑھائے۔

"نہیں! یہ پیسے سنبھال کر رکھ۔۔۔ یہ ختم ہوجائیں گے تو اور کیا بیچے گی؟"

"لے لیں اماں! دیکھا جائے گا۔" بے بی نے زبردستی ماں کے ہاتھ میں پیسے پکڑادیے۔

☼ ☼ ☼

دوپہر کو بے بی بڑی بی کے لیے کھچڑی لے کر اوپر گئی تو گھبرائی ہوئی واپس آئی۔

"اماں' اماں! چلیں اوپر چلیں' جلدی۔"

"الٰہی خیر! کیا ہوا۔ کیوں دہلا رہی ہے مجھے؟" صغرا گوشت بھون رہی تھیں۔

"بڑی بی کی تو حالت بہت خراب ہے۔ بخار میں تپ رہی ہیں۔ بستر بھی گیلا ہے۔"

صغرا نے چولہا بند کرکے ڈھکن ڈھکا اور اوپر جانے کے لیے کھڑی ہوگئیں۔

بڑی بی کو واقعی تیز بخار تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھیں۔ صغرا کی سمجھ میں فوری طور پر کچھ نہ آیا۔ وہ گم صم کھڑی رہیں۔ یکبارگی ان کی نظر کونے میں رکھے اٹیچی کیس پر پڑی۔ اس میں تالا نہیں لگا تھا۔ صغرا کے کھولنے سے فوراً" کھل گیا۔

اندر بڑی بی کا ایک جوڑا اور بستر کی چوخانے والی دو چادریں پڑی تھیں۔ صغرا کی عقل کام کرنے لگی۔ انہوں نے جوڑا اور ایک چادر نکال کر بکس بند کردیا۔ پانی کی ٹنکی پر پڑی پلاسٹک اتار کر انہوں نے دہری کرکے رکھی' پھر بڑی بی کو بمشکل کھسکا کر بٹھایا۔ چادر اتار کر انہوں نے پلاسٹک بچھائی اور اس پر صاف چادر بچھادی۔ بڑی بی کی صفائی کرکے انہیں دوسرا جوڑا پہنایا اور بستر کے صاف حصے پر بٹھا کر دوسری جانب کی چادر برابر کردی۔

گندے کپڑے لے کر وہ نیچے آئیں اور انہیں ایک طرف ڈال کر ہاتھ دھونے لگیں۔

"یہ کیا اماں! اب ہم یہ سب بھی کریں گے؟ ارے! ان کے نواسے کا کوئی فون نمبر بھی نہیں ہے کیا؟ ہمارے متھے مار کر کہاں دفعان ہوگیا؟ کبھی واپس آئے گا بھی یا نہیں؟ بلاوجہ کی مصیبت ہمارے سر ڈال گیا۔"

"چپ کرجا بے بی! ایسے نہ کہہ۔ انسان ہے وہ۔ بے چاری کو شاید رات بارش کی وجہ سے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ دروازہ اور کھڑکی بھی تو کھلا ہوا تھا۔ لا گولی دے بخار کی اور وہ جو پرانا کمبل رکھا ہے نا' وہ بھی لادے۔"

بڑی بی کو گولی کھلا کر صغرا نے کمبل اوڑھا دیا اور خود باسط کی خالی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ان کی سوچوں کا دائرہ پھیلنے لگا۔ اسی طرح کی کیفیت وسیم کی ماں یعنی ان کی ساس کی ہوا کرتی تھی۔

تب صغرا جوان تھیں' بہت گھن کھاتی تھیں۔ ان کی ساس اسی حالت میں پڑی رہتی تھیں۔ مگر وہ ان کے قریب تک نہ پھٹکتیں۔۔۔ بہت دیر ہوجاتی تو برابر سے اپنی ساس کی سہیلی رقیہ کو بلالاتیں۔ وہ بے چاری آکر سب کام کرتیں۔

مگر تب اور اب میں بہت فرق تھا۔

اب صغرا بھی اپنی واپسی کا سفر شروع کرچکی تھیں۔ بڑھاپے کے مہیب سائے انہیں نگلنے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

صغرا کو سب یاد آرہا تھا اور اب ان کے چہرے پر تاسف کا غبار پھیل رہا تھا۔ جوانی بھی کیا دیوانی ہوتی ہے۔ صرف اپنے ہی بارے میں سوچنا، اپنا فائدہ، اپنا نقصان، اپنے جذبات، عمران کی نند بھی تو جوان تھی۔ جس نے اپنی ماں کی بے انتہا خدمت کی اور ماں کے بعد اپنی ساس کو بھی سنبھالا۔ اس کے ماتھے پر صغرا نے کبھی شکن نہ دیکھی۔

"وہ بھی تو تھی، پھر میں ویسا کیوں نہ کر سکی؟" صغرا نے خود سے سوال کیا۔

بڑی بی نے کروٹ لی تو صغرا چونک گئیں۔ اٹھ کر ان کا ماتھا چھوا، بخار اتر چکا تھا۔ صغرا نے سہارا دے کر انہیں بٹھایا اور چمچے سے انہیں کھچڑی کھلانے لگی، جو تھوڑی دیر پہلے بے بی دے کر گئی تھی۔

کھانا کھا کر بڑی بی پھر لیٹ گئیں۔

"خالہ! فکر نہ کرو بخار اتر گیا ہے۔ میں تمہارے پاس یہیں سوؤں گی۔" بڑی بی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

صغرا کے اوپر سونے کے فیصلے پر بے بی اور بلو کے منہ کھلے رہ گئے۔

"اماں! طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟ اوپر رہیں گی رات کو؟" بلو حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔

"ہاں تو! اکیلا چھوڑ دوں، بڑی بی بیمار ہیں۔"

"پولیس کو اطلاع دو اماں! مجھے لگتا ہے ان کا نواسا اب نہیں آنے کا۔" بے بی نے رائے دی۔

"مجھے ایسا نہیں لگتا۔ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو غریب۔ ہمارے پاس فون کہاں ہے جو ہمیں اطلاع کرے۔ کیا پتا بیمار پڑ گیا ہو۔" صغرا رسان سے بولیں۔

"اس کا فون نمبر بھی نہیں ہے آپ کے پاس؟" بلو نے لیٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسی کوئی ضرورت آپڑے گی۔ ورنہ ضرور لے لیتی۔" صغرا کو پچھتاوا ہوا۔

"اماں! ایسا کریں، بڑی بی کو اس کمرے میں لے آئیں۔۔۔ آپ، بے بی اور وہ یہاں سو جائیں۔ میں دوسرے کمرے میں سو جاؤں گا۔ اپنا پلنگ وہاں ڈال لوں گا۔ ان کا پلنگ یہاں ڈال دیتا ہوں۔" بلو نے سنجیدگی سے کہا۔ صغرا نے اسے بغور دیکھا۔

"کیا دیکھ رہی ہیں؟"

"تو کتنا سمجھ دار ہو گیا ہے۔ تیرا باؤلا پن کدھر چلا گیا؟"

"آئے ہائے، سمجھ دار اور یہ؟ اماں! کیا ہو گیا ہے آپ کو بھی۔" بے بی کو بلو کی تعریف بالکل نہ بھائی۔

"جل ککڑی، موٹی! میری تعریف ہضم نہیں ہوتی۔" بلو نے کروٹ لی۔

"اچھا! چپ کرو۔ چل بلو! پھر اٹھ جا۔ شاباش، میرے ساتھ اوپر چل۔"

بلو اٹھ بیٹھا۔

صغرا نے بڑی بی کی اچھی دیکھ بھال کی۔ ڈاکٹر کو بھی دکھایا۔ کھانے کا بھی خیال رکھا۔ کچھ ہی دنوں میں بڑی بی بھلی چنگی ہو گئیں۔ وہ ہاتھ اٹھا کر صغرا کو بہت دعائیں دیا کرتی تھیں۔ تین دن اور گزر چکے تھے مگر باسط کی کچھ خبر نہ تھیں۔ اب بے بی بھی بڑی بی میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ ان کے بالوں میں تیل ڈال کر چوٹی کرتی اور پاس بیٹھ کر اپنے سسرال کی باتیں سناتی۔ بڑی بی مسکراتی رہتیں۔

☼ ☼ ☼

صغرا نے دھلے کپڑے جھٹک جھٹک کر رسی پر ڈالنے شروع کیے ہی تھے کہ دروازہ بجنے لگا۔

"کون ہے؟" صغرا نے دروازہ کھولا۔ بے بی بھی آگئی۔

"سلام خالہ! میں ہوں آصف۔۔۔ بلو نہیں ہے؟"

"نہیں بیٹا! وہ باہر گیا ہے۔"

"اچھا، اچھا! سمجھ گیا۔ امجد کے اسٹور پر ہو گا۔ وہیں مل لوں گا اس سے۔ خالہ! دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میں آج رات دبئی جا رہا ہوں۔" بلو کے دوست آصف نے دانت نکالتے ہوئے اطلاع دی۔

"اچھا، اچھا! مبارک ہو بھئی۔ نوکری مل گئی ہے؟"

"ہاں' ہاں خالہ! رفیق نے بلایا ہے۔ سب انتظام کردیا ہے۔"

"رفیق نے بلایا ہے؟ اچھا۔۔۔ اس سے کہنا کہ تم اپنے سب سے اچھے دوست بلو سے بھی تو وعدہ کرکے گئے تھے کہ اسے بلاؤ گے دبئی' لیکن بھول گئے شاید۔" صغرا نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں خالہ! کیا بات کررہی ہیں آپ؟ اس نے تو بلو کو چھ مہینے بعد ہی بلایا تھا۔ فون کیا تھا امجد کے اسٹور پر۔ میں بھی وہیں تھا۔ شاید بلو نے بتایا نہیں آپ کو۔ اس نے خود ہی رفیق کو منع کردیا کہ جانا نہیں چاہتا۔" آصف نے جیسے بم پھوڑا۔

"اچھا!" صغرا حیران کھڑی تھیں۔

آصف "خدا حافظ" کہہ کر چلا گیا اور بے بی کو موقع مل گیا۔

"دیکھا اماں! کتنا کام چور ہے آپ کا نکھٹو بیٹا۔ حرام کے پیسے تھے نا' پاسپورٹ میں گنوادیے۔" بے بی کافی طیش میں تھی۔

صغرا کو غصے سے زیادہ ملال ہورہا تھا۔ بلو ایسا بھی کرسکتا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے ادھار پیسے لے کر اس کا پاسپورٹ بنوایا تھا اور بی سی ڈال کر ادھار چکایا تھا۔ بی سی اب تک وہ بھر رہی تھی۔

"کیوں کیا اس نے ایسا؟ اگر اسی طرح کام سے جی چراتا رہے گا تو آگے اپنی زندگی کیسے سنوارے گا؟"

بلو ہاتھ میں خاکی تھیلی لیے داخل ہوا تو گھر میں غیر معمولی سناٹا تھا۔ اس نے جھانک کر باورچی خانے میں دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

کمرے میں آیا تو صغرا بڑی بی کے پاس بیٹھی تھیں۔ ان کی آنکھیں نم تھیں اور بڑی بی حسب معمول مسکرا کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ بے بی آنکھوں پر ہاتھ رکھے اپنی چارپائی پر لیٹی تھی۔ بلو جانتا تھا' وہ سو نہیں رہی تھی۔

"کھانا دیں اماں! بڑی بھوک لگی ہے۔" بلو نے خاکی تھیلی تخت پر رکھی۔

"آگیا نواب۔۔۔ اماں! شاہی خوان سجادیں۔" بے بی زہر خند لہجے میں بولی۔

"کیا ہوا موٹی! دماغ کیوں آؤٹ ہے؟ خواب میں اپنے میاں کو دیکھ لیا کیا؟ کیا کسی لڑکی کے ساتھ تھے؟" بلو ذرا نہیں چوکتا تھا۔

"خاموش رہو۔ کسی اور کا لحاظ تو کرلیا کرو بے شرمو!" صغرا کا اشارہ بڑی بی کی جانب تھا۔

"بلو! آصف سے ملے؟" صغرا نے بلو سے پوچھا۔

"ہاں! کیوں' یہاں آیا تھا کیا؟" بلو حیران تھا۔

"ہاں! آیا تھا۔ خیر سے دبئی جارہا ہے۔ رفیق نے بلایا ہے اسے۔" صغرا نے گویا اطلاع دی۔

"ہاں پتا ہے۔" بلو لاپروائی سے بولا۔

"تجھے بھی تو بلایا تھا اس نے؟" صغرا نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے؟" بلو گھبرایا۔

"ہاں' ہاں! کام چور' مفت خورے! سب بتا کر گیا ہے آصف ہمیں۔" بے بی چیخی۔

"ہاں' ہاں! بلایا تھا' مگر میں نے منع کردیا۔"

"ہاں! یہاں تجھے منسٹری جو مل رہی تھی۔" بے بی نے طنز کا تیر چلایا۔

"اماں! اس کو چپ کرادیں۔ بہت بول رہی ہے۔"

"تو نے منع کیوں کیا' گھر کے حالات نہیں جانتا؟" صغرا کے لہجے میں تحمل تھا۔

"میں جانا چاہتا تھا اماں! اسی لیے تو پاسپورٹ بنوایا تھا۔ مگر وہ جوش کا فیصلہ تھا' ہوش کا نہیں۔ تم دونوں کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کیسے جاؤں؟ اس وقت بے بی کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بہت سوچا اور رفیق کے بلانے سے پہلے ہی فیصلہ کرلیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ یہاں کون ہے' خیال رکھنے والا؟"

"اللہ ہے نا' سب کے ساتھ۔" صغرا نے نرم لہجے میں کہا۔

"وہ ہے' اسی نے تو مجھے یہ عقل دی' ورنہ میں تو پاگل تھا۔ حالات دیکھو آج کل کے۔ برا زمانہ ہے۔ اماں! آپ جانتی تو ہیں۔"

صغرا کو بلو پر پیار آرہا تھا۔

"اور تم فکر کیوں کرتی ہو' یہ لو جلیبی کھاؤ۔" بلو نے خاکی لفافہ صغرا کی طرف بڑھایا۔

"یہ کس لیے؟" صغرا نے لفافہ پکڑا۔

"کام مل گیا ہے مجھے۔"

"کام؟" صغرا سخت حیران تھیں۔

"ہاں! کام۔ اتنے دنوں سے اتنے لوگوں سے کہا ہوا تھا۔ زید صاحب ہیں نا' میرے دوست آفاق کے چچا۔ آپ نہیں جانتیں۔ انہوں نے اپنی بسکٹ کمپنی میں رکھوادیا ہے۔ دس ہزار تنخواہ ہے اور کمیشن بھی ہے۔ مہینے کے پندرہ' سولہ تو ہو ہی جایا کریں گے۔ بس موٹر سائیکل کی ضرورت تھی' مگر آصف نے مسئلہ حل کردیا۔ وہ دبئی جارہا ہے۔ اپنی موٹر سائیکل مجھے دے رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے پیسے دے کر چکادوں گا اس کی قیمت۔ مان نہیں رہا۔ کہہ رہا ہے' ایسے ہی رکھ لو۔ میں نے کہا' نہیں بھائی! پیسے دوں گا میں۔"

"یقین نہیں آرہا مجھے تو۔" صغرا آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

"کرلیں اماں! یقین کرلیں۔" بلو ہنسا۔

بے بی نے جلیبی بڑی بی کو دی۔

"خالہ! آپ کی دعائیں ہیں۔ آپ کے دم کی برکت ہے۔" صغرا نے محبت سے بڑی بی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

بڑی بی بمشکل کتر کتر کر جلیبی کھانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

بلو کو کام پر جاتے ہوئے بمشکل ہفتہ ہوا تھا۔ صغرا نے اب باسط کا انتظار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ انہیں اس کی فکر تھی۔ لیکن وہ بڑی بی کے ساتھ وقت گزارنے میں خوشی محسوس کررہی تھیں۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ بے بی نے گیلے بال سمیٹ کر جوڑا بنایا اور دوپٹا سنبھالتے ہوئے دروازے کی سمت بڑھی اور دروازہ کھولنے پر طارق کو سامنے کھڑا پاکر ساکت رہ گئی۔

"آپ؟" اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ طارق نے سرتاپا اسے بغور دیکھا۔

سانولی سلونی' درمیانہ قد' سیاہ گھنگھریالے بال' گلابی کپڑے۔

وہ اسے اچھی لگی' کیوں؟ اسے نہیں معلوم۔

جب اس کی پھوپھی زاد رخسانہ میک اپ سے تھوپے چہرے کے ساتھ اسے لبھاتی تھی تو وہ اسے دنیا کی سب سے حسین عورت لگا کرتی تھی۔ بے حد چست لباس اور وہ بھی بے انتہا شوخ رنگوں کے۔ بے بی اس کے سامنے اسے کچھ بھی نہ لگتی تھی۔ بے بی کے جانے کے بعد رخسانہ روز بن سنور کر اس کے گھر آجایا کرتی تھی۔ وہ بھی پوری طرح اس کی طرف ملتفت ہوچکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ بے بی کو طلاق کے کاغذات بھجوادیتا۔ یکایک وہ اوب گیا۔

وہ خود اپنی کیفیت پر حیران تھا۔ وہ جیسے تاریکی سے اجالے میں آگیا' بغیر کسی غیر معمولی واقعہ کے۔ جون کی تیز دھوپ میں گہرے سبز لباس میں ملبوس رخسانہ اپنے دہکتے ہوئے آتشی گلابی ہونٹوں کے ساتھ اسے سخت مکروہ لگی۔

اس نے شادی کی البم نکالی۔ مایوں کی تصویر میں بے بی کا سادہ سا سانولا چہرہ' بھولا سا' آنے والے دنوں کے اندیشوں سے کچھ سہما سا' کچھ کھلا کھلا سا دل میں اترتا چلا گیا۔ وہ پسینے میں شرابور ہوگیا۔ فوراً غسل خانے میں چلا گیا۔

شاور کے نیچے وہ اپنے جسم کو مل مل کر دھو رہا تھا۔ اگرچہ کوئی میل نہیں تھا۔ مگر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے میل کی تہیں اتر رہی ہوں اور پانی گہرا خاکی ہوچکا ہو۔

"اندر نہیں بلاؤ گی؟" وہ مسکرایا۔

"آئیں' آئیں۔" بے بی نے راستہ دیا۔

صغرا داماد کو دیکھ کر کھل اٹھیں۔ بہت خاطر مدارات کی۔ بلو بھی آفس سے آگیا تھا۔ گرما گرم سموسے اور مٹھائی لے کر آیا۔ ماں کو مرغی لاکردی۔ طارق کو چکن بریانی بہت پسند تھی۔ صغرا نے سینت کر رکھے باسمتی چاول کی بڑھیا سی بریانی پکائی۔ طارق منع کرتا رہ گیا۔ مگر

صغرا اور بلو کہاں ماننے والے تھے۔
رخصت ہوتے وقت بے بی بڑی بی سے لپٹ کر بہت روئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پھر سے شادی ہو کر رخصت ہو رہی ہو۔

☼ ☼ ☼

بے بی کے جانے کے بعد صغرا کا اطمینان اس کے چہرے سے جھلکتا تھا۔ اگرچہ گھر ویران سا ہو گیا تھا مگر جلد ہی یہ ویرانی بھی ختم ہو گئی۔ عصر ہوتے ہی ان کا صحن بھر جاتا۔ محلے کی عورتیں اور اکثر مرد بھی بڑی بی سے دعا کرانے آنے لگے۔ تھیلے بھر بھر پھل مٹھائی لاتے۔ امجد اپنے اسٹور سے راشن بھجوانے لگا۔ کہتا کہ "میرے بھیجے ہوئے سامان میں سے اگر اماں کچھ کھائیں گی تو میرے کاروبار میں برکت ہوگی۔"
مہینہ سے زیادہ ہو گیا اور پھر ایک روز باسط لوٹ آیا۔ دروازہ کھولتے ہی ہاتھ جوڑ کر صغرا سے معافی مانگی۔
"خالہ! یہاں سے گیا تو بیمار پڑ گیا۔ ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔" اس نے بڑی بی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ صغرا کو نظر آ رہا تھا وہ کافی کمزور ہو گیا تھا۔
"نانی کی بہت فکر تھی لیکن یہ اطمینان بھی تھا کہ آپ مامی کی طرح ان کو گھر سے نکال نہیں دیں گی۔"
"مامی کی طرح؟" صغرا نے حیرانی سے پوچھا۔
"بس کیا بتاؤں خالہ! ماموں کی پہلی بیوی بہت اچھی تھیں۔ مگر سال بھر پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ نانی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ دو بچے ہیں، ایک بارہ برس کا اور بیٹی چار سال کی ہے۔ مامی بیمار تھیں۔
ان کے انتقال کے بعد سب نے ماموں کو دوسری شادی پر مجبور کیا۔ انہیں بھی مکمل گرہستی چاہیے تھی۔ غلطی یہ ہوئی کہ کم عمر دلہن بیاہ لائے۔ وہ دن رات اپنی دنیا میں مگن رہتی۔ نانی کا وجود اسے برداشت نہیں تھا۔ حالانکہ یہ بے چاری بے زبان تو بالکل بے ضرر ہیں۔ مگر ان کے لیے روٹی ڈالنا یا ان کے کپڑے دھونا بھی اسے بوجھ لگتا تھا۔ ماموں نے کام کاج کے لیے ماسی رکھ لی۔ مگر مامی کو گھر میں صرف نانی کا وجود ہی کھٹکتا تھا۔ بچوں کے ساتھ بھی اس کی لاپروائی کی حد تھی۔
بہرحال نانی کو ایک روز اس نے غصے میں آ کر بہت برا بھلا کہا۔ گھر سے نکل جانے کو بھی کہا۔ ہمارا گھر ماموں کے گھر سے ذرا دور ہے پھر بھی میری امی ہفتہ دس روز میں ایک چکر وہاں کا لگا لیتی تھیں۔
ایک دن ماموں کا فون آیا کہ نانی غائب ہیں۔ اٹیچی کیس میں کپڑے رکھ کر جانے کہاں نکل گئیں۔ ہمارا پریشانی سے برا حال تھا۔ ہر جگہ تلاش کیا، پولیس میں رپورٹ درج کرائی مگر بے سود۔
میرا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ مجھے دو چار دن ایک دوست کے گھر قیام کرنا تھا تاکہ اپنے لیے کوئی کمرا کرائے پر تلاش کر سکوں۔ میں ٹرین سے اتر کر جوں ہی پلیٹ فارم سے باہر آیا، مجھے نانی نظر آئیں۔ اسٹیشن کی سیڑھیوں پر اپنی اٹیچی پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھیں۔
ان کو مسافر خانے میں چھوڑ کر میں گھر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ میری عقل مجھ سے جو کروا رہی تھی، میں بس وہی کر رہا تھا۔ میرے دوست نے میری بہت مدد کی اور مجھے آپ کے گھر میں کمرا مل گیا۔ چند ضروری سامان خرید کر میں یہاں نانی کو لے کر آ گیا۔ لیکن میں نانی کو مستقل یہاں نہیں رکھ سکتا تھا۔ امی سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے نانی کو لے کر فوراً" آنے کا کہا۔ لیکن میں چاہ رہا تھا کہ امی یہاں آ جائیں۔ اور یہی بات کرنے میں وہاں گیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ جاتے ہی بیمار پڑ جاؤں گا اور آپ سے جھوٹ کی بھی معافی چاہتا ہوں جو میں نے یہ کہا تھا کہ حیدر آباد جا رہا ہوں۔" باسط نے گہری سانس لی۔
"چلو بیٹا! جو ہوتا ہے، اچھے کے لیے ہوتا ہے۔ تمہیں کیا خبر کہ تمہارے وہاں رک جانے سے ہمیں تمہاری نانی کی خدمت کا انمول موقع مل گیا۔ ورنہ ہم کم نصیب ہی رہ جاتے۔" صغرا نے باسط کو تسلی دی۔
"پھر تمہاری امی آئی نہیں؟"
"نہیں خالہ! انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں جاب چھوڑ دوں مگر وہیں رہوں۔ میری بیماری سے وہ کافی گھبرا گئی ہیں۔ ہماری تھوڑی زمینیں ہیں۔ وہ کہتی ہیں، انہی کی دیکھ بھال کروں۔ مگر میری سرکاری نوکری ہے۔ میں کسی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا مگر امی کی ضد سے مجبور ہو کر میں اپنے افسر بالا سے بات کرنے گیا تو انہوں نے نوکری چھوڑنے کی سختی سے مخالفت کی اور پھر انہی کی کوششوں سے میرا تبادلہ دوبارہ میرپور خاص ہو گیا ہے۔"
"تو تم خالہ کو لے کر چلے جاؤ گے؟" صغرا پریشان نظر آنے لگیں۔
"کیا کروں، امی یہی چاہتی ہیں۔" باسط نے لجاجت سے کہا۔
"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ بیٹا! جو امی کہیں وہ ہی کرو۔ پھر نانی کا بہت خیال رکھنا۔ میرا تو دل چاہتا ہے ان کو یہاں سے جانے ہی نہ دوں۔ پتا نہیں تمہارے ماموں مامی کیسے کم عقل ہیں جو ان کو یوں دربدر کر دیا۔"
"میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں خالہ! آپ نے نانی کا بہت خیال رکھا۔ کوئی اپنا بھی اتنا نہیں کرتا، جتنا آپ نے کیا ہے۔" وہ بہت شکر گزار تھا۔
"ارے! میں کیا اور میری اوقات کیا۔ یہ تو اللہ کا انعام تھا کہ مجھ جیسے خالی دامن کی کچھ کمائی ہو گئی، ورنہ نامراد اس دنیا سے جاتی تو کیا لے کے جاتی۔" صغرا اداس ہو گئیں۔

☼ ☼ ☼
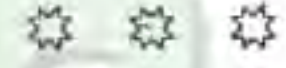
بڑی بی کے جانے کی خبر سن کر پورا محلہ امڈ آیا۔ باسط حیران دیکھ رہا تھا۔ ایک جوڑا بے بی نے اور ایک جوڑا اور چپل صغرا نے خرید کر دیا۔ بے بی نے راستے کے لیے کھڑے مسالے کا قیمہ اور پرت والے پراٹھے پکائے، سوجی کا حلوہ بنایا۔ محلے والے بھی حسب توفیق تحفے تحائف لائے۔
بڑی بی نے سب کو ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعائیں دیں۔ بے بی کو خاص طور پر گود بھرنے کی دعا دی۔
صغرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر ان کی خالی چارپائی کو تکتی رہیں۔ بے بی نل پر بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ بلو باہر گیا ہوا تھا۔
صغرا اٹھیں اور عین اسی جگہ بیٹھ گئیں، جہاں سے بڑی بی اٹھ کر گئی تھیں۔ زندگی رواں تھی۔

☼

رضیہ بٹ

"اے ہے اماں! ایسا غضب' چالیسواں نہیں ہوگا ابا کا.... برادری میں کیا منہ دکھائیں گے۔ ملنے جلنے والوں سے کیا کہیں گے۔ آپ بھی اس کی باتوں میں آگئیں۔ اسے تو عزت بے عزتی کا خیال ہی نہیں۔"

صفیہ نے چھوٹے بھائی حامد کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے ماں سے کہا۔ جو سر نیہوڑائے کھری چارپائی پر بیٹھی تھی۔

"صفیہ آپا! اس میں عزت بے عزتی کیسی؟ فاتحہ تو دلوائیں گے۔ کیا ضرورت ہے کنبے قبیلے کو اکٹھا کرنے کی۔"

"ہائے میں مرگئی۔" صفیہ نے گال پر انگلی رکھتے ہوئے بھائی کو یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہے۔ "تیرا دماغ تو ٹھیک ہے نا۔"

"سب ٹھیک ہے۔" اماں نے سپید دوپٹے کی بکل مارتے ہوئے شاکی لہجے میں کہا۔ "چار پیسے لگانے کا وقت آیا تو لگا الٹی سیدھی ہانکنے۔ مرحوم باپ کی روح تڑپا کرے' اسے کیا احساس۔"

"اماں...." حامد عاجزی سے بولا۔ "آپ سمجھتی کیوں نہیں۔ میں اتنا پیسہ کہاں سے لاؤں۔ جس طرح آپ چالیسواں کرنا چاہتی ہیں' اس کے لیے تو پچاس ہزار روپے بھی کم ہیں۔ آپ ہی بتائیے' میں کہاں سے لاؤں اتنا پیسہ.... جو کچھ پاس تھا وہ ابا کی بیماری پر خرچ ہوگیا۔ مکان تک رہن رکھنا پڑا۔"

"ہاں ہاں' اب تو تو عمر بھر یہی طعنے دیتا رہے گا مجھے۔" اماں سر پر ہاتھ رکھ کر بین کرنے لگیں۔ "ان کی جگہ تو مجھے موت آجاتی' خود تو دامن بچا گئے۔ مجھے بہو بیٹے کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔"

حامد ہاتھ ملتے ہوئے بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اماں کے رونے دھونے میں صفیہ آپا بھی شریک ہوگئی تھیں۔

آج گھر میں کئی دنوں سے جھگڑا چل رہا تھا۔ اماں' ابا مرحوم کا چالیسواں اتنی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں کہ محلے برادری والے لوگ دنگ رہ جائیں۔ مرنے والے کی عزت اسی میں تھی۔ ورنہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ وہ کنگال ہو کر مرا۔

حامد بے چارہ سمجھاتے سمجھاتے عاجز آچکا تھا۔ محدود آمدنی میں تو ان دنوں سفید پوشی کا بھرم رکھنا بھی مشکل تھا اور پھر جو کچھ پاس تھا' بیماری کی نذر ہوگیا تھا۔ تین مہینے کی مسلسل بیماری' آنے جانے والوں کا تانتا اور پھر اماں اور صفیہ آپا کا جھوٹی عزت کو برقرار رکھنے کے لیے شاہانہ خرچ.... وہ چپ چاپ برداشت کیے گیا تھا۔

صالحہ سچ مچ کی صالحہ عورت تھی۔ منہ سے اُف تک نہ کی۔ حامد جس طرح خرچ کرتا رہا۔ علاج معالجے کے لیے پیسہ اکٹھا کرتا رہا۔ وہ شاکی نہیں ہوئی۔ باپ کی خدمت فرض تھی۔ تنگی ترشی میں گزارا کرکے اس خدمت میں کوتاہی نہیں کی' لیکن اماں کو تو بہو کا کیا دھرا کبھی نظر ہی نہ آیا۔ ہمیشہ نقص ہی نکالے۔ باتیں ہی بنائیں۔ زیادہ شہ انہیں صفیہ آپا دیا کرتی تھیں۔

"ماں باپ ساری عمر پالتے پوستے آخر کس لیے ہیں۔ اب ابا چارپائی پر پڑ گئے تو بہو بیٹے ہی کا فرض ہے نا.... میرے سسر بیمار پڑے تھے تو ہم دونوں میاں بیوی ان کی چارپائی سے الگ نہیں ہوئے۔"

اور پھر سسر کی خاطر انجام دی ہوئی خدمات کا وہ یوں تذکرہ کرتیں کہ اماں کو صالحہ کا کیا دھرا نظر ہی نہ آتا۔

ابا مر گئے۔ سوئم اور دسواں اماں نے اپنی مرضی سے کیا۔ حامد اور صالحہ نے کچھ نہیں کہا۔ من مانی کرنے دی لیکن اب معاملہ سنگین تھا۔ پچاس ہزار کا خرچہ حامد کے لیے برداشت کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ ابھی تو کمیٹی کا آخری بل اس کے ذمے تھا۔ دکان دار سے دھڑا دھڑ سودا آرہا تھا۔ اس کا حساب چکانا تھا اور پھر مکان بھی تو رہن تھا۔ سر چھپانے کی جگہ تو تھی۔ اسے رہن سے چھڑانے کے لیے بھی تو پیسہ درکار تھا دن رات وہ اسی کے لیے پریشان رہتا تھا۔

خاوند کی پریشانی صالحہ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کے پاس تھوڑا سا زیور تھا' وہی پیش کردیا۔

"اسے بیچ کر رہن چھڑوالیں۔ باقی قرضے تھوڑے

تھوڑے پیسے تنخواہ میں سے جمع کرکے اتارلیں گے۔"

حامد بڑا متاثر ہوا تھا اور چارہ بھی نہ تھا۔ زیور بیچنے پر بادل نخواستہ رضامند ہوگیا۔ چالیسویں کے بعد وہ پہلا کام مکان آزاد کروانے کا کرنا چاہتا تھا۔

"چالیسویں کے بعد دیکھیں گے۔ فی الحال تم یہ زیور رکھو۔ خدا کرے ضرورت نہ ہی پڑے۔ تم رکھ لو ابھی۔"

صالحہ نے زیور سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ فارغ ہونے پر وہ یہ زیور بیچ دینے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوگئی تھی۔ جانتی تھی اتنی رقم کہاں سے آسکتی ہے کہ قرضے بھی اتر جائیں اور رہن بھی چھوٹ جائے۔ لیکن ماں بیٹی نے تو ایک ہی واویلا مچا رکھا تھا۔ ناک رکھنے کی خاطر چالیسواں دھوم دھام سے کرنا ماں بیٹی کی نظروں میں ضروری تھا۔ حامد سمجھا سمجھا کر تھک چکا تھا۔ صالحہ نے بھی ڈرتے ڈرتے حامد کی تائید کی تھی لیکن ماں بیٹی نے وہ لتے لیے کہ بے چاری کو آئندہ اس جھگڑے میں بات کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ اماں اور صفیہ تو اٹھتے بیٹھتے اسے سنانے لگی تھیں۔

"تم تو یہی چاہو گی ناک کٹ جائے ہماری۔ ابا مرحوم کو سارا زمانہ باتیں کرے کہ مر کر اتنا بھی نہ چھوڑا کہ چند رسمیں ہی پوری ہوجائیں۔ ہاں بی بی! اب تو تمہارا ہی راج ہے' ہم تو محتاج ہیں جو جی چاہے گا کرو گی۔ خاوند کے کان بھرتی رہو گی۔ الٹی سیدھی پڑھاؤ گی اسے' جب ہی تو اتنا برہم ہوتا ہے۔ تم سیدھی راہ پر چلاؤ تو کیا مجال جو چالیسواں نہ کرے۔"

بے چاری صالحہ کان لپیٹے رہتی۔ اب تو تنگ آکر اس نے حامد کو واقعی مجبور کرنا شروع کردیا تھا کہ جیسے بھی ہو اماں کی بات پوری کردے۔

لیکن وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔ اگر کچھ پلے ہوتا تو شاید اس جھگڑے کی نوبت ہی نہ آتی۔ نچلے متوسط طبقے کا آدمی' محدود آمدنی' ہزاروں مسئلے گھیرے ہوئے تھے۔

اس دن صفیہ نے بات بہت بڑھا دی۔ اماں تو رونے دھونے میں لگی رہیں۔ وہ آنکھیں پونچھ بھائی کو دیکھ کر غرائی۔

"مجھے اپنے باوا کی عزت پیاری ہے حامد! چالیسواں ضرور ہوگا اور اسی طرح ہوگا جس طرح اماں کہہ رہی ہیں۔"

"لیکن آپا! میں اتنے پیسے کا بندوبست کہاں سے کروں۔ آپ کو تو ذرا عقل سے کام لینا چاہیے۔ جھوٹی عزت رکھنے کے لیے آپ اس قدر اصرار کررہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا ناکہ لوگ باتیں کریں گے۔"

"تو یہ کوئی بات ہی نہیں تمہارے لیے۔ اتنی عزت بنی ہوئی ہے' وہ تم چاہتے ہو بھک سے اڑ جائے۔ نابابا۔۔۔ میں بھی آخر سسرال والوں کا۔۔۔"

صفیہ آپا لال بھبھوکا ہونے لگیں۔

حامد نے سر جھکالیا۔ اماں چمک کر بولیں۔

"اے بٹی! تو کس سے مغز کھپا رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے نہ ہو۔۔۔ چپ ہی ہوجا۔"

"ناممکن۔۔۔ پیسے کا بندوبست میں کروں گی۔" آپا نے غصے میں کہا۔

"آپ؟" حامد نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔۔۔ یہ لو میرے کڑے۔" آپا نے فٹافٹ اپنے چھ تولے کے کڑے اتار کر اس کے سامنے پھینک دیے۔ "انہیں گروی رکھ کر پیسہ لے آؤ۔ چالیسواں ضرور ہوگا۔"

"آپا! خدا کے لیے جذباتی نہ بنیں' آپ کے سسرال والے کیا کہیں گے۔ اس طرح بھرم نہ ٹوٹے گا عزت کا۔"

"تمہیں اس سے کیا۔۔۔ میں جانوں اور وہ۔۔۔ تم روپے کا بندوبست کرو۔" صفیہ آپا نے حکم دیا۔ "دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ لوگ منہ اٹھائے راہ دیکھ رہے ہیں کہ کب بلاوا آتا ہے۔"

حامد نے آخری کوشش کی۔ کڑے صفیہ کو واپس دیے۔ دولہا بھائی کی بلا اجازت ایسا کام کرنے سے منع کیا لیکن ان کے سر پر تو برادری کا بھوت سوار تھا۔ اس کے سامنے ناک اونچی کرنی تھی۔ تعریف و توصیف کے کلمات سننے تھے۔

دو ایک بار اماں نے بھی کڑے گروی رکھنے سے

صفیہ کو باز رکھنا چاہا لیکن وہ اپنی بات سے پھرنے والی کہاں تھیں۔ مصر ہوئیں' بضد ہوئیں۔ حامد کو بھی ان کی ضد پر تاؤ آگیا۔

"لاؤ ادھر جیسے تمہاری مرضی۔" کپڑے لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر سر کو اثبات میں ہلایا۔ "سوچ لو آپا!"

"اے سب سوچ لیا' دیکھا جائے گا۔ تجھے اتنی فکر کیوں' کوئی تیری بیوی کے کپڑے تو گروی رکھنے کو نہیں کہہ رہی۔ تو انتظام کر... بس..."

صالحہ دوسرے کمرے میں یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ حامد کپڑے لے کر آیا تو اس نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں رہن سے کیسے چھڑائیے گا۔ صفیہ آپا کی ساس بڑی سخت عورت ہے' کہیں..."

"تم اس کی فکر مت کرو۔" حامد نے اسے ٹوک دیا۔ "آپا اپنی ذمہ دار آپ ہیں۔ میں بھی انہیں ان کی ضد کا سبق دینا چاہتا ہوں۔"

چالیسواں اسی دھوم دھام سے ہوا جس کی ماں بیٹی کو خواہش تھی۔ دو تین سو آدمیوں کو کھانا کھلایا گیا اور ابا مرحوم کا جوڑا خدا کے نام پر دیا گیا۔ چھوٹے سے گھر میں اتنے ڈھیروں لوگ۔ بیٹھنے بٹھانے کا جو بندوبست تھا' درہم برہم ہونا ہی تھا۔ کوئی کھڑے کھڑے نوالے نگل رہا ہے' کوئی زمین پر بیٹھا ہے۔ کسی کے حصے دری آئی ہے تو کسی کے چارپائی۔ کوئی کھڑکی میں بیٹھ گیا تو کوئی دروازے کے پٹ بھیڑ کر جگہ بنا رہا ہے۔ ایک عجیب سی افراتفری تھی۔ جمع ہونے والے لوگ بھی تو صفیہ اور اماں ہی کی ذہنیت کے تھے۔ میت کا معاملہ بھول بھال' لگے باتیں بنانے۔ کوئی ناک چڑھا رہا ہے' کوئی منہ بنا رہا ہے۔

"ائے ہے! کسی کھلی جگہ انتظام کر لیا ہوتا لوگوں کو سزا دینے بلوایا ہے۔ کھانا بھی کسی ڈھنگ کا نہیں' شوربا تو جیسے دیگ نل کے نیچے رکھ کر بنایا ہے۔ چاولوں میں بوٹی نام کو نہیں اور یہ وہی ہے یا کسی... توبہ بہن! اور وہ جو جوڑا دیا ہے' ہائے ہائے نہ گوٹ نہ ٹوپی۔ مردہ سردی میں ٹھٹھرتا رہے گا' اے بہن... سر سے ننگا۔ کیا لوگ ہیں یہ بھی... کبھی ٹوپی کے بغیر بھی جوڑا دیا جاتا ہے مردے کا..."

اماں اور صفیہ لوگوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ ماں بیٹی دونوں صالحہ سے کترا رہی تھیں۔ ان لوگوں پر غصہ بھی آرہا تھا لیکن گھر آنے والوں کو کچھ کہہ بھی تو نہ سکتی تھیں۔ ہاں دل ہی دل میں پچھتاوا ضرور آرہا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا چپکے سے فاتحہ دلوا دیتیں۔ روپیہ پیسہ الگ خرچ ہوا' دوڑ دھوپ الگ اور لوگوں کی ایسی ایسی دل جلا دینے والی باتیں۔ حامد سچ ہی کہتا تھا۔ لیکن دونوں ماں بیٹی تلخ تجربے کے باوجود سچائی کو برملا ماننے والی نہ تھیں۔ صالحہ نے جب شاکی انداز میں شبو کی اماں کی ہوئی نکتہ چینی دہرائی تو دونوں اس کے سر ہوگئیں۔

"ایسے موقعوں پر یوں ہی ہوتا ہے۔ کون سی نرالی بات کہہ دی اس بے چاری نے جو تم چرچا کرنے لگیں۔"

بے چارہ حامد جل ہی گیا لیکن چپ ہی رہا۔ کچھ کہہ دیتا تو زن مریدی کا لیبل فوراً چسپاں ہو جاتا۔

چالیسویں کا ہنگامہ گزر گیا۔ تو صفیہ کو اپنی جلد بازی کا احساس ہوا۔ ساس' نندیں کپڑوں کا تو ضرور پوچھیں گی۔ دل ہی دل میں تو انہوں نے کئی بہانے گھڑ لیے تھے لیکن جاتے جاتے اماں اور حامد کو رہن جلدی چھڑانے کی تاکید کر گئی تھیں۔

وہی ہوا... جس کا خدشہ تھا۔ ننگی کلائیاں بھلا کب تک آستینوں سے ڈھکے رکھتی۔ ساس نے پوچھ ہی لیا۔ صفیہ کچھ گھبرائیں لیکن جلد ہی بات بنالی۔

"ابا میاں کا سوگ ہے' کپڑے پہنتے اچھی تھوڑا ہی لگتی... وہیں اس دن اتارے تھے۔ اماں کے پاس ہی پڑے ہیں۔"

ساس نندیں کھٹک گئیں۔ کئی بار اصرار کیا جب صفیہ سوگ کا بہانہ ہی کیے گئیں تو وہ درپے ہوگئیں۔ صفیہ ٹال مٹول کیے گئیں۔ ہمسائی کے ہاتھ اماں کو خفیہ پیغام بھی بھیجا لیکن اتنی جلدی رہن چھٹنے کی صورت ہی کون سی تھی۔

لیکن اس دن تو صفیہ کی گھبراہٹ دید کے قابل تھی۔ اس وقت کو کوس رہی تھیں جس وقت جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کپڑے گروی رکھنے کو دیے تھے۔ بات بھی تو ایسی تھی۔ ساس نندوں کو تو ٹال رہی تھیں۔ اس دن شوہر نے کپڑے مانگے۔ دوست کی بیوی نے کسی شادی میں شریک ہونا تھا۔ اللہ جانے بات سچ تھی یا ساس نندوں نے پٹی پڑھائی تھی۔ بہرحال شوہر نے شام تک کپڑے اماں کے گھر سے لانے کو کہا تھا۔

صفیہ گھبرائی گھبرائی اماں کے پاس پہنچیں۔ سارا واقعہ سنایا۔ اچھی بھلی ازدواجی زندگی میں تلخیاں گھلنے کا سامان پیدا ہو رہا تھا۔ شوہر کے سامنے جھوٹی پڑ کر اعتماد کھو دیتیں۔ تو زندگی کیسے گزرتی۔ حامد کے پاؤں پکڑ لیے۔

"بھیا! خدا کے لیے جیسے بھی ہو سکتا ہے' جہاں سے بھی ہو سکتا ہے۔ شام تک کپڑے لادو۔ ورنہ میری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ میں نادم ہوں خواہ مخواہ تمہیں تنگ کیا۔"

اور پھر رو رو کر اپنے کیے پر پچھتاتے ہوئے وہ حامد کی منتیں کرنے لگیں۔ اماں بھی بیٹی کی طرف داری میں شکست خوردہ انداز میں بولنے لگیں۔

حامد چپ چاپ سنے گیا۔ جب دونوں چپ ہوئیں تو بے رخی سے بولا۔

"میرے پاس الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں' اب اتنے کم وقت میں' میں کہاں سے پیسے کا بندوبست کروں۔ آپ نے اپنی بات تو پوری کر لی۔ اب رہن چھٹنے کا انتظار کریں۔"

صالحہ بھی قریب ہی چارپائی پر بیٹھی تھی۔ حامد کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر بڑے تفاخر سے بولی۔

"بس بہت ہو گیا' بتا دیجیے نا آپا کو۔ کیوں پریشان کر رہے ہیں۔ اتنا ہی کافی ہے' پچھتا تو رہی ہیں' اپنی غلطی بھی مان رہی ہیں۔"

اماں نے چونک کر دونوں کی طرف دیکھا۔ صفیہ بھی آنکھیں پونچھتے ہوئے صالحہ کو دیکھنے لگیں۔

"کیا بات ہے؟" وہ سر کے اشارے سے پوچھتے ہوئے بولیں۔

"آپ کے کپڑے رہن نہیں رکھے تھے صفیہ آپا!" صالحہ نے حامد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

"رہن نہیں رکھے تھے؟" دونوں ماں بیٹی بیک وقت بولیں۔

"ہاں..." صالحہ بولی۔ "صفیہ آپا کی ساس اتنی سخت ہیں' انہیں پتا چلتا تو بری بات تھی۔ میں نے چالیسویں کے لیے اپنا زیور بیچ دیا تھا۔ کپڑے میرے پاس ہی ہیں۔ جائیے نکال لائیے۔"

صالحہ نے چابی حامد کو دی اور فخر و غرور سے سر اونچا کرتے ہوئے ساس اور نند کی طرف دیکھا۔ حامد اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔

"ہائے میں مر گئی۔" اماں نے صالحہ کو داد دینے کی بجائے سینے پر ہاتھ مارا۔ "کتنا جگرا ہے تیرا بہو... تماشا دیکھ رہی تھی میری بچی کا۔ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی وہ اور تو کتنے مزے سے بیٹھی سن رہی تھی۔ پتھر کا دل ہے پتھر کا..."

"وہ تو... وہ..." صالحہ بے چاری داد پانے کے بجائے اس بے داد پر بوکھلا گئی۔ اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ حامد نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔

"اے اماں! جانے بھی دو' آخر کو تو بھابھی ہی ہے نا... بہن تو نہیں... جو رونے پر دکھ جاتی۔" صفیہ نے چمک کر کہا۔

اور بے چاری صالحہ ان کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی۔

ہم اپنے آپ سے بے گانے تھوڑی ہوتے ہیں
سرور و کیف میں دیوانے تھوڑی ہوتے ہیں

تباہ سوچ سمجھ کر نہیں ہوا جاتا
جو دل لگاتے ہیں، فرزانے تھوڑی ہوتے ہیں

کہاں زبان و بیاں کارگر محبت میں
کہ یہ معاملے سمجھانے تھوڑی ہوتے ہیں

جو لوگ آتے ہیں ملنے ترے حوالے سے
نئے تو ہوتے ہیں اَن جانے تھوڑی ہوتے ہیں

مزاج پوچھتے ہیں کس تپاک سے ہر بار
اگرچہ وہ ہمیں پہچانے تھوڑی ہوتے ہیں

نہ آئیں آپ تو محفل میں کون آتا ہے
جلے نہ شمع تو پروانے تھوڑی ہوتے ہیں

شعورؔ تم نے خدا جانے کیا کیا ہو گا
ذرا سی بات کے افسانے تھوڑی ہوتے ہیں

انور شعورؔ

یادداشت

چلو اِک کام کرتے ہیں
انہیں ہم بھول جاتے ہیں
وہ، جو ہم کو رُلاتے ہیں
جنہوں نے دُکھ دیے جاں کو
اُتارو ان کے احسان کو
چلو ان کے دیے تحفے
کہیں پر پھینک آتے ہیں
جو ہم کو ڈستے رہتے ہیں
بڑا ہم کو ستاتے ہیں
چلو ان سب کی تصویریں
لکھی سب ان کی تحریریں
چلو ان کو جلاتے ہیں
نظر سے اب ہٹاتے ہیں
چلو اِک کام کرتے ہیں
انہیں ہم بھول جاتے ہیں
مگر یہ کام کرنا تھا
یہی، ہم بھول جاتے ہیں

مصباح نازش

سوال کو نہ کریں حل، دُعا کیے جائیں
وہ بے عمل ہیں جو ہر پل دُعا کیے جائیں

یہ فکر ہے کہ شفایاب کس طرح ہوں گے
دوا کریں نہ مکمل، دُعا کیے جائیں

خدا کرے کہ اندھیرا نہ راستے میں رہے
بجھا کے آپ ہی مشعل، دُعا کیے جائیں

یہ لوگ سوچ سے عاری ہوئے اور اس درجہ
وجود ان کے ہوئے شل، دُعا کیے جائیں

بنائیں آپ ہی مقتل جو اس نگر کو ظفرؔ
نہ یہ نگر بنے مقتل، دُعا کیے جائیں

صابر ظفرؔ

رابطہ

فون کی ہر بیل پر
دل دھڑکتا ہے
"ہیلو" کے جواب میں
ہر بار خاموشی منتظر ہوتی ہے
مجھے خبر ہے
کہ یہ خاموش پکار کس کی ہے
اور میرے اس معلوم کی
اسے بھی خبر ہے
پھر بھی جانے کیوں وہ بولنے سے گریزاں ہے
یہ کیسا رابطہ ہے
کہ خاموشی باتیں کرتی ہے

شبانہ یوسف

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

سعد بن عبادہؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ام سعد (یعنی میری ماں) وفات پا گئی ہے۔ پس اس کی طرف سے کون سا صدقہ بہتر ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پانی۔"

پس سعد نے کنواں کھدوایا اور کہا۔ "یہ کنواں ہے ام سعد کی طرف سے۔"

(ابوداؤد)

پریشانی آزمائش ہے یا سزا،

حضرت علیؓ سے کسی نے پوچھا۔ "یہ کیسے پتا چلے گا کہ جو پریشانی یا مصیبت ہم پر آئی ہے، وہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے یا ہم پر اللہ کی طرف سے سزا ہے؟"

آپؓ نے جواب دیا۔

"جو مصیبت تجھے اللہ کی طرف لے جائے وہ آزمائش ہے اور جو مصیبت تجھے اللہ سے دور کر دے وہ سزا ہے۔"

نوال افضل گھمن۔ گجرات

تلاش،

آپ کو معلوم ہے کل ساجد نے آرٹس کونسل کی محفل موسیقی میں گانا گایا ہے۔" ایک صاحب نے دوسرے صاحب کو بتایا۔

"حیرت ہے۔" دوسرے صاحب بولے۔ "ساجد کو تو گانا ہی نہیں آتا، اسے اسٹیج پر چڑھنے کس نے دیا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں البتہ ساجد اس شخص کو تلاش کر رہا ہے جس نے اسے اسٹیج سے اترنے پر مجبور کیا۔" پہلے صاحب نے بتایا۔

گلاب اور کانٹا،

یہ ٹھیک ہے کہ تم ایک گلاب نہیں بن سکتے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم ایک کانٹا بن جاؤ۔ یہاں

ایک راز کی بات ہے اور وہ میں تمہیں بتا ہی دیتا ہوں کہ جو شخص کانٹا نہیں بنتا وہ بالآخر گلاب بن ہی جاتا ہے۔ (اشفاق احمد۔ زاویہ 3)

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

جوش،

گرمی کی ایک دوپہر میں کچھ سپاہی کپڑے سے بنے ہوئے پتلوں پر حملہ کرنے کی پریکٹس کر رہے تھے مگر ان کے حملے میں جوش نہ تھا۔ ان میں جوش پیدا کرنے کے خیال سے ان کے افسر نے ایک تقریر کی۔

"ان پتلوں کو اپنا دشمن سمجھ کر ٹوٹ پڑو۔ یہ سمجھو کہ انہوں نے تمہارے شہر پر حملہ کیا ہے۔ تمہارے گھروں کو آگ لگائی ہے۔ تمہارا مال و اسباب لوٹ لیا ہے۔ تمہاری ساری شراب پی گئے ہیں۔ تمہاری جوان بہنوں اور بیویوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ان پر پل پڑو، انہیں تہس نہس کر دو۔"

سب سپاہی نیزے پکڑ کر طیش میں پتلوں کی طرف بڑھے۔ ایک سپاہی نے دانت کچکچاتے ہوئے افسر سے پوچھا۔

"ذرا یہ تو بتا دیجیے، ان میں سے کس نے میری ساری شراب پی ہے؟"

مزہ، اقراء۔ کراچی

بددعا،

ابا جان نے اسپتال میں بستر پر پڑے ہوئے گڈو میاں سے کہا۔

"میں تمہاری صحت کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اچھے بچوں کی طرح اب تم گولو میاں کو معاف کر دو جنہوں نے تمہارے سر پر بوتل مار کر تمہیں زخمی کر دیا تھا۔"

گڈو میاں بولے۔ "میرے لیے دعا کرنے کی تکلیف نہ کریں ابا جان! تھوڑا سا انتظار کریں۔ جس روز مجھے اسپتال سے گھر جانے کی اجازت ملے گی، اسی روز آپ کو گولو میاں کے لیے دعا کرنا پڑے گی۔"

طوبیٰ۔ کراچی

کراچی،

یہاں روز حشر بپا ہوتے
پر کوئی بھی روز جزا نہیں
یہاں زندگی بھی عذاب ہے
یہاں موت میں بھی شفا نہیں

(احمد فراز)

ادب سے،

٭ غیر یقینی حالات پر تقریریں کرنے والے کتنے یقین سے اپنے مکانوں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

٭ حرام مال اکٹھا کرنے والا اگر بخیل بھی ہے تو اس پر دہرا عذاب ہے۔

(واصف علی واصف)

خدا گواہ،

یہ طالبان وزارت، یہ لیڈران کرام
تلاش جاہ میں جو کچھ کہو وہ کر لیں
نئے جنم میں یقین ہو اگر وزارت کا
خدا گواہ کہ یہ آج خودکشی کر لیں

(رئیس امروہوی)

عظمیٰ غلام نبی۔ فیصل آباد

کم سخن،

مشہور عالم سائنس دان سر آئزک نیوٹن برطانوی پارلیمنٹ کے رکن کی حیثیت سے دو بار منتخب ہوئے۔ دارالعوام میں انہوں نے تقریباً دو برس گزارے۔ اس تمام عرصے میں انہوں نے صرف ایک مرتبہ بات کرنے کے لیے منہ کھولا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس دن گرمی بہت تھی اور وہ کھڑکی کھلوانا چاہتے تھے۔

ثناء عمر۔ سخی حسن

ناممکن،

ایک دانا سے کسی نے پوچھا۔

"تم ایسا کیا کریں کہ سب کی نظروں میں اچھے بن جائیں؟"

دانا نے جواب دیا۔ "اس دنیا میں اگر کوئی فرشتہ بھی بن جائے تب بھی اسے برا کہنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔"

فوزیہ ثمر بٹ۔ ہانیہ عمران۔ گجرات

کاش،

ایک پٹواری اپنی زمین کا معائنہ کرنے گیا۔ راستے میں اسے کتوں نے گھیر لیا تو وہ کچھ دور جا کر نہایت غصے سے بولا۔

"کاش تمہاری ایک ایکڑ بھی زمین ہوتی تو میں سبق سکھا دیتا۔"

مدیحہ، ندا۔ کراچی

گوہر نایاب،

٭ بڑا قد سے نہیں، کیے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے، سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہوتا ہے۔

٭ جلدی کھایا ہوا کھانا اور جلدی ملا ہوا فائدہ کبھی ہضم نہیں ہوتا۔

٭ پرائے لوگ ہوں یا معاملے، ان سے دور ہی رہنا

چاہیے۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔

- ہر زمانے میں موسم بہار موجود رہتا ہے۔ یعنی انسان ہر وقت اور ہر عمر میں علم و ہنر حاصل کر سکتا ہے۔
- زیادہ باتونی شخص پڑھنے کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔
- اچھی روایات اور اچھے آداب ہیرے کی انگوٹھی جیسے ہوتے ہیں۔ چاہے دائیں سے اور چاہے بائیں سے پرکھو، نہ کھوٹ نظر آتا ہے اور نہ ملتا ہے۔

حنا سلیم اعوان۔ آخون بانڈی

سرکاری دفتر،

سروے کرنے والے ایک صاحب نے ایک سرکاری دفتر کے انچارج سے پوچھا۔
"آپ کے ہاں کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟"
انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر جواب دیا۔
"سو میں سے تین۔"

کرن، بینش۔ کراچی

اللہ سے تجارت،

جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آجاؤ اور رزق کا کوئی راستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ سے تجارت کرلیا کرو۔
(حضرت علیؓ)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

سطر سطر خوشبو،

- دلچسپی کو طلب مت بننے دو۔ کیونکہ طلب بڑھ کر ضرورت اور ضرورت بڑھ کر کمزوری بن جاتی ہے۔
- زندگی کے حقائق سے سنجیدہ یا رنجیدہ نہ ہوں۔ ایک بات تو طے ہے کہ آپ زندگی سے زندہ بچ کر نہیں بھاگ سکتے۔
- ہر اچھے اور برے شخص کو ہنس کر قبول کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے نصیب (قسمت) کی وجہ سے ہوتا ہے۔
- اعتماد برت کا پتھر ہے۔ جب ایک بار اکھڑ جائے تو نیچے ہی آتا ہے۔
- خواہشوں اور شیشوں میں ایک خوبی سا نجھی ہوتی ہے۔ یہ اکثر بے یقینی کے باعث اندر ہی اندر اپنے ہی دباؤ، اپنے ہی بوجھ، اپنی ہی گرمی سردی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔
- برائی اور برے اعمال دیمک کی طرح ہوتے ہیں باہر سے کچھ نہیں بدلتا اندر سے سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے۔

فوزیہ۔ فیصل آباد

دل، دریا، سمندر،

- اسباب کا کھیل نتائج کا کھیل رضا اور قضا کی زد میں رہتا ہے۔
- انسان مال جمع کرتا رہتا ہے۔ اس کے بینک بھرے رہتے ہیں اور دل خالی رہتا ہے۔
- اپنے اعمال کو دعا کے سہارے سے محروم نہ ہونے دیا کرو۔
- ہم لوگ فرعون کی زندگی چاہتے ہیں اور موسیٰؑ کی عاقبت۔
- دریا عبور کرنے کے لیے کشتی ضرور سبب ہے لیکن گرداب سے نکلنے کے لیے دعا کا سفینہ ضرور چاہیے۔
- زندگی صرف اصول نہیں، حسن ہے، جلوہ ہے، محبت بھی ہے۔
- انسانوں کا جہان رفاقتوں کا جہان ہے۔ یہ وفاؤں کی داستان ہے۔ رشتوں کی تقدیس ہے۔ سماجی اور دینی رابطوں کی تفسیر ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس کا ہمسفر اس کا ہم خیال ہو۔ رفاقت زندگی ہے فرقت موت۔
- اینٹ کا اینٹ سے ربط ختم ہو جائے تو تعمیر مکمل ختم ہو جاتی ہے۔

(واصف علی واصف)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

سیدہ صائمہ سرفراز ــــــــــ کراچی

تیرے نام کی جو روشنی اسے خود ہی تو نے بجھا دیا
نہ جلا سکی جسے دھوپ بھی اسے چاندنی نے جلا دیا
میں ہوں گردشوں میں گھرا ہوا مجھے آپ اپنی خبر نہیں
وہ جو شخص تھا میرا رہنما اسے راستوں میں گنوا دیا

اقصیٰ، عذرا ناصر ــــــــــ کراچی

وہ ہر مقام سے پہلے، وہ ہر مقام کے بعد
سحر تھی شام سے پہلے، سحر تھی شام کے بعد
چراغ بزم ستم ہیں، ہمارا حال نہ پوچھ
جلے تھے شام سے پہلے، جلے ہیں شام کے بعد

روشن ہاشم ــــــــــ کراچی

آنکھوں سے خواب، دل سے تمنا تمام شد
تم کیا گئے کہ شوق نظارہ تمام شد
اک یاد یار ہی تو پس انداز ہے ندیم
ورنہ وہ کار عشق تو کب کا تمام شد

عمارہ نیازی ــــــــــ بھکر

سفر میں راہ کے آشوب سے نہ ڈر جانا
پڑے جو آگ کا دریا تو پار کر جانا
یہ اک اشارہ ہے آفات ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

نسرین بے نظیر سومرو ــــــــــ گاؤں علی بحر

کیا بوجھ تھا کہ جس کو اٹھائے ہوئے تھے لوگ
مڑ کر کسی کی سمت کوئی دیکھتا نہ تھا
کچھ اتنی روشنی میں تھے چہروں کے آئینے
دل اس کو ڈھونڈتا تھا جسے جانتا نہ تھا

آسیہ قادر ــــــــــ کوئٹہ کینٹ

دیوار سے ڈھائے نہ گئے درد کے رشتے
اب بھی ہم غم ہجراں کے طلب گار بہت ہیں
ہوتا ہے ادا آج بھی زخموں سے چراغاں
ارزاں ہے جو شے اس کے طلب گار بہت ہیں

عنبر وسیم ــــــــــ بورے والا

ہم سے اگر ہے ترک تعلق تو کیا ہوا
یارو کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو
جو خود کو کہہ رہے ہیں منزل شناس ہیں
ان کو بھی کیا خبر ہے مگر پوچھتے چلو

بینا شاہ ــــــــــ ٹوپی صوابی

اہل دل اور بھی ہیں، اہل وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں دنیا سے خفا اور بھی ہیں
ہم پہ ہی ختم نہیں مسلک شوریدہ سری
چاک دل اور بھی، چاک قبا اور بھی ہیں

عدیلہ شہزاد ــــــــــ لیہ

کون خریدے گا اب ہیروں کے دام میرے آنسو
وہ جو درد کا تاجر تھا تیرا شہر ہی چھوڑ گیا

نوال افضل گھمن ــــــــــ گجرات

کس قدر انوکھا ہے رابطہ محبت کا
کب نجانے ہو جائے معجزہ محبت کا
اپنی ذات سے بھی وہ اجنبی لگتا ہے
جس کے ساتھ ہو جائے حادثہ محبت کا

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

عشارہ اسلم ـــ نندووال گجرات

خواتین کے ساتھ پانچ سالہ تعلق میں بہت مرتبہ جی چاہا کہ لکھوں لیکن ہر بار گھبراہٹ اور اندیشہ کہ پتا نہیں شائع ہو گا بھی یا نہیں۔ اکتوبر کا شمارہ سارے کا سارا بہت اچھا تھا۔ خاص طور پر "جو بچے ہیں سنگ" میں زین کا بدلا ہوا روپ اچھا لگا اور ام مریم! اس وحشی بلی کے ساتھ تو بہت برا ہونا چاہیے۔ باقی حتمی رائے ناول کے اختتام پر دیں گے۔ عنیزہ سید منفرد انداز لیے بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ خاص طور پر کھاری کی پنجابی بہت مزے کی ہوتی ہے۔

افسانوں میں عظمیٰ افتخار کا "صراط مستقیم" سب سے اچھا لگا۔ نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" اپنے نام کی طرح یقیناً" بہترین ناول ہو گا۔ عفت سحر طاہر کا میرے ہمدم میرے دوست میں ہانیہ کی فرماں برداری اور باپ کا مان رکھنا بہت پسند آیا۔

"میری بیاض سے" میں ندا ' فضہ کا انتخاب پسند آیا اور "ہمارے نام" میں ماجدہ سعید کا تبصرہ سب سے اچھا لگا اور انیقہ انا! آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟

کنیز نبوی اور نایاب سے درخواست کی جاتی ہے کہ پلیز جلدی واپس آئیں اچھے سے ناولوں کے ساتھ۔

ج: پیاری عشارہ! آپ کی گھبراہٹ اور اندیشوں کی وجہ سے کتنا عرصہ ہم آپ کی رائے نہ جان سکے۔ ایسا کیسے ممکن ہے کہ آپ ہمیں ــــ خط لکھیں اور ہم شائع نہ کریں۔ یہ البتہ ہو سکتا ہے۔ چار پانچ خطوط میں کبھی ایک ،، خط شائع نہ ہوں لیکن پڑھتے ہم تمام خطوط ہیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ کنیز نبوی اور نایاب جیلانی تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ یہ ہمارے دل کی بھی آواز ہے۔

عائشہ ـــ ٹنڈو محمد خان

اکتوبر کا خواتین۔ ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ جو بچے ہیں سنگ بہت زبردست ہو گیا ہے۔ باقی سب کہانیاں اچھی لگیں۔ ہمیشہ کی طرح۔

فرزانہ سہیل میاں چنوں کا سن کر دل دکھ سے بھر گیا۔ میں ہمیشہ سے ان کا انتخاب مستقل سلسلوں میں پڑھتی آئی ہوں۔

ج: پیاری عائشہ! جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں ان کی اچھی یادیں ہمیشہ رہتی ہیں۔ ہمیں اپنی تمام مصنفین اور قارئین بے حد عزیز ہیں اور ان کا دکھ دل سے محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی رحمت کا سایہ رکھے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

صدف ناز انصاری ـــ ملتان

آپ کے تینوں پرچے نہایت ذوق و شوق سے خریدتی ہوں آپ کے یہ "اصلاحی تین" اتنے اچھے ہیں کہ ان کی تعریف سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے۔ بے شمار اخبارات ' میگزینز اور ڈائجسٹ پڑھے لیکن خواتین کا معیار سب سے اعلیٰ و منفرد پایا۔ ویسے تو ہر قاری و قلمکار متعلقہ جریدہ کی توصیف کرتا ہے مگر میں ، دل کی عمیق

گہرائیوں سے اعتراف کرتی ہوں کہ واقعی خواتین جیسا دلچسپ رسالہ ملنا ناممکن نہ سہی ' مشکل ترین ضرور ہے۔ ایک طرف فرحت اشتیاق ہمیں جی بھر کر رلاتی ہیں تو دوسری جانب نمرہ بخاری اور فائزہ افتخار ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیتی ہیں۔ راحت جبیں موسموں ' پھولوں اور تتلیوں کی باتیں سناتی ہیں تو نگہت سیما اور آسیہ رزاقی زندگی کے تلخ حقائق کا پردہ چاک کرتی ہیں۔ نمرہ احمد معلوماتی انسائیکلوپیڈیا لاتی ہیں تو کوٹ سی در ثمین محبت کے لطیف جذبات و احساسات کو قرطاس پر کمال انداز سے بکھیرتی ہیں۔ اب کس کس مصنفہ کی کون کون سی خوبی کا ذکر کروں؟ ٹیلی ویژن کی نشریات بھی آپ ہی کے ادارے کے دم سے کامیابی حاصل کر رہی ہیں۔

آپی! میری عمر 16 سال ہے۔ گزشتہ ساڑھے تین چار سال سے خواتین زیر مطالعہ ہے۔ علاوہ ازیں کم و بیش اتنے ہی عرصے سے بچوں کے ادب سے منسلک ہوں اور متعدد تحاریر تخلیق کر چکی ہوں۔ مزید برآں اسی شعبے میں سینئر لکھاری کے اعزازیہ ایوارڈ بھی جیت چکی ہوں۔ حال ہی میں ماہ رمضان کے موقع پر مقامی آرگنائزیشن کے زیر اہتمام منعقدہ تقریری مقابلہ میں پہلی پوزیشن بھی حاصل کی ہے۔

پیاری صدف! ہماری جانب سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے بہت جلد آپ کا نام بھی ہماری مصنفین کی فہرست میں شامل ہو گا۔

مرک سجاد ـــ گاؤں انڈھالو ضلع بدین سندھ

ہمارا گاؤں انڈھالو بدین شہر سے 8 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے میرا گاؤں بہت خوب صورت ہے یہاں پر ایک بہت بڑا سرکاری اسپتال اور تین سرکاری اسکول ہیں۔ ہمارے گاؤں میں سوئی گیس بھی ہے میں نے میٹرک تک پڑھا ہے شادی شدہ اور ایک بیٹے کی اماں جان بھی ہوں اس کے باوجود بھی شعاع اور خواتین کے لیے وقت ہی وقت ہے۔

اس ماہ کا ٹائٹل کچھ خاص پسند نہ آیا۔ سب سے پہلے "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" پڑھا ' عنیزہ جی کی بہت اچھی تحریر ہے۔ رکی ' سعدیہ اور کھاری سعد کے بہن بھائی ہیں کیا؟ ماہ نور اور سعد کا کردار بہت اچھا ہے "میرے خواب لوٹا دو" میرا اور امی (ساس) کا پسندیدہ ناول ہے ' یاسمین اریبہ اور سارا کی سوتیلی ماں ہے کیا؟ تاجور اور رازی کی شادی ہو گی؟ عفت سحر کا ناول بہترین تھا عفت آپی اور روبی گل کہاں ہیں۔ ہمارے نام میں سعدیہ ندیم کا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا ہماری پیاری رائٹر ثمینہ عظمت علی کے قدموں تلے جنت تحریر ہوئی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی ۔ آپی میری ایک فرمائش ہے آپی پلیز فہد مصطفیٰ کا انٹرویو شامل کریں۔

مرک! آپ خوش نصیب ہیں ' آپ کے گاؤں میں گیس ہے اور تعلیمی سہولیات بھی مہیا ہیں۔ ہمارے پیارے سندھ کا دیہی علاقہ بہت سی سہولیات سے محروم ہے۔ پچھلے چار سالوں میں سندھ میں ترقیاتی کام بالکل نہیں ہوئے ' رہی سہی کسر سیلابوں نے پوری کر دی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ میٹرک پاس ہیں اور آپ کے گاؤں میں لڑکیاں بھی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔

نگہت عبداللہ کے ناول میں اریبہ اور سارہ یاسمین کی سگی بیٹیاں ہیں اور حمادان کا سگا بھائی ہے۔ اریبہ کے والد نے یاسمین کی بد فطرتی سے تنگ آ کر دوسری شادی کر رکھی ہے۔

تاجور اور رازی کی شادی ہو گی یا نہیں؟ اس کے بارے میں تو نگہت عبداللہ ہی بتا سکتی ہیں۔

یاسمین کنول ـــ پسرور

عنیزہ سید ' نگہت عبداللہ فرحت اشتیاق ' نگہت سیما جیسی بہترین اور ٹاپ کی رائٹرز کی تحریروں سے مزین خواتین ڈائجسٹ دیکھ کر پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سرورق دلکش

اعتذار

نگہت عبداللہ علالت کی بنا پر ناول "میرے خواب لوٹا دو" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس لیے اس ماہ ان کے ناول کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ آپ قسط پڑھ سکیں گی۔

لگا۔

لبنیٰ عروج کی وفات کا پڑھ کر بے حد دکھ ہوا اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

ج: پیاری یاسمین! خواتین پڑھ کر آپ کو خوشی ہوئی اور ہمیں آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ہماری محنت کامیاب ٹھہری۔ پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

عالیہ بتول۔۔۔ حویلی بہادر شاہ

ٹائٹل اچھا لگا سادہ سی ماڈل اچھی لگی۔ کرن کرن روشنی پڑھ کر ہمیشہ کی طرح دل پرسکون ہوا۔ عنیزہ جی آپ کے کیا کہنے۔ بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں سعد اور ماہ نور کا کردار بھی بہت اچھا لگ رہا ہے اور پراسرار بھی' رابعہ باجی اور سعدیہ کلثوم کے رشتے کی سمجھ بھی آرہی ہے میرے خواب لوٹا دو شکر ہے کہ تاجور کو اس کا بھائی اور اریبہ کو اس کا گھر مل گیا لیکن یہ تو ظاہری بات ہے کہ اریبہ اور شمشیر ہی کی جوڑی بنے گی۔ سمیر کو تاجور مل جائے گی۔ اب ایسی بھی کیا نادانی اجلال سے ہوئی کہ وہ سارہ سے ہی شادی کرلے۔ فرحت اشتیاق نے اس دفعہ رلا دیا۔ ام مریم کا کردار بہت گندا ہے۔ نگہت سیما بہت عرصہ بعد آئیں اور چھا گئیں۔ عمارہ اور بابا جان کا دکھ اپنے دل پہ محسوس ہوا۔ پلیزان کو ماریے گا نہ ابھی عفت سحر طاہر وہی پرانا سٹائل' صراط مستقیم اور جونا میم بھی اچھے تھے۔

ج: پیاری عالیہ! آپ کی تحریر کے سلسلے میں معذرت تفصیلی تبصرہ اچھا لگا' متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ خوش ہوجائیں' بابا جان زندہ ہیں اور ان کی اس قسط میں عمارہ سے ملاقات بھی ہوگئی ہے۔

ناہید نور الٰہی۔۔۔ کراچی ایئرپورٹ

ڈائجسٹ بھی میں نے ہاسپٹل میں منگوائے کہ میں ہاسپٹل میں ایک ہفتہ ایڈمٹ رہی مجھے ٹائیفائڈ ہوگیا تھا لیکن اب خدا کا شکر ہے کہ طبیعت بہتر ہے ڈائجسٹ کھولتے ہی دو خبریں ہمارے دل پر بجلی بن کر گریں لبنیٰ عروج صاحبہ کہ جن کی کہانیاں میں بے حد شوق سے پڑھتی تھی اور ہمارے نام میں فرزانہ سہیل کی موت کی خبر پڑھ کر دل کو دھچکا لگا فرزانہ سہیل کو میں بھی 24-25 سال سے جانتی تھی قلم کے ذریعہ سے۔ مجھے ان سے ایک انسیت سی تھی موت ایک اٹل حقیقت ہے جس کے آگے سب بے بس ہیں۔

ج: پیاری ناہید! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند خوش و خرم رکھے۔ آمین۔

خواتین ڈائجسٹ میں آپ کی تحریریں شامل نہ ہوسکیں اس کے لیے معذرت خواہ ہیں' اس سے پہلے ہمیں آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔

حبیبہ ساجد۔۔۔ سکھر

سرد ہواؤں میں بھیگی ٹھنڈی راتوں میں سبز چائے کی خوشبو اور خواتین ڈائجسٹ جیسے منفرد ساتھی کی بات ہی اور ہے۔ اب اس کو آٹھ سال مکمل ہو رہے ہیں۔ رات گئے رضائی میں چھپ کر "امربیل" پڑھنا اور عمر کی موت پر ہفتوں سوگوار رہنا اب تک یاد ہے' بیشتر کہانیاں تو در آگہی سے گزر کر سمجھ میں آئیں' کرداروں کو پڑھتے پڑھتے کب میں نے ان کے ساتھ قدم ملانے شروع کیے یہ تو یاد بھی نہیں۔ ہر لمحے' ہر لحظے پر میرے ذہن کے کینوس پر لاتعداد نقوش ابھرتے ہیں' تصویریں بنتی ہیں اور سنورتی ہیں کہیں ان کہی باتیں ہیں تو کہیں بولتی خاموشیاں ہیں' کچھ اثر انگیز آہیں' کچھ یادیں' ملاقاتیں' برساتیں جن کی چاپ صرف میری سماعتوں تک محدود ہے بقول شاعر

مجھے یاد ہے وہ سب کچھ
جو کبھی ہوا ہی نہیں

یونہی اوس میں بھیگتے کچھ ان کہی باتوں پر لب خود بخود مسکرا دیتے ہیں۔ خیالات کے جھونکے ذہن کے دریچوں سے ٹکراتے ہیں اور کسی پھوار کی طرح لفظ لفظ قطرے کی مانند کہانی کے قالب میں ڈھل جاتا ہے۔

اور اب یہ کہانیاں موج رواں کی صورت اختیار کرچکی ہیں جن کی شوریدہ سری سنبھالنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ موسم کی ادا دیکھ کر میں نے بوند بوند روشنائی سے قلم کو تر کیا اور ورق کی ہتھیلی گیلی کردی جواب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کی وساطت سے لکھنے کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کی اجازت درکار ہے۔

ج: حبیبہ! آپ کا خط پڑھ کر ہی اندازہ ہوگیا ہے کہ آپ بہت اچھی کہانیاں لکھ سکتی ہیں۔ اچھا ہوتا کہ اجازت لینے کے بجائے ساتھ کہانی بھی بھجوا دیتیں۔ آپ ضرور لکھیں اچھی تحریروں کے لیے ہمارے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

ثوبیہ حسین۔۔۔ کھوٹہ

میں بہت سالوں سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ پر خط آج پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ مجھے خواتین ڈائجسٹ بہت بہت پسند ہے۔ میری دعا ہے کہ خواتین ڈائجسٹ خوب ترقی کرے آمین ثم آمین۔

ج: ثوبیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کو خواتین ڈائجسٹ پسند ہے' یہ جان کر خوشی ہوئی لیکن اتنا مختصر تبصرہ اچھا نہیں لگا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

شاہ بانو گل۔۔۔ سرگودھا

1988ء میں پہلی بار اپنی کزن کے گھر شعاع دیکھا اور اس کے بعد شعاع اور خواتین کی گرویدہ ہوگئی لیکن شرکت پہلی بار کررہی ہوں۔

اکتوبر کا خواتین ملا۔ سب سے پہلے فرحت اشتیاق کا ناول پڑھا یہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔ عنیزہ سید کا ناول بھی بہت اچھا ہے۔ سعد ضرور شہناز کا بیٹا ہوگا مگر اس کے علاوہ اور کوئی اندازہ فی الحال لگایا نہیں جاسکتا "میرے ہمدم" بہت ہلکی پھلکی لیکن مزے دار تحریر۔ عفت سحر کا شکریہ کیونکہ بہت خراب موڈ کے ساتھ پڑھنی شروع کی تھی لیکن پھر موڈ بہت خوشگوار ہوگیا۔ ویسے تو کوئی جھول نہیں تھا کہانی میں مگر اگر ہانیہ خود عباد کی اچھائیوں اور مخلصی کو پہچانتی تو زیادہ اچھا ہوتا بجائے اس کے کہ دوسرے اس کی غلط فہمیوں کو دور کرتے یا چھپ کر باتیں سننے سے دل صاف ہوتا۔

باقی رسالہ بھی اچھا ہے۔ خط لکھنے کی ایک وجہ فصیح باری سے ملاقات بھی ہے۔ کافی اچھے رائٹر ہیں لیکن بہت خودپسند محسوس ہوئے پوری ملاقات میں۔ بس میں ہی میں تھی آخر میں جب اپنی شادی کی ناکامی کا بتایا تو وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ کافی کوفت ہوئی ان کا انٹرویو پڑھ کر۔

ج: شاہ بانو' فصیح باری خان بہت اچھے رائٹر ہیں۔ ان کی تحریروں میں معاشرے کی تلخ سچائیاں نظر آتی ہیں اور یہ سچائی ان کے انٹرویو میں بھی نمایاں تھی' انہوں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے تمام سوالوں کے جواب دیے۔ کہیں بھی مصنوعی انکساری یا بناوٹ سے کام نہیں لیا' اس وجہ سے ہوسکتا ہے وہ آپ کو خودپسند محسوس ہوئے ہوں' ہمیں تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

روشن ہاشم۔۔۔ کراچی

سرورق بہت پسند آیا' کلر فل تھا۔ میں نے آج صرف اور صرف فرحت اشتیاق کے ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ کمال ہی کردیا فرحت نے اس سال تو ٹی وی چینل اور پھر خواتین ڈائجسٹ میں میں چھائی ہی رہیں۔ آخری قسط کا تو ابھی انتظار ہے لیکن اس ماہ یعنی اکتوبر کی قسط میں تو بھئی جان ہی پڑ گئی جیسے کیا زبردست آمنا سامنا ہوا ام مریم اور سکندر کا۔ ام مریم کے تھپڑ بالکل صحیح جگہ پر صحیح پچویشن میں پڑا۔ عین ٹائم پر جبکہ سکندر اور لیزا کی انگیجمنٹ ہونے والی تھی۔ سکندر کی زندگی میں پھر طوفان نے ہلچل مچادی۔

انجام تو خیر ناول کا اب سامنے ہی ہے۔ لیکن سکندر کا کردار۔۔۔ فرحت صاحبہ ذہنوں پر نقش رہے گا۔ آپ کا یہ ہیرو تو یادگار بن گیا ہے۔

اب اس سے آگے چلتے ہیں۔ کوہ گراں تھے ہم کی قسط بھی اچھی رہی۔ "میرے خواب لوٹا دو" نگہت عبداللہ کا بہت دلچسپ مرحلے میں آگیا ہے اور واضح ہوتا جارہا ہے کہ ہیرو شمشیر ہی ہوگا اریبہ کے ساتھ۔ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے ایک اور شان دار تحریر نگہت سیما کی "زمین کے آنسو" جس کی اس ماہ دوسری قسط تھی' بے حد متاثر کررہی ہے۔ "جو بچے ہیں سنگ" کے بعد یہ ناول نمبر لے کے جائے گا۔

عفت سحر طاہر "میرے ہمدم میرے دوست" مزا ہی آگیا۔ ہیرو ہیروئین دونوں کا کردار مزے دار لگا۔ اچھی تحریر تھی شروع سے آخر تک کہانی پر گرفت رہی' عباد کا کردار مضبوط تھا۔ اب کچھ افسانوں کی بات ہوجائے۔

راشدہ رفعت نانی کی ننھی نے جو سسرال میں کر دکھایا وہ قابل دید تھا۔ ملیحہ صدیقی کا "عجیب لوگ" تو بہت ہی عجیب لگا۔ کچھ کچھ سمجھ میں آیا باقی سر سے گزر گیا۔ عظمیٰ افتخار کا صراط مستقیم بہت ہی متاثر کن اور سبق آموز افسانہ تھا۔ کبھی کبھی سبق سکھانے کے لیے ایسی کہانیاں خواتین میں شامل ہوتی رہیں تو خوشی ہوتی ہے۔

سنہری شامیں' پس آئینہ' جونا میم بھی اچھے افسانے تھے اور ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں تھیں۔ ناولٹ ایک ہی

تھا جو اپنی جگہ خود بنا گیا۔ سمیرا حمید نے اپنے آپ کو انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ کردیا۔ خواتین ڈائجسٹ کی رائٹرز کی لائن میں۔ بہت اچھا لکھا۔ مہران کا کردار اچھا لگا۔
غزلیں تمام پسند آئیں۔ مستقل سلسلے سب ہی اچھے رہے۔ کرن کرن روشنی سے لے کر بیوٹی بکس تک شعروں کے انتخاب اچھا تھا۔
ج : پیاری روشن! آپ کا افسانہ پڑھ لیا۔ آپ نے بہت اچھے انداز سے لکھا لیکن موضوع بہت پرانا ہے۔ اس موضوع پر بہت بار لکھا جا چکا ہے آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ کچھ اور لکھیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

انجم فاروق۔۔۔ لاہور

اس بار خواتین ڈائجسٹ کا ٹائٹل آرائش دلہن اور گہرے پس منظر کے ساتھ بڑا ہی خوب صورت اور جاذب نظر تھا، چک بھی خوب بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اداریہ گفتگو فکر انگیز تھی۔ "عجیب لوگ" کمزور معلوم ہوئی اخباری خبر کی طرح واقعہ۔ کچھ خاص نہیں تھا۔ اس کے برعکس "سنہری شامیں" دلکش اور خوب صورت جملوں سے مزین اچھا لگا تصاویر کا معیار حسب معمول کافی اچھا تھا۔ فصیح باری خان سے ملاقات دلچسپ تھی۔ گفتگو میں ادبی افسانہ نگاروں کے علاوہ اشتیاق احمد کا بھی تذکرہ موجود تھا۔ جو اچھا لکھنے والے ہیں۔
پس آئینہ، جو نامیم نانی کی ننھی افسانے خوب تھے۔ نانی کی ننھی نفسیاتی نقطہ نگاہ سے اچھی کاوش تھی۔ کوہ گراں تھے ہم، میرے خواب لوٹا دو، زمین کے آنسو ناول اچھے چل رہے ہیں۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بھی معیاری کاوش ہے۔
"چلو جانے دو" میں کہانی گھر کے حصار سے باہر نکلی۔ لیکن تحریر متاثر کن نہیں۔ نمبر 88 مال روڈ پر دھماکا کس چیز کا تھا، وضاحت نہیں کی گئی۔

ج : پیاری انجم آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں۔ خواتین پر تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

ساجدہ حنا۔۔۔ کھاریاں

میں نے خواتین اس وقت شروع کیا جب میں میٹرک میں تھی، لیکن اب میرا بیٹا میٹرک میں ہے۔ اس کا میرا ساتھ اب تک ہے۔ پہلے خط لکھتی تھی، پھر شادی ہوگئی اور پھر بچے۔ زندگی اتنی مصروف ہوگئی کہ خط نہ لکھ سکی، لیکن خواتین کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ ہر حال میں میرے ساتھ رہا۔ آج دو سال کے بعد پھر خط لکھا ہے۔ اس کے سب سلسلے مجھے بہت پسند ہیں۔ سب لکھاری بہنیں بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اتنے سالوں میں بہت سی ایسی کہانیاں نظروں سے گزری ہیں جن کو بھولنا بہت مشکل۔ وہ اپنے نقش دل پر چھوڑ گئی ہیں، لیکن مجھے خاص طور پر عمیرہ احمد اور فرحت اشتیاق بہت پسند ہیں۔ ایک گزارش ہے آپی! ساجدہ حبیب سے کوئی ناول کی فرمائش کریں۔ بہت عرصہ ہوگیا ان کا کوئی ناول نہیں آیا اور ہاں! بہنوں سے گزارش ہے، آج کل جو حالات ہیں، ہمارے بچے اسلام سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ پلیز! ایسی کہانیاں بھی لکھا کریں، جن کو پڑھ کر بچے اپنے مذہب اور اسلام پر عمل کریں اور اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال کریں۔
ج۔ پیاری ساجدہ! زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتے گھر اور بچوں کی ذمہ داریوں کو نبھاتے خواتین کے ساتھ تعلق برقرار رہا۔ اس کے لیے شکریہ۔
ہماری مصنفین تو زیادہ تر اصلاحی تحریریں ہی لکھتی ہیں۔ لیکن ان کا اثر تب ہی ہوگا، جب بچوں کو مطالعہ کی عادت ہوگی۔

* قرۃ العین خرم * کی ڈائری سے

ہم ساری زندگی "جسم" کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ "جسم" کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ہمارا اصل، ہماری پہچان کا سفر "روح" سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر آکر ختم بھی ہوگا۔ منتو جمیل کی یہ نظم ہر روح کے نام جس نے اپنے اصل کی طرف لوٹنا ہے۔

بدن کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں
جہاں خدا سے کسی شب مکالمہ ہو گا
جہاں یہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہوگا
نہ دل کو تنگ کرے گی حصول کی خواہش
نہ کوئی خدشہ لاحاصل ستائے گا
ہمیں قبول نہ ہوگی صدائے نوحہ گری
کہ پھر وصول نہ ہوگی شکست سادہ دلی
نہ مرحلے وہ مشقت کے پیش جاں ہوں گے
کہ جن کے خوف سے لب ہنسنا بھول جاتے ہیں
نہ ایسی شب کی مسافت کا سامنا ہوگا
جہاں پہ کوئی چراغ وفا نہیں جلتا
لبوں کی شاخ پہ حرف دعا نہیں کھلتا
کہیں پہ کوئی مزاج آشنا نہیں ملتا
عذاب ترک مطلب سے بھی اب مکر جائیں
زمین کی قید سے نکلیں تو اس نگر جائیں
جہاں خدا سے کسی دن مکالمہ ہوگا
جہاں پہ روح کا بھی کوئی حق ادا ہوگا

* فرحانہ * کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر سلیم کوثر کی یہ غزل آپ کے ذوق کی نذر۔

خاموش فضا تھی، کہیں سایہ بھی نہیں تھا
اس شہر میں ہم سا کوئی تنہا بھی نہیں تھا

اونچی سی حویلی میں اترتا رہا شب بھر
کٹیا میں میری چاند نے جھانکا بھی نہیں تھا

امۃ الصبور

کس جرم میں چھینی گئیں مجھ سے میری آنکھیں
ان میں تو کوئی خواب سجایا بھی نہیں تھا

ہم جس کے حوالے سے ہوئے شہر میں بدنام
اس شخص کو ہم نے دیکھا بھی نہیں تھا

منصف میرا، مجرم کا طرف دار بنے گا
اس طرح تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا

* نمرہ، اقراء * کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر فرحت عباس شاہ کی یہ نظم آپ سب کی نذر۔

ہوائیں لوٹ آئی ہیں

اگرچہ میں سمجھتا تھا
کہ کوئی راستہ لوٹا نہیں کرتا
نہ دریا مڑ کے آتے ہیں
نہ شامیں واپسی کی سوچ پر ایمان رکھتی ہیں
اگرچہ میں سمجھتا تھا
کہ لمحے تو فقط آگے ہی بڑھتے ہیں
مگر افسردگی کی اس پرانی رت سے لگتا ہے
(جو میرے دل پہ چھائی ہے)
محبت میں تو کچھ بھی طے نہیں ہوتا
محبت کب کسی بھی طے شدہ رستے پہ چلتی ہے
مری افسردگی چپکے سے میرے کان میں کہتی ہے
فرحت سو رہتے کیا ہو
ذرا آنکھیں تو کھولو نیند میں ڈوبے ہوئے غم کی
ہوائیں لوٹ آئی ہیں

روشن حرف وہ سارے

فرخ فاطمہ

1۔ آج کل زیادہ تر نوجوان لڑکیاں پردے کو خاص اہمیت نہیں دیتیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اقبال کا یہ شعر لبوں کی زینت بن جاتا ہے۔

عشق بھی ہو حجاب میں، حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر!

آج کل ہمارے ملک کے جو حالات ہیں' وہ سب ہی جانتے ہیں۔ کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اعلا تعلیم یافتہ مگر نوکری سے محروم ہیں۔
اس صورت حال کو دیکھ کر زبان پر یہ شعر مچل جاتا ہے۔

زندگی کے مرکز موہوم پر
منتشر ہے نوع انسانی ہنوز

اس کے علاوہ اکثر یہ شعر لبوں پر رہتا ہے۔

لوگ مہنگائی کو روتے ہیں مگر حیرت ہے
کچھ بھی کہتے نہیں انسان کی ارزانی پر

2۔ فراق گورکھ پوری ایک منفرد سا نام ہے۔ اکثر ان کی شاعری میں محبوب سے گلے شکوے ہوتے ہیں۔
ان کی یہ غزل ان سے تعارف کی بنیاد بنی۔

کم ابھی اگرچہ رسم و راہ نہیں
اب وہ پہلی سی تری نگاہ نہیں

غم بھی ہے جزو زندگی لیکن
زندگی اشک اور آہ نہیں

موت بھی زندگی میں ڈوب گئی
یہ وہ دریا ہے جس کی تھاہ نہیں

ہے یہ دنیا عمل کی جولاں گاہ
مے کدہ اور خانقاہ نہیں

ہوں جو بھی تو ایک بات ہوں
عشق توفیق ہے گناہ نہیں

رات میں رنگ ہے وہی لیکن
وہ خم گیسوئے سیاہ نہیں

مرتبہ دیکھ خاک آدم کا
یہ مقامات مہر و ماہ نہیں

یہ مساوات عشق دیکھ فراق
امتیاز گدا و شاہ نہیں

3۔ اف' کیا سوال پوچھ لیا آپ نے' اجی ہمارے ایسے نصیب کہاں لیکن بہت سوچنے پر یاد آرہا ہے کہ جب میں نے انگلش کے تقریری مقابلہ میں تحصیل لیول پر فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی تو میری ایک کلاس فیلو نے ان الفاظ میں مجھے سراہا تھا۔

ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے

4 ۔ بہادر شاہ ظفر کی یہ غزل مہدی حسن نے بے حد پُرسوز انداز میں گائی ہے۔

بات کرنی مجھے مشکل ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج تیرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل! کبھی ایسی تو نہ تھی

تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عکس رخسار نے کس کے ہے تجھے چمکایا
تاب تجھ میں مہ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفر سے ہر بار
خو تیری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

☆

صورت گر کچھ خوابوں کے

امت الصبور

ادب کی ہر صنف میں عورت کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی وفا شعاری' ایثار قربانی' نیکی' مکاری اور حیلہ سازی کو کہانیوں کا موضوع بنایا گیا' لیکن یہ سب مرد کے نقطہ نظر سے لکھا گیا' کیونکہ عورت کو تو اجازت ہی نہ تھی کہ وہ اپنے جذبات واحساسات کو زبان دے سکے۔ کچھ خواتین نے لکھا بھی تو اپنا نام شائع کرانے کی ہمت نہ کرسکیں۔ "جیسے گوڈر کا لال" جو والدہ افضال علی کے نام سے شائع ہوا۔

اردو کا پہلا ناول "اصلاح النساء جو 1894ء میں منظر عام پر آیا' اس کی مصنفہ رشیدۃ النساء بیگم تھیں۔ یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد بے شمار خواتین سامنے آئیں۔ خواتین نے زیادہ تر گھریلو زندگی اور گھر سے متعلق مسائل کو موضوع بنایا۔ ابتدا میں زیادہ تر اصلاحی تحریریں لکھی گئیں۔ پھر رفتہ رفتہ خواتین رومانوی تحریروں کی طرف آگئیں۔

رضیہ بٹ اسی رومانوی تحریک کی نمائندہ تھیں۔ 1972ء میں خواتین ڈائجسٹ کا آغاز ہوا تو خواتین کے لکھنے والوں میں ان کا نام نمایاں تھا۔ ان کے افسانے ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔

رضیہ بٹ سے میرا تعارف رضیہ سجاد ظہیر کے ذریعے ہوا' کچھ یوں تھا کہ رضیہ سجاد ظہیر کا ناول "سمن" میں نے پڑھا تو مجھے بہت پسند آیا۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "اللہ کی مرضی" اور "اونچ نیچ" پڑھ چکی تھی۔ میں نے ان کی دوسری کتابیں منگوائیں اور جس سے منگوائی تھیں' اس نے "نائلہ" اور "صاعقہ" لا کر تھما دیے اور کہا۔

"رضیہ سجاد ظہیر نام کی تو کوئی مصنفہ نہیں ہیں۔ رضیہ بٹ ہیں' ہوسکتا ہے وہ شادی سے پہلے رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے لکھتی ہوں۔"

اس وقت تو کتاب ملنا ہی بڑی بات تھی (کتاب ملنا میرے لیے آج بھی بڑی بات ہے) مصنف کے نام پر زیادہ تردد نہ کیا۔ لیکن نائلہ اور صاعقہ نے مجھے زیادہ متاثر نہ کیا۔

کیونکہ ذہن پر رضیہ سجاد ظہیر کی تحریروں کا تاثر تھا' جو ترقی پسند تحریک سے متاثر تھیں' جبکہ رضیہ بٹ ان سے یکسر مختلف انداز کی مصنفہ تھیں۔

ان کے ناول کے کردار ایک خیالی دنیا کے باسی تھے' جہاں غم محبت کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ اس دور میں زیادہ تر خواتین کچی عمر کے خوابوں' گھریلو رسم و رواج اور عشق ومحبت کو موضوع بنا کر لکھ رہی تھیں جو نوعمر لڑکیاں بڑے شوق سے پڑھتی تھیں۔ خوابوں کی دنیا اور رومان بھی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اردو کے ایک بڑے ادیب کا کہنا ہے۔

"ہم افسانہ اس لیے پڑھتے ہیں کہ اس میں خواب ہوتے ہیں۔"

اس حوالے سے دیکھا جائے تو رضیہ بٹ کامیاب ترین مصنفہ ٹھہرتی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے ناول ملک اور بیرون ملک بے پناہ مقبول ہوئے۔ ان کے ناول نائلہ' صاعقہ اور انیلا پر فلمیں بھی بنائی گئیں جو بے حد کامیاب ہوئیں۔ ان کا شمار خواتین کی پسندیدہ ترین مصنفین میں ہوتا تھا۔

ابتدائی دور میں رضیہ بٹ رومانوی تحریک کے زیر اثر نظر آتی ہیں' لیکن آہستہ آہستہ وہ حقیقت نگاری کی طرف بڑھتی گئیں۔ خصوصاً" ان کے افسانے پڑھے تو ایک بالکل مختلف انداز نظر آیا۔ بلاشبہ انہوں نے بہت اعلا معیار کے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خواب نہیں' زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں۔ نچلے طبقے کی عورت کے نفسیاتی اور جذباتی مسائل' غربت' معاشرے کی اونچ نیچ سے پیدا ہونے والے مسائل ان کے افسانوں کا موضوع بنے۔ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا ان کا افسانہ مجھے آج بھی یاد ہے' نچلے طبقے کی لڑکی جو اونچے اور بڑے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے کچھ اوپر درجہ حاصل کرلیتی ہے۔ وہاں وہ ان کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھتی ہے۔ جب شادی کے بعد اپنی دنیا میں لوٹتی ہے تو اس دنیا سے سمجھوتا کرنے میں اسے قدم قدم پر دھچکے لگتے ہیں۔ انہوں نے متوسط طبقے کی منافقتوں کا پردہ بھی چاک کیا۔ رشتے ناتوں کی پیچیدگیاں' متوسط طبقے کی عورت جو بالائی طبقے میں شامل ہونے کی خواہش میں دوہرے مسائل کا شکار ہے۔ ایک طرف متوسط طبقہ کی روایتی بزدلی اور شرافت' دوسری طرف دولت کی چکاچوند' اس کشمکش میں جو منافقت جنم لیتی ہے' رضیہ بٹ نے اسے بڑی خوبی سے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت فسادات ہندوستان اور پاکستان کے لیے بہت بڑا المیہ ہیں۔ فسادات کے موضوع پر چند بڑے ادیبوں کے سوا سب نے بڑے سطحی انداز میں لکھا۔ ترقی پسند تجزیہ پیش کرنے کی کوشش میں صرف نفرت ختم کرنے اور انسانیت کے راگ الاپتے رہے۔

رضیہ بٹ کا ناول "بانو" فسادات کے موضوع پر ہے اور اسے بلاشبہ ان کا شاہکار ناول کہا جاسکتا ہے۔ ایک عورت کے جذبات واحساسات جو ممتا اور نفرت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ جس کی روح اور جسم جدا ہو چکے ہیں اور وہ ایک زندہ لاش کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس مسلمان لڑکی کا درد و کرب جو ایک سکھ کے

بچے کو جنم دیتی ہے۔ فسادات کے اس المیہ کو رضیہ بٹ نے بڑی خوب صورتی سے لکھا۔ امرتا پریتم کا ناول "پنجر" بھی اسی موضوع پر ہے۔ بیدی کا افسانہ "لاجونتی" میں لیکن رضیہ بٹ کی بانو کا کردار اس لحاظ سے زیادہ مضبوط نظر آتا ہے کہ اس نے سمجھوتے کی راہ نہیں اپنائی۔ 76ء میں خواتین ڈائجسٹ میں رضیہ بٹ کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ اپنے تمام ناولوں میں مجھے سب سے زیادہ یہی ناول پسند ہے۔

رضیہ بٹ 1924ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئیں۔ بعد میں وہ پشاور منتقل ہوگئیں۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ تحریک پاکستان مسلم لیگ کی زنانہ برانچ ان کے گھر سے شروع ہوئی تھی۔ انہوں نے سرحد جیسی جگہ پر مسلم لیگ کے لیے کام کیا' جہاں لڑکیوں کے لیے پردہ کی سختی سے پابندی تھی۔ وہ اس وقت رضیہ نیاز تھیں۔ 46ء میں جب ان کی شادی ہوگئی تو ان تمام سرگرمیوں کو خیرباد کہہ

دیا۔

1940ء میں لکھنے کا آغاز کیا۔ انہوں نے لکھنے کی ابتداء ڈرامے سے کی۔ پہلا ڈراما آل انڈیا ریڈیو پشاور سے نشر ہوا' پھر دہلی' کلکتہ اور ممبئی سے نشر ہوا۔

پہلا افسانہ "لغزش" 1940ء میں ماہنامہ حور میں شائع ہوا۔ ان کا ناول "نائلہ" پہلے افسانہ تھا۔ جسے انہوں نے ناول کے قالب میں ڈھالا۔ لکھنے کے سلسلے میں ان کے والد نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ انہوں نے پچاس ناول اور ساڑھے تین سو کے لگ بھگ افسانے تحریر کیے' لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں انہیں اپنے شوہر کا تعاون قطعی حاصل نہیں تھا۔ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا۔

"وہ مجھے اپنے سامنے لکھنے بھی نہیں دیتے۔ وہ برداشت ہی نہیں کرسکتے کہ میں ان کے سامنے کوئی خط بھی لکھوں۔ بعض اوقات مجھے غصہ بھی آتا ہے کہ وہ میرے ناول کیوں نہیں پڑھتے۔ شاید اس کی وجہ ان کی مصروفیات ہیں اور کچھ ان کی عادت کہ وہ چاہتے ہیں کہ باہر سے آکر تھکے ہوئے ذہن کو سکون دینے کے لیے وہ زیادہ وقت میرے ساتھ گزاریں۔"

رضیہ بٹ کی تحریریں سلاست' روانی اور صاف ستھری زبان میں ہیں۔ معاشرے کی شکست و ریخت' بدلتی اقدار اور مادیت پرستی کے رحجان کو بڑی کامیابی سے لکھا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خواتین کی بڑی تعداد کو مطالعہ کی طرف راغب کیا۔ ان کے ناول پاکستان ہی میں نہیں' بیرون پاکستان بھی بے حد مقبول ہوئے۔ خواتین کی ذہنی تربیت میں ان کا بہت بڑا کردار ہے۔ انہوں نے خواتین کی ازدواجی' معاشرتی زندگی کو تلخ و شیریں مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا۔

رضیہ بٹ ناول اور افسانہ کی دنیا کا ایک بڑا نام تھیں۔ ان کی تحریریں زندگی کا آئینہ ہیں جو عرصہ دراز تک

خبریں گوسپ

تبصیر نشاط

شادی مبارک

ڈراما سیریل "تنہائیاں" کو بنے ہوئے پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے' مگر لوگ آج بھی اس سیریل کے مداح ہیں اور اس سیریل کے کردار "قباچہ" کے بھی۔ قباچہ کا کردار کرنے والے بہروز سبزواری کو دیکھیں تو ان کے چہرے پر آج بھی بچوں جیسی معصومیت نظر آتی ہے۔ لیکن جناب! انہی بچوں جیسی معصومیت والے بہروز سبزواری کا اکلوتا بچہ بھی اتنا بڑا ہوگیا ہے کہ وہ خود دولہا بن گیا ہے۔

شہروز سبزواری خود بھی اداکاری سے وابستہ ہیں۔ ان کا نکاح معروف اداکارہ سائرہ یوسف سے چند روز قبل انجام پایا ہے۔ ان دونوں کے بیچ انڈر اسٹینڈنگ نے "کینٹین کہانی" میں جنم لیا تھا۔ یہ ان دونوں کے کیریر کا پہلا ڈراما تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ کام کیا تو دونوں ہی کے ذہن میں خیال آیا کہ یہی تو ہے "میرا نصیب"۔ پھر جب ڈراما سیریل "تنہائیاں" کے سیکوئیل میں ایک ساتھ کام کیا تو دونوں ہی نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہ تنہائیاں ختم ہو جانی چاہئیں۔ یوں خیر سے دونوں نے نکاح کرلیا۔ بہروز سبزواری' سفینہ بہروز اور سائرہ یوسف کے اہل خانہ بھی اس نکاح سے بے حد خوش ہیں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ان سب کی خوشیاں قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

خواب

گاڑیوں پر واردات کرنے والے اکثر جرائم پیشہ

افراد واردات کے دوران اپنے ایک ساتھی کو گاڑی ہی میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ساتھی گاڑی اسٹارٹ رکھتا ہے تاکہ واردات کے بعد فرار ہونے میں کوئی دقت نہ ہو۔ لیکن جناب! ایک لڑکی ایسی بھی ہے، جو اپنے ساتھیوں سے کہتی ہے کہ ”گاڑی اسٹارٹ رکھنا۔ میں ابھی بیل بجا کر آتی ہوں۔“ بچوں جیسا شوق رکھنے والی یہ لڑکی شوبز کی دنیا کی ”ایک نئی سنڈریلا“ ہے ’مایا علی‘۔ مایا بے حد شرارتی واقع ہوئی ہیں۔ انہیں لوگوں کے گھروں کی اطلاعی گھنٹیاں بجا کر بھاگ جانے کا شوق ہے، سو وہ اپنے ساتھیوں کو گاڑی اسٹارٹ رکھنے کا کہہ کر اپنا یہ شوق اکثر و بیشتر پورا کرتی رہتی ہیں۔ مایا علی نے اداکاری کی دنیا میں ابھی قدم رکھا ہے۔ وہ ایک نجی چینل کی ڈراما سیریل ”ایک نئی سنڈریلا“ میں مینا کا مرکزی کردار ادا کر رہی ہیں۔ یہ سیریل کہنہ مشق مصنفہ فائزہ افتخار نے تحریر کی ہے۔ اس سیریل میں کام کرنے سے قبل مایا علی نے ایک نیوز چینل میں بھی کام کیا ہے۔ مایا علی کو صرف گھروں کی بیل بجا کر بھاگ جانے ہی کا شوق نہیں، بلکہ ان کا دعوا ہے کہ انہیں خطرناک حد تک سچ بولنے کی عادت بھی ہے۔ وہ جھوٹ بالکل بھی نہیں بول سکتیں۔ (ایں۔۔۔ تو نیوز چینل میں کیا کرتی تھیں؟)

”ایک نئی سنڈریلا“ میں یہ پیغام دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور خواب دیکھے ضرور جائیں، مگر ان میں رہا نہیں جائے۔ گویا اس کے ذریعے کھیل ہی کھیل میں نوجوان نسل کی تربیت کا فریضہ بھی سرانجام دیا جا رہا ہے۔ اس سیریل کے حوالے سے مایا علی نے ڈھیر سارے خواب دیکھے ہیں۔ وہ اپنے خوابوں میں محض رہتی ہیں یا اسے پورا کرنے میں کامیاب رہتی ہیں، یہ تو سیریل دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔ گڈ لک مایا!

بے وقت

یہ گئے دنوں کی بات ہے، جب پی ٹی وی ہر گھر میں نہایت ذوق و شوق سے دیکھا جاتا تھا۔ بڑے بڑے نامور مصنفین اور اداکار اس سے وابستہ ہونا فخر سمجھتے تھے۔ اس دور میں معروف ڈراما نگار فاطمہ ثریا بجیا نے پی ٹی وی کو کئی کامیاب سیریلز دی تھیں۔ وہ اپنی ہر سیریل کے لیے نئی ہیروئین خود تلاش کیا کرتی تھیں۔ خاص بات یہ ہوتی تھی کہ ان کی ہر ہیروئین سیریل کے بعد شوہر کو پیاری ہو کر اداکاری کو خیرباد کہہ دیا کرتی تھی۔ بجیا کی سیریل ”عروسہ“ سے شوبز میں قدم رکھنے والی مشی خان نے اس سیریل کے بعد بھی کافی کام کیا۔ وہ شوہر کو تو پیاری نہیں ہوئیں، تاہم فضاؤں کو پیاری ہو گئیں یعنی ایئر ہوسٹس بن گئیں۔ فضائی میزبان بن کر انہوں نے اداکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ خاصے طویل عرصے کے بعد وہ شوبز کی دنیا میں دوبارہ آ گئیں۔ لیکن اپنے مزاج شاید وہیں کہیں فضاؤں ہی میں چھوڑ آئیں، تبھی تو اب وہ صرف ٹی وی ڈراموں ہی میں نہیں، بلکہ فلموں میں بھی کام کرنا چاہتی ہیں۔ وہ بھی ہیروئین کا رول۔۔۔ ساتھ ہی یہ فرمائش بھی کر دی کہ فلم اچھی ہونی چاہیے۔ شوبز کے ناقدین اسے بے وقت کی راگنی قرار دے رہے ہیں۔ ان کے خیال میں

مشی خان ہیروئین کے نہیں، بلکہ ہیروئین کی ماں کے رول میں زیادہ جچیں گی۔ (ذرا تصور کریں! صائمہ فلم کی ہیروئین اور مشی خان ان کی ماں۔۔۔ توبہ کریں جی! جب صائمہ، میرا اور لیلیٰ وغیرہ ہیروئین کے کردار میں آ سکتی ہیں تو مشی خان کیوں نہیں۔۔۔؟)

یہ بیان کالمانہ

ماضی کا شاندار شہر کراچی آج ناسور بن چکا ہے اور اس ناسور سے آہستہ آہستہ خون اور پیپ ٹپک رہی ہے اور کوئی اس ناسور پر پٹی رکھنے کے لیے تیار نہیں ملک کے تمام حکمران تماش بینوں کی طرح اس برباد ہوتے شہر کا نظارہ کر رہے ہیں، جسے کبھی شہروں کی دلہن کہا جاتا تھا۔

(جاوید چودھری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

کوئی مانے نہ مانے لیکن قرینے صاف بتا رہے ہیں کہ ملالہ پر حملہ انجینئرڈ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ منصوبہ اپنی سمت میں بڑھ ہی جاتا، لیکن حملے کے فوراً بعد جو ”پھرتیاں“ دکھائی گئیں انہوں نے ”انجینئروں“ کی انجینئرنگ سے پردہ اٹھا دیا۔ میڈیا کے لوگ دنیا بھر میں بہت زیادہ ذہین ہوتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں اتفاق سے کچھ زیادہ ہی ذہین ہیں۔ وہ انجینئرنگ کو سمجھ نہ سکے اور بہاؤ میں بہہ گئے۔

(عبداللہ طارق سہیل۔۔۔ وغیرہ وغیرہ)

17 اکتوبر، حکیم سعید کا یوم شہادت ہے۔ خدا جانے ہم محسن شناس کب ہوں گے۔ ایسے شخص کا قتل انسانیت کا قتل ہے۔ پاکستان کی بدنصیبی ہے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو بہت کچھ کر جاتے۔

(عدنان اشرف ایڈووکیٹ۔۔۔ مسیحا)

کون یہ نہیں جانتا کہ ایسا صرف پاکستان میں ہوا کہ اس کے ایک ”حکمران“ (مشرف) نے پاکستان کے شہریوں کو امریکا کے ہاتھوں بیچنا شروع کر دیا اور یہ ”بے غیرتی“ اس کے لیے اتنی قابل فخر تھی کہ اپنی واحد کتاب میں بھی اس کا ذکر کر دیا جو انہیں ملامت کے بجائے

کتاب سے نکالنا پڑا۔

(عبدالقادر حسن۔۔۔ غیر سیاسی باتیں)

کوئن الزبتھ اسپتال سے ملالہ کی جو تصویر شائع ہوئی اس نے کئی سوالوں کو جنم دیا۔ ملالہ کی ایک تصویر میں دائیں جانب زخم دکھایا گیا۔ دوسری تصویر میں بائیں جانب۔ ایک تصویر میں نہ صرف زخم سرے سے غائب ہے، بلکہ ملالہ کے بال بھی پوری طرح موجود ہیں یہ سب کیا ہے؟

(عارف بہار۔۔۔ صدائے حریت)

نواز شریف صاحب کو ایٹمی پروگرام بہت عزیز تھا۔ ایک بار مدینہ منورہ میں اوبرائے ہوٹل میں ڈنر کے دوران میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے لاہور میں ملنے کی دعوت دی۔ یہ ملاقات جاتی امرا میں ہوئی۔ باتوں باتوں میں، میں نے ان سے کہا، میاں نواز شریف نے ایک نہایت بدکردار شخص (مشرف) کو آرمی چیف بنایا ہے۔ یہ ان کا تختہ الٹے گا۔

(ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا ایک کتاب پر تبصرہ)

خواتین اور باورچی خانے کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ باورچی خانے میں رونق ہو تو گھر کے افراد خوش نظر آتے ہیں۔ ایک صاف ستھرا کچن، خاتون خانہ کی خوش سلیقگی کا مظہر ہے۔
خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے ہم اس ماہ کے کچن کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں، سوالات یہ ہیں۔

1۔ کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ "پسند ناپسند، غذائیت، گھر والوں کی صحت"۔
2۔ گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں، کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کر سکیں۔
3۔ کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے، آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟
4۔ صبح کا ناشتہ ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔
5۔ گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جارہا ہے، آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے (2) کسی کی سالگرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔
6۔ کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟
7۔ اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟
8۔ کچن کی کوئی ٹپ، جو دینا چاہیں؟

ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلہ میں شرکت کر سکتی ہیں، ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔

آپ کا باورچی خانہ

مسرت شاہین

کھانا پکانا ایک فن یعنی آرٹ بھی ہے اور انگریزی والا فن یعنی مزا بھی ہے۔ لوگ جب اپنے مشاغل کے بارے میں لکھتے ہیں تو کہیں کوکنگ کو نہیں گنتے۔ حالانکہ 85 فیصد ہماری خواتین کا مشغلہ کھانا پکانا ہی ہوتا ہے۔

1 ۔ خیر! جوابات کی طرف آئیں تو پہلا سوال باذوق اور بدذوق، دونوں لوگوں کے لیے بہت خاص ہے۔ میں چونکہ پہلی قسم کے لوگوں سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس لیے برملا کہہ سکتی ہوں کہ پہلے غذائیت، پھر ذائقہ۔ گھر میں ماشاء اللہ ہر عمر کے افراد ہیں۔ اس لیے کھانا پکاتے وقت، مینو ترتیب دیتے ہوئے غذائیت کو پہلے نمبر پر رکھنا ہوتا ہے۔ اچھے ذائقے اور مزے کے لیے بھی خاص تناسب مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

2 ۔ ہمارے ہاں اکثر مہمان بتا کر آتے ہیں، اس لیے کھانے پر اہتمام کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے اور من مرضی کا کام ہوجاتا ہے۔ بغیر اطلاع کے خاص رشتہ دار ہی آتے ہیں۔ اس لیے حفظ ماتقدم کے طور پر کچھ نہ کچھ بنا کر رکھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ جو کچھ بھی بنا ہو، اس کے ساتھ رائتہ، سلاد اور کباب وغیرہ رکھ کر سلیقہ دکھالیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات مہمان خاص ہوں اور اچانک ہی آجائیں تو میں جھٹ پٹ چکن وائٹ قورمہ تیار کرلیتی ہوں، جس کی ترکیب مندرجہ ذیل ہے۔

چکن وائٹ قورمہ

اجزاء:

چکن	ایک کلو
پیاز	ایک بڑے سائز کی
لہسن، ادرک پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھی پیالی
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ	دو چائے کے چمچے
ہری مرچ، ہرا دھنیا	گارنش کرنے کے لیے
گھی	آدھی پیالی

ترکیب:

طریقہ کچھ یوں ہے کہ چکن دھو کر رکھ لیں۔ چولہا جلائیں اور کھلے منہ کا برتن اس پر رکھ کر پیاز ڈالیں اور ساتھ دو گلاس پانی ڈال لیں۔ تھوڑی دیر پکنے کے بعد اس میں لہسن، ادرک اور نمک شامل کریں اور ساتھ ہی چکن ڈالیں۔ پیاز کو سنہرا نہیں کرنا ہے۔ جب چکن گل جائے اور پانی خشک ہوجائے تو اس میں تیل، گھی ڈال کر بھونیں۔ دہی ڈالیں اور بھونتے رہیں۔ جب دہی کا پانی بھی خشک ہوجائے تو اس میں سفید مرچ ڈالیں۔ (کالی مرچ ہرگز نہ ڈالیں، ورنہ جناب آپ اصل والا وائٹ قورمہ نہیں کھاسکیں گے۔ یہ صرف وائٹ پیپر سے ہی بنتا ہے۔)

اب اس میں کریم شامل کریں اور دم لگادیں۔ دم آنے پر صرف دو سے تین منٹ پکائیں اور ہری مرچ، ہرے دھنیے کے ساتھ گارنش کریں۔ کم ترین وقت میں تیار ہونے والا قورمہ ریڈی ٹو ایٹ ہے۔ جی۔۔۔۔ جی! ایسا ذائقہ پہلے چکھا ہے؟ نہیں نا! نان اور تندوری روٹی کے ساتھ کھائیں۔

3 ۔ بات یہ ہے کہ خاتون خانہ کا کچن گھر کا وہ کونہ ہوتا ہے، جو ایک طرح سے اس کی راجدھانی ہوتی ہے۔ جس میں وہ ایک حکمران کی طرح حکومت کرتی ہے۔

اپنی مرضی چلاتی ہے۔ (میری طرح۔ میں بھی صرف کچن میں حکم چلا سکتی ہوں۔ باقی جگہ کسی اور کا چلتا ہے۔ سمجھ گئے نا جی۔)

کچن کی صفائی روزانہ تو ہوتی ہی ہے، لیکن میں ماہانہ صفائی بھی خاص اہتمام سے کرواتی ہوں اور کرتی بھی ہوں۔ ہمارا کچن لاؤنج کے ساتھ متصل ہے۔ جس میں شیلف اور الماریاں ہیں۔ ٹی وی لاؤنج کے ساتھ ہونے سے ٹی وی بھی دیکھو اور کام بھی کرو۔ اس لیے مزے سے کام کرتے جاؤ اور بکھیڑا سمیٹتے جاؤ۔ صبح کا آغاز برتنوں کی اٹھا پٹخ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ فرحت صاحبہ چھوٹی بہن برتنوں کو بہت زور سے رکھتی اور اٹھاتی ہے۔

4 ۔ ناشتا ہمارے ہاں ایک خاص قسم کی اہمیت کا حامل ہے۔ ہم تقریباً سب ہی گھر سے باہر جاتے ہیں۔ صرف والدہ گھر میں رہتی ہیں تو ناشتا بھرپور اور ورائٹی پر مشتمل ہوتا ہے۔ بچے دودھ رس، میاں جی پراٹھا، رات کا سالن اور دودھ پتی، بھائی بریڈیا پورج اور باقی خواتین نان، چاول اور جو مل جائے، کیونکہ اپنا ناشتا بنانے کا ٹائم نہیں رہتا۔ لیکن اتوار کو تو بہت خاص

ناشتے کا اہتمام ہوتا ہے۔

سری پائے' ایک اتوار' ایک اتوار نہاری' مرغ چنے اور پائے' حلوہ پوری ہر اتوار کو بچے شوق سے کھاتے ہیں۔ یہ تمام کھانے بیشتر اوقات گھر پر تیار کیے جاتے ہیں۔ میاں جی میرے بڑے چٹورے ہیں۔ وہ پراٹھا کھا کر جلدی اوب جاتے ہیں۔ اس لیے پھر فرنچ ٹوسٹ' پھر ملائی سلائس اور آخر میں آلو کے پراٹھے' چکن کے پراٹھے۔

چکن پراٹھے کی ترکیب لکھ رہی ہوں جو کہ بہت جلدی اور خستہ بنتے ہیں۔

اجزاء :

آٹا اور میدہ	آدھی آدھی پیالی مکس کرلیں
چکن بون لیس	ایک پیالی ابال کر تار تار کرلیں
نمک' کالی مرچ	حسب ذائقہ
زیرہ' سرخ مرچ	حسب ذائقہ
پیاز	آدھی کٹی ہوئی
ہری مرچ	سات سے آٹھ عدد
گھی	تلنے کے لیے

ترکیب :

چکن ابال کر اس میں گھی اور آٹے کے علاوہ ہر چیز مکس کرلیں' اور اس کے بعد آٹا' میدہ ملا کر ایک چمچہ گھی ڈال کر گوندھ کر رکھ لیں۔ ہلکے ہاتھ سے مسل کر آٹا گوندھنا ہے۔ اس سے پراٹھے خستہ اور نرم بنیں گے۔ پھر پیڑا بنا کر روٹی بیل لیں۔ اس میں آمیزہ بھر لیں اور دوسرا پیڑا بیل کر اس کے اوپر رکھیں۔ پراٹھا بنا کر توے پر ڈالیں اور دونوں طرف گھی لگا کر سرخ کریں۔ پودینے اور ہری مرچ کی چٹنی کے ساتھ نوش کریں اور مجھے دعائیں دیں۔

5 - باہر جا کر کھانا کھانا میرا شوق کم ہے' لیکن میاں جی کا زیادہ۔ ہم تمام اہم مواقع پر باہر ضرور جاتے ہیں۔ زیادہ تر باربی کیو اور روسٹ کھاتے ہیں۔ سردیوں میں مچھلی کھانے باہر جاتے ہیں۔ گھر پر کھانا اچھا لگتا ہے' کیونکہ صاف ستھرا اور کم خرچ ہوتا ہے۔ باہر صرف چینج کے لیے جاتی ہوں۔ ذاتی طور پر زیادہ پسند نہیں ہے۔ میں ہر طرح کے کھانے پکا لیتی ہوں' اس لیے گھر پر کھانا ترجیح دیتی ہوں۔

6 - کھانا انسان کی فطری ضرورت ہے۔ ہر جان دار کھا کر ہی زندہ ہے' لیکن انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے' اس لیے وہ ہر موقع اور ہر لمحہ کشید کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کے رنگوں کو موسم کے ساتھ اس طرح منسلک کرلیتا ہے کہ زندگی خوب صورت ترین لگتی ہے۔ ہم بھی کھانا موسم کے مطابق کھاتے ہیں اور لطف لیتے ہیں۔ سردیوں میں نہاری' پائے وغیرہ اور گرمیوں میں ہلکا پھلکا اور کڑھی پکوڑا چاول کے ساتھ۔ بارش میں پوڑے' پھورے اور پکوڑے۔ (آہا! مزا آگیا)

7 - ٹپس تو بہت سی ہیں' لیکن میں کچن کے حوالے سے ایک ٹپ نہیں' دو دینا چاہوں گی۔

1 - شیلف وغیرہ میں کاکروچ سے بچنے کے لیے بورک پاؤڈر ڈال کر اوپر خاکی کاغذ بچھائیں تو کاکروچ بھاگ جاتے ہیں۔

2 - فریج میں سے مخصوص بو ختم کرنے کے لیے کھانے والا سوڈا تھوڑی سی مقدار میں کھلی چھلنی میں رکھ دیں۔ مخصوص مہک ختم ہوجائے گی۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گرلڈ کوفتے

اجزا :

گوشت	ایک کلو
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
پسی سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	پانچ عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

گوشت کے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے بہت سارے پانی میں چولہے پر چڑھا دیں۔ ساتھ ہی زیرہ' کالی مرچ اور نمک بھی ڈال دیں۔ گوشت کو اتنا پکائیں کہ جب اسے گھوٹیں تو وہ قیمے کی طرح باریک ہو جائے۔ ہرا دھنیا اور پیاز کو چوپ کرکے (اور اگر آپ آدھی گٹھی پارسلے بھی شامل کرلیں تو زیادہ اچھا رہے گا) گوشت کے آمیزے میں ملائیں اور سیخ کباب کا شیپ دے کر چاہیں تو فرائی کرلیں' بیک کرلیں یا کوئلوں پر سینک لیں۔

سنہرے ہو جائیں تو رائتے اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

کشمیری سیخ کباب

اجزا :

قیمہ	ایک کلو

انڈے	دو عدد
سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کالا زیرہ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
پودینہ	ایک چوتھائی گٹھی
ہرا دھنیا	ایک چوتھائی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک بڑے برتن میں قیمے میں سرخ مرچ اور نمک ملا کر فریج میں رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد دیگر تمام مسالے انڈے سمیت قیمے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور چھ انچ لمبے کباب کا شیپ دے کر سیخ پر چڑھا دیں۔ ٹھنڈے پانی میں ہاتھ گیلے کر کے کباب بنائیں گی تو نفاست سے بنیں گے۔ کوئلوں پر سینکیں۔ درمیان میں تیل لگاتے جائیں۔ براؤن ہو جائیں تو اتار لیں۔

لچھے دار پیاز اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

باربی کیو بوٹی

اجزا :

گوشت	ایک کلو
کچا پپیتا	دو کھانے کے چمچے
ادرک لہسن پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
سرخ مرچ	دو چائے کے چمچے
کباب چینی	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

انڈر کٹ بیف کی تقریباً" دو انچ کی بوٹیاں بنوالیں۔ دھو کر اچھی طرح خشک کرلیں۔ دہی میں کچا پپیتا پیس کر ملائیں۔ ساتھ ہی سرخ مرچ، کباب چینی (پیس کر)

لہسن ادرک پیسٹ، نمک اور دو کھانے کے چمچے گھی لگا کر رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد کوئلوں پر سینک لیں۔ بیک بھی کر سکتی ہیں۔

کیچپ اور سالاد کے ساتھ پیش کریں۔

مغز بھنا مسالا

اجزا :

مغز	ایک عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
پیاز	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
دہی	آدھا کپ
ہرا دھنیا	ایک چوتھائی گٹھی
ہری مرچ	چار عدد
کٹی سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چٹکی
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

مغز کو دھو کر ہلدی، نمک اور آدھا چمچہ لہسن پیسٹ ڈال کر ابال لیں۔ ایک پتیلی میں تیل گرم کر کے باریک کٹی ہوئی پیاز سنہری کریں۔ بقیہ لہسن ادرک پیسٹ، کٹی مرچ، نمک اور باریک کٹے ہوئے ٹماٹر ڈال کر بھونیں، پھر ابلا ہوا مغز ٹکڑے کر کے ڈال دیں۔ دہی ڈال کر بھونیں۔ تیل اوپر آجائے تو بھنا ہوا زیرہ، گرم مسالا دھنیا اور ہری مرچ ڈال دیں۔ روغن اوپر آنے تک ہلکے ہاتھ سے چمچہ چلائیں۔ پھر پلیٹ میں نکال کر گرم گرم چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

انسان کو زندگی میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ کوشش فرض ہے۔ لیکن اپنے طور پر کوئی امید باندھ لینا کوئی بات فرض کرلینا کسی صورت درست نہیں۔ کیونکہ اگر انسان کسی معاملہ میں پوری امید باندھ لے اور خدانخواستہ اس معاملے میں ناکامی ملے تو زندگی بڑے عذاب سے گزرتی ہے۔ اور انسان ذہنی طور پر پریشان ہوجاتا ہے۔ دنیا میں ہر آدمی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی معاملے میں ناکام ضرور ہوتا ہے۔ کوئی شخص یہ دعوا نہیں کرسکتا کہ وہ ہر لحاظ سے خاطر خواہ اور مکمل ہے جیسے جسمانی صحت میں کوئی شخص کامل نہیں۔ اسی طرح ذہنی صحت میں بھی کوئی آدمی کمال کا دعوا نہیں کرسکتا۔ جسمانی بیماری کی تشخیص ہوجاتی ہے۔ اس طرح ذہنی بیماری کی بھی تشخیص ہے۔ جسمانی بیماری میں انسان کا جسم معمول کے مطابق کام نہیں کرتا اور ذہنی بیماری میں انسان کا ذہن معمول سے ہٹ کر کام کرنا شروع کردیتا ہے۔

ذہنی بیماریاں یا تو بہت شدید قسم کی ہوتی ہیں یا معمولی نوعیت کی۔ زیادہ شدید بیماریوں کی صورت میں لوگ علاج کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں۔ لیکن معمولی صورت میں معمولی علاج سے افاقہ ہوجاتا ہے۔ بیماری معمولی ہو تو عام ڈاکٹر بھی علاج کرلیتا ہے۔ لیکن شدت کی صورت میں ماہر سے 'اسپتال سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

بعض لوگوں کو بھوک کم لگتی ہے۔ بھوک کم لگنے کی صورت میں غذا یا خوراک کم ہوجاتی ہے۔ غذا یا خوراک میں کمی کی وجہ سے جسم کمزور ہوجاتا ہے اور جسم کی کمزوری سے ذہنی امراض پیدا ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی سی تھی، بھوک کی کمی، بھوک کی کمی کی وجہ سے خوراک کی کمی۔ اس کے نتیجے میں جسم کا کمزور ہونا لازمی ہے۔

یہ تو تھا معمولی بیماری کا تذکرہ۔

شدید ذہنی بیماریوں میں انتہائی پژمردگی کا دور آتا ہے یا دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلی جاتی ہے۔ بعض اوقات شک کا روگ یا انسان زبردست احساس کمتری یا احساس برتری کا شکار ہوجاتا ہے۔

ایسی صورت میں ضروری ہے کہ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیا جائے۔ کیونکہ تحلیل نفسی کے بغیر اصل بیماری کی جڑ کا معلوم ہونا ممکن نہیں۔

ع۔ک۔لاہور

اچھی بہن! آپ کا مسئلہ واقعی پریشان کن ہے۔ والدین اپنی اولاد کو جو کچھ دے سکتے ہیں ان میں سب سے بہترین چیز اچھی تربیت 'تہذیب اور تمیز ہے۔ آپ کے حالات علیحدہ گھر کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ جوائنٹ فیملی آج کی مہنگائی کے دور میں ایک مجبوری بن چکا ہے۔ کیونکہ اس طرح اخراجات مل جل کر پورے ہوجاتے ہیں۔ آپ کی بچی بے قصور ہے، بچے جس ماحول میں رہتے ہیں وہی باتیں سیکھتے ہیں۔ آپ اس سے سختی سے پیش نہ آئیں کیونکہ اس صورت میں وہ ڈھیٹ اور ضدی ہوجائے گی۔ اور آپ کی کوئی بات اس پر اثر نہیں کرے گی۔

اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے کہ آپ اپنی جٹھانی کے بچوں اور اپنی بچی کو ساتھ بٹھائیں اور ان کے ساتھ شام یا رات کسی وقت آدھا پون گھنٹہ گزاریں۔ انہیں کہانیوں کی شکل میں اچھی باتیں بتائیں۔ اچھی باتیں سیکھنے پر ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں کچھ چھوٹے موٹے تحفے انعام میں دیں۔ اگر آپ نے پیار سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو یقیناً" وہ بری عادتیں چھوڑ دیں گے اور اس طرح آپ کی بچی بھی خود بخود ٹھیک ہوجائے گی۔

ع۔س۔راولپنڈی

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بچپن سے نفسیاتی مسئلہ ہے جس کی وجہ سے میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں۔ میں اپنے مسئلے

کے لیے کئی سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کر رہی ہوں مگر نتیجہ صفر۔ دوائیاں کھانے کی وجہ سے مجھے اور بھی بہت سی تکالیف شروع ہوگئی ہیں۔ اب کچھ عرصے سے میری بہن کو بھی اعصابی درد شروع ہوگیا ہے۔ درد کی وجہ سے وہ جانوروں کی طرح تڑپتی ہے جیسے اسے ذبح کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹرز اسے بھی ذہنی و اعصابی مریض کہتے ہیں۔ دوائیاں کھا کر اس کی حالت وقتی طور پر ٹھیک ہوجاتی ہے' لیکن کچھ دنوں بعد وہی حالت ہوجاتی ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مجھے فوبیا ہوگیا ہے۔ بہن کی حالت دیکھتے ہوئے' ہر ٹائم اس کی بیماری کا سنتے ہوئے کہیں میری اپنی بیماری مزید نہ بگڑ جائے۔ اور مزید نہ بڑھ جائے۔ بہن بھائیوں کو دیکھتی ہوں تو مزید ڈر لگتا ہے کہ یہ بیماری ان کو نہ ہوجائے۔

ج:۔ اچھی بہن! اعصابی امراض اور دماغی امراض دو مختلف چیزیں ہیں۔ اعصابی مرض میں مبتلا شخص ہر وقت کسی اندیشے فکر اور تردد میں مبتلا رہتا ہے۔ آنے والے وقت میں پریشانیوں اور خطرات کے خوف و اندیشے اسے ہر وقت غمگین اور نڈھال رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات ایسے بچے جن کی پرورش میں بچپن میں بے توجہی برتی جاتی ہے۔ اعصابی امراض کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ایسے بچے بہت حساس ہوتے ہیں اور ذرا ذرا سی باتوں کا بہت زیادہ اثر لیتے ہیں۔ اور اس کے اثرات ان کے جسمانی نظام پر بھی پڑتے ہیں۔ ہر وقت تردد اور تشویش میں مبتلا رہنے کی وجہ سے نیند نہیں آتی' کھانا بھی ٹھیک سے ہضم نہیں ہوتا۔ اور وہ مختلف تکلیفوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

اس کے لیے آپ کسی اچھے ماہر نفسیات سے رجوع کریں' لیکن اس کے ساتھ اپنے اندر یقین اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ خود اعتمادی کے لیے اپنے اندر اللہ کی محبت کا یقین پیدا کریں۔ اللہ تعالیٰ ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ اس پر بھروسا کریں کہ وہ آپ کے ساتھ ہے۔ آپ کی ساری تکلیفیں اور پریشانیاں دور ہوجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ پر یقین آپ کے دل سے خوف اور اندیشے ختم کردے گا۔ اور آپ بہتر محسوس کریں گی۔ جسمانی طور پر کمزوری ہے تو اس پر بھی توجہ دیں۔ پھل' سبزیاں' دودھ زیادہ مقدار میں استعمال کریں۔

عفت۔۔۔لاہور

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنی ایک دوست کو بے انتہا چاہتی ہوں۔ آپ اسے میرا پاگل پن قرار دیں گے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میری تمام شدتوں کی حق دار وہی ہے۔ پہلے وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی تھی۔ میرے ایک چھوٹے سے مذاق نے حالات پلٹ دیے اور اب میں اس سے بات کرنے کو ترستی ہوں لیکن میری ایک اور دوست جو کہ اسکول کے زمانے تک میری بہترین دوست تھی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ وہ میری طرف سے بدظن ہوگئی ہے تو اس نے جان بوجھ کر اس کی طرف پیش قدمی کی اور اسے مجھ سے چھین لیا۔ اب حالات یہ ہیں کہ مجھے سوائے رونے کے اور کوئی کام نہیں رہا۔ میں اتنا روئی ہوں کہ میرے آنسو خشک ہوچکے ہیں۔ مجھے پڑھنے کا بے حد شوق ہے اور میں اپنی کلاس کی اچھی طالبات میں شمار ہوتی ہوں۔ اب میرا چند سال سے یہ حال ہوگیا ہے کہ میرا کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ پڑھنے بیٹھتی ہوں تو پڑھا نہیں جاتا۔ اول تو یاد ہی نہیں رہتا اور اگر یاد ہو بھی جائے تو.....

باقی خط بھی اسی قسم کی باتوں سے بھرا ہوا ہے۔

ج:۔ آپ نے جس مسئلے کے بارے میں خط لکھا ہے' اس قسم کے خطوط مجھے پہلے بھی موصول ہوچکے ہیں اور میں نے جواب میں یہی لکھا کہ انتہا پسندی کسی معاملے میں درست نہیں۔ زندگی میں اور زندگی کے ہر معاملے میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ لڑکیوں سے آپ کی دوستی اور محبت بری بات نہیں ہے۔ لیکن ایک تو اس میں اتنی شدت نہیں ہونی چاہیے۔ آپ کی محبت کے حق دار ماں باپ' بھائی بہن اور دوسرے قریبی عزیز' رشتے دار ہیں اور پھر ان رشتوں کے بعد شادی ہوتی ہے۔ شادی کے بعد شوہر کی محبت بچوں کی محبت۔ جب محبت۔۔۔ اتنے سارے..... خانوں میں بٹی ہوئی ہو تو جس جس کے حصے کی جتنی جتنی محبت ہے اسے اتنی ہی دینی چاہیے۔ ہاں! کبھی کبھی کسی کو ذرا سی زیادہ بھی دی جاسکتی ہے یعنی بعض صورتوں میں ماں سے ذرا زیادہ ہوگئی اور کہیں کہیں باپ سے زیادہ۔ کسی بھائی سے' کسی بہن سے' کسی پھوپھی' چچا' دادی یا دادا یا نانا نانی وغیرہ سے۔ لیکن انتہا پسندی کسی کے معاملے میں بھی جائز یا درست نہیں ہے۔ بعض لڑکیاں اپنی ٹیچروں سے بہت زیادہ محبت کرنے لگتی ہیں۔ دراصل اسے محبت نہیں احترام اور لگاؤ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ویسے بھی میں ایک بات یہاں بتاتی چلوں کہ اپنی ہی جنس سے محبت کرنا ایک طرح کی ابنارملٹی ہے۔

امت الصبور

بیوٹی بکس

اقصیٰ مریم.....کوئٹہ

س۔ میرے چہرے پر بال بے تحاشا ہیں اور آئے دن تھریڈنگ کروانے سے میری جلد پر بہت مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ اگر کوئی کٹ لگ جائے تو اس کا نشان ایک دھبہ سا بن جاتا ہے۔ پلیز! کوئی حل بتائیں میں بہت پریشان ہوں۔

ج۔ اقصیٰ! آپ تھریڈنگ کے بجائے ویکسنگ کا طریقہ بھی استعمال کرسکتی ہیں اور اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو الیکٹرولائسس کے ذریعے بال نکلوائیں۔ اس سے چھ ماہ تک بال دوبارہ نہیں آئیں گے۔

تھریڈنگ کا طریقہ عموماً" بہت محفوظ ہوتا ہے اور اس میں کٹ لگنے کا امکان بھی نہیں ہوتا۔ شاید آپ نے تھریڈنگ کے لیے صحیح طریقہ استعمال نہیں کیا۔

نمرہ نازنہ.....کراچی

س۔ میری عمر 32 سال ہے۔ میرے تین بچے ہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے کی جلد بہت چکنی ہے خاص طور پر ناک' ماتھے اور ٹھوڑی پر ہر وقت تیل رہتا ہے۔

شادی سے پہلے میرے چہرے پر دانے نکلتے تھے اور خود ہی ختم ہوجاتے تھے۔ اب بھی نکلتے ہیں۔ لیکن اب دانوں کی جگہ واضح نشان رہ جاتے ہیں۔ جو بدنما لگتے ہیں۔ چکنی جلد کی وجہ سے میں جو بھی کریم استعمال کرتی ہوں' اس سے زیادہ دانے نکلتے ہیں اور داغ رہ جاتے ہیں۔ میں داغ کی وجہ سے کوئی کریم استعمال نہیں کرسکتی۔

چہرے کی جلد ڈھیلی پڑ گئی ہے۔ منہ دھونے کے باوجود چہرہ میلا میلا لگتا ہے۔ اسکن اسپیشلسٹ سے رجوع کرچکی ہوں' لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ج۔ نمرہ! عموماً" بہت ساری خرابیاں صحیح نظام ہضم نہ ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ چھائیاں' چہرہ بے رونق ہونا' کھردری جلد اور چہرے پر کیل مہاسے نظام ہضم کی خرابی سے ہوتے ہیں۔ نظام ہضم صحیح ہو تو جسم میں خون بنتا ہے اور جلد صاف شفاف اور چمک دار نظر آتی ہے۔ نظام ہضم درست کرنے کے لیے آپ کھانے کے بعد ایک چمچ "جوہر ہاضم" کی استعمال کریں۔ اس سے آپ کا قبض بھی رفع ہوگا۔ کیونکہ چہرے پر دانے نکلنے کی ایک وجہ قبض بھی ہے۔

چونکہ آپ کی جلد چکنی ہے۔ اس لیے آپ کسی بھی قسم کی کوئی کریم استعمال نہ کریں۔ چہرہ کسی اچھے صابن سے دھونے کے بعد خشک کرلیں اور ایک سفید پھٹکری کا ٹکڑا گیلا کرکے چہرے پر پھیریں۔ دانے ختم ہوجائیں گے اور نشان بھی باقی نہیں رہیں گے۔ صابن میڈیکیٹڈ ہو تو زیادہ اچھا ہے۔

کھانے میں آپ پھل اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کریں۔ دن بھر میں کم از کم چودہ گلاس پانی پئیں۔ صبح

فجر کے بعد نہار منہ دو گلاس پانی پئیں۔ ناشتا کم از کم ایک گھنٹہ بعد کریں۔
آپ کے چہرے پر جو میلا پن ہے۔ وہ دور ہو جائے گا اور چہرے کی جلد صاف شفاف ہو جائے گی۔

عنبرین سلیم..... کراچی (لیاری)

س - میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری رنگت بہت سانولی ہے۔ چہرے پر کوئی رونق نہیں ہے۔ بہت کریمز لگائیں لیکن فائدہ نہیں ہوتا۔ آپ کے بتائے طریقوں مثلاً "بیسن، عرق گلاب، لیمن، شہد، کھیرا، دودھ سب استعمال کیا۔ ان سے وقتی تو تھوڑا بہت اثر ہوتا ہے لیکن رنگت صاف نہیں ہوتی۔ میں بہت احساس کمتری محسوس کرتی ہوں میرے پاؤں بھی عجیب سے ہیں۔ ان پر براؤن سے داغ ہیں جیسے میل ہو۔ ایڑیاں بہت پھٹتی ہیں۔ گلیسرین لیموں بھی لگایا لیکن فرق نہیں پڑتا۔

ج - عنبرین! آپ بھی بہن نمرہ ناز کو بتائے ہوئے مشورے پر عمل کریں۔ لیکن ایک بات نوٹ کرلیں۔ رنگ گورا ہونا کوئی بہت بڑی خوبی نہیں ہے۔ جلد کا صحت مند، شفاف، چمک دار ہونا اصل خوب صورتی ہے۔ آپ رنگ گورا کرنے کے بجائے اپنی صحت پر توجہ دیں۔ خود محسوس کریں گی کہ آپ کے چہرے پر ایک پرکشش تازگی اور شگفتگی آگئی ہے۔

کشف بٹ، عظمیٰ بٹ..... سیالکوٹ

س - موسم سرما میں اس بار میرے ہاتھوں کی جلد بہت خراب ہو گئی ہے۔ مردہ اور جھریوں والی۔ پلیز! کوئی آسان اور پراثر طریقہ بتائیں کہ میرے ہاتھ پہلے کی طرح مکھن ملائی جیسے ہو جائیں۔

ج - کشف! آپ گلسرین اور عرق گلاب کا محلول بنا کر رکھ لیں۔ جب بھی ہاتھ پاؤں دھوئیں۔ تولیہ سے خشک کرکے یہ محلول لگائیں۔ رات سونے سے پہلے ہاتھ پیروں پر لگا کر سوئیں۔
عرق گلاب اور گلسرین برابر مقدار میں لیں۔

مدیحہ جبین..... کوٹ رادھا کشن

س: خواتین ڈائجسٹ جولائی 2012ء کے بیوٹی بکس میں آپ نے شیمپو بنانے کا طریقہ بتایا تھا۔ اس میں گلیسرین صابن کا استعمال بھی تھا۔ دکان دار ہنستے ہیں اور کہتے ہیں یہ صابن پہلی دفعہ سنا ہے براہ کرم یہ بتائیں کہ کس دکان سے یہ مل سکتا ہے اور اس کا کوئی متبادل نام ہے تو بتائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا رنگ صاف تھا میں نے مختلف کریمیں مکس کر کے لگائیں تاکہ زیادہ گورا ہو جائے مگر رنگ مزید کالا ہو گیا۔ کوئی آسان گھریلو ٹوٹکا بتائیں کہ رنگ گورا ہو جائے۔ مکس کریموں کے استعمال سے دانے نکل آئے تھے۔ بڑی مشکل سے ختم ہوئے ہیں۔

ج : مدیحہ! گلیسرین سوپ Pear Soap کے نام سے ملتا ہے۔ یہ شفاف براؤن کلر کا صابن ہوتا ہے۔ تمام بڑے اسٹورز سے مل سکتا ہے۔ اگر Pear Soap نہ ملے تو Dove کے نام سے بھی صابن ہے۔ وہ لے سکتی ہیں لاہور میں ہر جگہ با آسانی ہے۔

آپ کی جلد بہت حساس ہے۔ مختلف کریموں سے اثرات ابھی باقی ہوں گے۔ فی الحال آپ چہرے پر کوئی کریم نہ لگائیں۔ اپنی غذا پر توجہ دیں۔ سیب اور کینو کا استعمال زیادہ کریں۔
شہد میں لیموں کا رس ملا کر پوری جلد پر لیپ کرلیں پھر دس، پندرہ منٹ بعد چہرہ نیم گرم پانی سے دھو ڈالیں۔ اس سے آپ کی جلد صاف شفاف ہو جائے گی اور رنگ نکھر آئے گا۔

☼